مطالعہ علوم اسلامیہ
اردو ترجمہ
کتاب الطلاق
من الہدایہ
تصدرها:
المکتبۃ العلمیۃ
۱۵- لیک روڈ، لاہور
للطباعة والنشر والتوزيع
مغربی پاکستان

مطالعہ علوم اسلامیہ

# کتاب الطلاق


## پروفیسر غازی احمد

ایم اے (عربی، گولڈ میڈلسٹ)
ایم اے (علوم اسلامیہ، گولڈ میڈلسٹ)
ایم ۔ او ۔ ایل ۔ بی ۔ ایڈ
مولوی فاضل (میڈلسٹ)
منشی فاضل ۔ فاضل درس نظامی


لاہور ۰ پاکستان

الطبعة الخامسة

**الناشر : خان عبدالحق الندوى**

دسمبر

الثمن روبيات

**طبع فى مطبعة المكتبة العلمية ١٥ ليك روڈ - لاهور**

## بَابُ طَلَاقِ السُّنَّةِ

# کتاب الطلاق

مسئلہ : قدوری[رح] فرماتے ہیں طلاق کی تین اقسام ہیں : حسن ، احسن اور بدعی ۔ احسن طلاق کی صورت یہ ہے کہ مرد اپنی بیوی کو ایسے طُہر میں ایک ہی طلاق دے جس میں اس نے مباشرت نہ کی ہو ۔ اور عورت کو اسی حال میں رہنے دے ، حتّٰی کہ اس کی عدت گزر جائے ۔ کیونکہ صحابہ کرام[رض] انقضاء عدت تک ایک سے زیادہ طلاقیں پسند نہیں کرتے تھے ۔ صرف ایک طلاق دینے والی صورت ان کے نزدیک اس سے کہیں زیادہ افضل تھی کہ مرد تین طہروں میں تین طلاقیں دے ، نیز ایک طلاق میں ایک تو مرد کو ندامت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ، دوسرے عورت کو (عدت وغیرہ پوری کرنے میں) کم تکلیف اٹھانا پڑتی ہے ۔ تیسرے ، احسن کے مکروہ نہ ہونے میں تمام ائمۂ مذاہب متفق ہیں ۔

مسئلہ : حسن یا طلاق سنۃ کی صورت یہ ہے کہ مدخولہ عورت کو تین طُہروں میں تین طلاقیں دی جائیں ۔ امام مالک[رح] فرماتے ہیں کہ یہ بدعت ہے ۔ فقط ایک طلاق ہی

مباح ہے کیونکہ اصل میں تو طلاق سے شرعی طور پر منع کیا گیا ہے۔ اور اباحت تو محض خلاصی حاصل کرنے کی مجبوری کے تحت ہوتی ہے اور یہ مجبوری ایک سے بھی دور ہوسکتی ہے۔ (تو پھر دو یا تین کی کیا ضرورت ہے) -

ہماری دلیل وہ حدیث ہے جس میں عبداللہ بن عمر رض کا واقعہ درج ہے (کہ آپ نے حیض کے دوران عورت کو طلاق دے دی اور باقی دو بھی دو حیضوں میں دینے کا ارادہ تھا) کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "سنت تو یہ ہے کہ تو طہر کا انتظار کرے اور ہر طہر میں طلاق دے" امام مالک رح کا یہ کہنا کہ ضرورت ایک طلاق سے پوری ہو جاتی ہے، اس کے جواب میں ہمارے علماء کہتے ہیں (کہ حاجت ایک پوشیدہ امر ہے۔ اس لیے) حکم کا مدار دلیل حاجت پر ہوگا کہ مرد نے عورت کو ایک ایسے زمانے (یعنی طہر) میں طلاق دی جبکہ جنسی رغبت تازہ اور فروزاں ہوتی ہے اور مرد کا بار بار طلاق دینا اس بات کا ثبوت ہے کہ کسی قوی حاجت کے پیش نظر اس نے طلاق دی ہے -

امام ابو یوسف رح نے امام ابو حنیفہ رح سے ایک روایت بیان کی ہے، کہ عدت کی مدت کو لمبا کرنے سے بچنے کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ طہر کے آخری دنوں میں طلاق دے۔ مگر زیادہ مناسب یہ ہے کہ ابتداء طہر ہی میں طلاق دے دے کیونکہ اگر مؤخر کرے گا تو ممکن ہے ارتکاب مباشرت کرلے۔ حالانکہ اس کا قصد طلاق دینے کا تھا۔ لیکن جب

مباشرت کے بعد طلاق دے گا تو یہ حسن نہ رہے گی ، بلکہ بدعی بن جائے گی ۔

**مسئلہ :** طلاق بدعی کی صورت یہ ہے کہ تین طلاقیں ایک بار ہی دے یا ایک ہی طہر میں دے اور جب وہ ایسا کر بیٹھے تو طلاق واقع ہو جائے گی ۔ اور دینے والا گناہگار ٹھہرے گا (طلاق بدعی کی اور صورتیں بھی ہیں کہ کلمہ واحدہ سے تین طلاقیں طہر یا حیض میں دے ، یا ایک دوران حیض دے دے یا ایک ایسے طہر میں دے جس میں مباشرت کر چکا ہے) ۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں : عصیان وغیرہ کا کوئی سوال ہی نہیں کیونکہ ہر طلاق مباح ہے اور یہ ایسا شرعی تصرف ہے جس پر حکم مرتب ہو جاتا ہے ۔ اور مشروعیۃ ممانعت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی (یعنی تصرف مشروع وہ ہے جس پر ثمرہ مرتب ہو جائے اور بہ یک وقت تین طلاقوں کی صورت میں نتیجہ مرتب ہو جاتا ہے کیونکہ تینوں طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں ۔ اب اگر کہا جائے کہ اس طرح کی طلاق ممنوع ہے تو مشروعیۃ اور ممنوعیۃ کا اجتماع ہوگیا حالانکہ دو منافی اشیاء یکجا نہیں ہوسکتیں ۔ جب مشروعیۃ ثابت ہوگئی تو ممنوعیۃ رفع ہوگئی ۔ اس لیے گناہگار نہ ہوگا ۔

امام شافعیؒ پر اعتراض کیا گیا کہ حیض کے دوران طلاق دینا غیر مشروع ہے مگر طلاق واقع ہوجاتی ہے دیکھ لیجیے مشروعیۃ اور ممنوعیۃ کا اجتماع موجود ہے) ۔

امام شافعیؒ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ بحالت حیض طلاق صرف اس لیے منع ہے کہ مدت عدت طویل نہ ہو نفس طلاق منع نہیں ہے ۔ علماء احناف کہتے ہیں کہ طلاق میں اصل تو ممانعت ہے کیونکہ اس سے وہ ازدواجی رشتہ منقطع ہو جاتا ہے ، جس کے ساتھ دین و دنیا کی بہت سی مصلحتیں وابستہ ہوتی ہیں ۔ اس کی اباحت فقط خلاصی حاصل کرنے کی ضرورت کے تحت ہے اور ضرورت جب ایک ہی سے پوری ہوسکتی ہے ۔ تو بیک وقت تین واقع کرنے سے کیا فائدہ ؟ (اگر کہا جائے کہ جب ضرورت ایک سے پوری ہو سکتی ہے ۔ تو پھر دوسرے اور تیسرے طہر میں آپ جواز طلاق کے قائل کیوں ہیں) ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم حاجت کی دلیل کو مدنظر رکھتے ہیں کہ جب وہ متکرر ہوئی تو پتا چلا کہ ایک سے حاجت پوری نہیں ہوئی لہذا دلیل کے متکرر ہونے سے حاجت بھی متکرر ہوگی (ممکن ہے کہ عورت بہت بد اخلاق قسم کی ہو اور مرد طلاق کو مغلظہ بنا کر ہمیشہ کے لیے گلو خلاصی چاہتا ہو) ۔

آپ کی دوسری دلیل (کہ مشروعیۃ اور ممنوعیۃ کا اجتماع نہیں ہوتا اس) کا جواب یہ ہے ممکن ہے کہ ایک شے مشروع بھی ہو اور ممنوع بھی ۔ یعنی اس پر ثمرہ مرتب ہو جائے (مثلاً کوئی شخص کسی کی چھری چرا کر جانور ذبح کرلے تو مذبوح حلال ہوگا) اور مذکورہ طلاق میں بھی دونوں حیثیتیں ہیں ۔ اول یہ کہ طلاق سے انسان غلامی کے

بندھن سے چھوٹ جاتا ہے ، اور یہ مشروع ہے دوسری حیثیت یہ ہے کہ طلاق سے دینی اور دنیوی مصالح ضائع ہو جاتے ہیں ، اس لحاظ سے طلاق ممنوع ہے ۔ تو یہ طلاق مشروع فی ذاتہ اور ممنوع لغیرہ ہے (کیونکہ مقصود بالذات تو بندھنوں کا ازالہ تھا مگر مصالح بھی بالطبع جاتے رہے) لہذا جو طلاق کسی وجہ سے ممنوع ہے اس کے واقع کرنے سے گناھگار ہوگا ۔

اسی طرح ایک طہر میں دو طلاقیں دینا بھی بدعت ہے ۔ اس کی دلیل پہلے بیان کر دی گئی ہے ۔ (کہ جب ایک سے ضرورت پوری ہوسکتی ہے تو دوسری کی کیا ضرورت) ۔

ایک بائن طلاق دینے میں مختلف روایات ہیں ۔ امام محمدؒ مبسوط میں فرماتے ہیں کہ خلاف سنة ہے کیونکہ بینونة کی زائد صفت کی کیا ضرورت تھی؟ مگر زیادات میں مذکور ہے کہ اس طلاق میں کوئی کراھت نہیں کیونکہ بائن طلاق دینے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ فی الفور رھائی حاصل ہو جائے ۔

مسئلہ : طلاق میں سنت دو طرح سے ہوتی ہے سنة فی الوقت اور سنة فی العدد ، سنة فی العدد میں مدخولہ اور غیر مدخولہ برابر ہیں ۔ اس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے (کہ ایک طہر میں ایک ہی طلاق ہوگی) اور سنة فی الوقت کا ظہور خاص طور پر مدخولہ کے حق میں ہوگا کہ وہ عورت کو اس طہر میں طلاق دے جو مباشرت سے خالی ہو کیونکہ دلیل حاجت یعنی اقدام علی الطلاق کی رعایت ملحوظ رکھی جائے گی ۔ اس زمانے میں جب کہ رغبت موجود ہوتی ہے

(یعنی طہر کے دنوں میں) ایام حیض مرد کے لیے گویا زمانۂ نفرت ہے ۔ اور طُہر میں ایک بار کی مباشرت سے حاجت میں سستی اور ضعف پیدا ہو جاتا ہے (یعنی طلاق حسن وہ ہوتی ہے جس میں دلیل حاجت کی رعایت کی جائے کہ طلاق ایسے طہر میں دے جو مباشرت سے خالی ہو) کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رغبت تازہ ہونے کا زمانہ ہونے کے باوجود اس کا طلاق دینا اس کی (ناگہانی) حاجت پر دال ہے ۔ اگر دلیل حاجت کی رعایت نہ کی جائے اور ایام حیض ہی میں طلاق دے دی جائے تو یہ زمانۂ نفرت ہے اور حاجت کا صحیح ثبوت نہ ہوگا ۔ لہذا طلاق بدعی ہوگی ۔ اسی طرح اگر طُہر میں مباشرت کے بعد طلاق دے دے تو ثابت ہوا کہ اس کی حاجت میں کچھ ضعف و نقص ہے مگر پھر بھی اس نے طلاق دے دی تو یہ بھی بدعی ہوگی) ۔

مسئلہ : غیر مدخولہ کو طہر و حیض دونوں صورتوں میں طلاق دی جاسکتی ہے مگر امام زفرؒ کا اختلاف ہے وہ غیر مدخولہ کو بھی مدخولہ پر قیاس کرتے ہیں ۔

ہم کہتے ہیں کہ غیر مدخولہ کی طرف رغبت حقیقی طور پر موجود رہتی ہے جو حیض سے بھی کم نہیں ہوتی ۔ جب تک کہ اسے مقصود حاصل نہ ہو جائے ۔ البتہ مدخولہ میں رغبت کی تجدید طہر سے ہوتی ہے (اس لیے دونوں میں فرق ہے)۔

مسئلہ : امام قدوریؒ نے فرمایا : اگر کسی عورت کو کم سنی یا کبر سنی کی بناء پر حیض نہیں آتا اور مرد اسے

سنة کے مطابق تین طلاقیں دینا چاہتا ہے تو اس کی صورت یہ ہوگی کہ پہلے ایک طلاق دے ۔ جب ایک ماہ گزر جائے تو دوسری دے دے کیونکہ مہینہ ان عورتوں کے حق میں حیض کے قائم مقام ہوگا ۔ قرآن کریم میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ جو عورتیں حیض سے مایوس ہو چکی ہیں یا جنہیں ابھی تک حیض ہی نہیں آیا یعنی ابھی کم سن ہیں ، ان کی عدت تین ماہ ہے اور ہر مہینے کو حیض کا قائم مقام بنانا زیادہ مناسب ہے ۔ حتی کہ صغیرہ اور آئسہ کا اگر استبراء کرائے تو اس کا اندازہ بھی مہینہ سے ہوگا حالانکہ استبراء حیض سے ہوتا ہے نہ کہ طہر سے ۔

مسئلہ : اگر مہینے کے ابتداء میں طلاق دی جائے تو قمری مہینوں کا اعتبار کریں گے ۔ اگر وسط ماہ میں طلاق دے تو مدت تفریق تیس دن شمار کیے جائیں گے ۔ اسی طرح تیس تیس دن کے بعد دوسری اور تیسری طلاق دے گا ۔

امام اعظم کے نزدیک عدت کے مسئلے میں بھی یہی صورت ہوگی ۔ مگر صاحبین" یہ کہتے ہیں کہ درمیانی دو ماہ تو چاند کے حساب سے ہوں گے ، مگر پہلے اور آخری کا حساب دنوں کے لحاظ سے ہوگا ۔ (مثلاً پندرہ محرم کو طلاق دی تو صفر اور ربیع الاول کا حساب چاند سے ہوگا اور محرم کے پندرہ دن کے ساتھ پندرہ دن ربیع الثانی کے شمار ہوں گے) ۔ یہ مسئلہ اجارات میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے (اور وہاں بھی اسی طرح اختلاف ہے) ۔

مسئلہ : امام قدوری؄ فرماتے ہیں: مرد کے لیے جائز ہے کہ وہ آئسہ اور صغیرہ کو مباشرت کے فوراً بعد طلاق دے دے ۔ مگر امام زفر؄ فرماتے ہیں کہ وہ مباشرت اور طلاق کے درمیان ایک ماہ کا وقفہ کرے کیونکہ ہم نے مہینے کو حیض کے قائم مقام بنایا ہے ۔ نیز مباشرت سے رغبت میں سستی اور کمی واقع ہو جاتی ہے اور رغبت کی تجدید تقریباً ایک ماہ تک ہو جاتی ہے ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ آئسہ اور صغیرہ میں حمل کا احتمال نہیں اور حائضہ عورتوں کو بعد از مباشرت طلاق دینا شبہ حمل کی وجہ ہی سے مکروہ ہے کہ عدت میں شک واقع ہوتا ہے (کہ اگر عورت حاملہ ہے تو عدت وضع حمل سے پوری ہوگی ورنہ حیض کے حساب سے مکمل ہوگی) رہا رغبت کا سوال تو رغبت میں اگرچہ امام زفر؄ کے بیان کے مطابق وقتی سستی پیدا ہو جاتی ہے مگر دوسرے کئی امور ایسے ہیں کہ جن سے جلد ہی رغبت کی تجدید ہو جاتی ہے ۔ (مثلاً ایک مرد کی دو بیویاں ہیں جن میں سے ایک آئسہ اور دوسری ذوات الحیض سے ہے تو مرد غالباً آئسہ کی طرف زیادہ رجوع کرے گا تو مرد ایسی وطی کی طرف زیادہ راغب ہوگا جس سے حمل کا احتمال نہ ہو تاکہ اولاد کی ذمہ داریوں سے بچ جائے ۔ لہذا یہ زمانہ زمانۂ رغبت شمار ہوگا پس یہ بھی زمانہ حمل کی مانند ہوگا۔

مسئلہ : حاملہ عورت کو مباشرت کے بعد طلاق دینا

بھی صحیح ہے کیونکہ عدت میں اشتباہ پیدا ہونے کا اندیشہ نہیں اور زمانۂ حمل وطی کے لیے زمانہ رغبت بھی ہے۔ کیونکہ اب نئے قرار حمل کا کوئی خوف نہیں۔ نیز مرد کی رغبت عورت سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ کہ اب وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے لہذا اس صورت میں بھی جماع سے رغبت کم نہ ہوگی۔

مسئلہ : امام اعظمؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک سنة کی اتباع کرتے ہوئے حاملہ عورت کو ہر ماہ کے بعد ایک ایک طلاق دی جا سکتی ہے۔ مگر امام محمدؒ کا قول ہے کہ سنة تو صرف ایک طلاق ہے کیونکہ اصل میں تو طلاق ہی سے منع کیا گیا ہے اور شرع نے بھی مختلف عدتوں میں تفریق کی ہے (مثلاً ذوات الحیض سے ہو تو عدت کا حساب حیض سے ہوگا۔ اگر آئسہ یا صغیرہ ہو تو عدت کا حساب حیض سے ہوگا)۔ مگر حاملہ کی صورت میں دونوں ممکن نہیں تو یہ ممتدۂ طہر عورتوں جیسی ہوگی۔ (ممتدۂ طہر وہ عورت ہے جس کے طہر کا زمانہ کئی ماہ تک طویل ہو جائے۔ اس کی عدت ماہانہ حساب سے نہ ہوگی بلکہ حیضوں کے حساب سے ہوگی اگرچہ ایک طویل عرصہ ہی کیوں نہ گزر جائے۔ ایسی صورت میں ایک طلاق ہی دی جاتی ہے نہ کہ ماہ بماہ ایک ایک دیتا چلا جائے)۔

شیخینؒ فرماتے ہیں کہ طلاق کو محض ضرورت کی بناء

پر مباح کیا گیا ہے اور مہینے کا وقفہ اس حاجت پر دال ہے. جس طرح آئسہ اور صغیرہ کے حق میں ہوتا ہے ، اور یہ ثابت ہے ، کیونکہ مہینے کا وقفہ اتنا ہوتا ہے کہ جس سے فطرۃ سلیمہ میں رغبت کی تجدید ہو جاتی ہے اور مہینے کا عرصہ گویا ایک نشان اور دلیل ہوتا ہے کہ وہ مائل نہیں ہوا ۔ لہذا آپ کا ممتدہ طہر پر قیاس کرنا غلط ہے ۔ کیونکہ دلیل حاجت وہاں مہینہ نہیں بلکہ طہر ہے ۔ کیونکہ ہر وقت حیض کا امکان ہے کہ شاید آج کل میں آ جائے اور پھر نیا طہر ہو مگر حاملہ کی صورت میں حیض کا امکان نہیں ہوتا ۔

مسئلہ : جب مرد عورت کو حالت حیض میں طلاق دے دے تو طلاق واقع ہو جائے گی کیونکہ اس بارے میں ممانعت دوسری وجہ سے ہے جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے ۔ لہذا اس کا شرعی جواز زائل نہ ہوگا ۔

مسئلہ : مستحب یہ ہے کہ مرد مذکورہ صورت میں رجوع کرے کیونکہ حضور ﷺ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ اپنے بیٹے کو رجوع کرنے کا حکم دیجیئے کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی عورت کو ایام حیض میں طلاق دی تھی ۔ اس سے معلوم ہوا کہ طلاق تو واقع ہوگئی لیکن زور رجعت ہی پر رہے گا ۔

استحباب کا قول بعض مشائخ کا ہے ۔ مگر صحیح قول یہ ہے کہ رجوع واجب ہے تاکہ حضور ﷺ کے ارشاد پر عمل بھی ہو جائے اور جہاں تک ممکن ہو معصیت سے بھی

دور رہے ۔ کیونکہ اس طرح رجوع کرنے سے اس کا اثر زائل ہوگا یعنی عدت میں کمی ہوگی اور اس کے مضر اثرات دور ہوں گے ۔ (یعنی عورت کی عدت خواہ مخواہ طویل نہ ہوگی کیونکہ یہ حیض عدت میں شمار نہیں ہوگا) ۔

مسئلہ : شیخ قدوریؒ فرماتے ہیں کہ عورت جب طاہرہ ہو اور اسے حیض آئے پھر طاہرہ ہو تو اب مرد کی مرضی پر منحصر ہے خواہ طلاق دے یا نہ دے مصنفؒ فرماتے ہیں : امام محمدؒ نے مبسوط میں اسی طرح ذکر کیا ہے ۔ مگر امام طحاویؒ نے بیان کیا ہے کہ وہ اسے اسی طُہر میں طلاق دے سکتا ہے جو اس حیض سے متصل ہو ۔ امام ابو الحسن کرخیؒ فرماتے ہیں کہ طحاویؒ نے امام ابو حنیفہؒ کا قول ذکر کیا ہے اور مبسوط میں صاحبینؒ کا قول درج ہے ۔

مبسوط میں مذکور قول کی یہ توجیہ کی جاتی ہے کہ طلاق میں سنۃ یہ ہے کہ دو طلاقوں کے درمیان ایک مکمل حیض کا فاصلہ ہو اور یہاں بعض حیض کا فاصلہ ہے لہذا دوسرا حیض مکمل حیض ہوگا ۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ حیض کی تقسیم ہو سکے اور باقی دن دوسرے حیض سے شمار کرکے مدت حیض کی تکمیل کی جائے ۔ دوسرے حیض کے بعد جو طہر آئے گا وہ زمانہ سنۃ کے مطابق ہوگا ۔ لہذا اس طرح مرد کے لیے ممکن ہے کہ سنت کے مطابق طلاق دے سکے ۔

امام طحاویؒ کے قول کی توجیہ یہ ہے کہ حیض میں واقع طلاق کا اثر رجوع سے ختم ہو جائے گا اور ایسا ہو جائے گا کہ گویا مرد نے ایام حیض میں طلاق دی ہی نہیں ۔ اس لیے اس کے متصل طہر میں طلاق بطریق سنۃ ہوگی ۔

مسئلہ : جس شخص نے مدخولہ عورت سے جو حائضہ ہے کہا کہ تجھے تین طلاقیں سنۃ کے مطابق ہیں ۔ اور اس کی کچھ نیت نہ تھی ۔ عورت پر ہر طہر میں ایک ایک طلاق واقع ہوتی جائے گی ۔ کیونکہ للسنۃ میں لام برائے وقت ہے ۔ گویا مرد نے عورت سے یوں کہا ۔ أنت طالق وقت السنۃ اور وقت سنت طہر ہے جو مباشرت سے خالی ہو ۔

مسئلہ : اگر مرد نے یہ نیت کی ہو کہ ایک ہی وقت تین واقع ہو جائیں ۔ یا ہر ماہ کے ابتداء میں ایک واقع ہوتی جائے تو حسب نیۃ ہوگا اور اس صورت میں عورت خواہ حالت حیض میں ہو یا حالت طہر میں کوئی فرق نہیں پڑتا ۔

امام زفرؒ فرماتے ہیں : جمع کی نیت درست نہیں کیونکہ یہ تو بدعت ہے (اور آپ نے لفظ سنۃ کو پیش نظر رکھنا ہے) اور بدعت سنت کی ضد ہے ۔

ہم کہتے ہیں کہ جمع کا احتمال بھی لفظوں سے نکل سکتا ہے اور بیک وقت تین طلاقیں دینا بدعت ہے ۔ مگر جب ایسا ہو جائے تو ان کا وقوع سنۃ سے ثابت ہے ۔ اس لیے مطلق کلام سے بیک وقت تین مراد نہیں ہو سکتیں ۔ ہاں جب نیت کرے تو ہو سکتا ہے ۔

مسئلہ : اگر عورت آئسہ یا 'ذوات الأشہر' ہے - یعنی ایسی صغیرہ جس سے مباشرت ہو چکی ہے تو ایک طلاق اسی وقت واقع ہو جائے گی - اور باقی دو ایک ایک ماہ کے بعد ، کیونکہ مہینہ ان کے حق میں (اسی طرح) دلیل حاجت ہے جس طرح ذوات الحیض کے بارے میں طہر دلیل حاجت ہوتا ہے - یہ مسئلہ پہلے مذکور ہو چکا ہے -

مسئلہ : اگر مرد اسی وقت تین طلاق بیک وقت دینے کی نیت کرے تو ہمارے نزدیک واقع ہو جائیں گی - جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں (انہ محتمل لفظہ) البتہ وہ صورت اس سے مختلف ہوگی جب کہ مرد عورت کو یہ کہے کہ 'أنت طالق للسنة' یعنی تجھے مسنون طریقے سے طلاق ہے - اور تین کے عدد کی صراحت نہ کرے تو نیت جمع جائز نہیں (یعنی اگر عدد کی صراحت نہ کرے اور مطلقاً أنت طالق للسنة کہے تو تین کی نیت کر سکتا ہے مگر جمع نہیں کر سکتا بلکہ ہر طہر کے بعد ایک ہوگی) کیونکہ تین کی نیت اس لیے درست تھی کہ لام وقت کے لیے ہے لہذا وہ مسنون وقت کی عمومیة کو ظاہر کرتا ہے (گویا مرد نے کہا کہ جب بھی وقت سنة آیا تو تجھ پر طلاق ہے تو جب پہلا طہر آیا یہ وقت سنة ہے ، ایک واقع ہو جائے گی - اسی طرح دوسرے یا تیسرے طہر کے وقت) اور عمومیة کا یہ تقاضا ہے کہ اس میں طلاق بار بار واقع ہوگی - لہذا اب اگر وہ جمع کی نیت کرے تو وقت کی

عمومیة باطل ہو کر رہ جاتی ہے - لہذا تین کی نیت مطلقاً درست نہ ہوگی -

## فصل

مسئلہ : ہر خاوند کی دی ہوئی طلاق نافذ ہوگی بشرطیکہ وہ عاقل اور بالغ ہو - لیکن سونے والے ، بچے اور پاگل شخص کی طلاق نافذ نہ ہوگی کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ ہر طلاق سوائے بچے اور مجنون کی طلاق کے جائز ہے کیونکہ اہلیت ہمیشہ اسی وقت پائی جاتی ہے جب کہ انسان صاحب عقل اور صاحب تمیز ہو مگر بچہ اور پاگل دونوں اس اہلیت سے محروم ہیں اور سونے والا اپنے آپ میں نہیں ہوتا -

مسئلہ : طلاق بالجبر واقع ہو جاتی ہے - البتہ امام شافعیؒ کو اس میں اختلاف ہے - وہ فرماتے ہیں کہ مجبوری اختیار کے منافی ہے اور اختیار پر ہی تمام تصرفات شرعیہ کا مدار ہے - بخلاف مذاق میں طلاق دینے والے کے کیونکہ وہ الفاظ کے ادا کرنے میں صاحب اختیار ہوتا ہے -

ہماری دلیل یہ ہے کہ مجبور شخص نے طلاق دینے کا قصد اس وقت کیا جب کہ وہ خود اس بات کا اہل تھا - نیز طلاق اس نے اپنی منکوحہ بیوی کو دی ہے - لہذا اس کا یہ قصد اس کے شرعی حکم کے نفاذ سے خالی نہ رہے گا تاکہ اس کی حاجت پوری ہو سکے (کہ اگر طلاق نہ دے تو شاید قتل کر دیا جائے) لہذا اس صورت میں اسے ایسا

شخص تصور کیا جائے گا جس نے اپنی رضا و رغبت سے عورت کو طلاق دی ہو۔ کیونکہ اس نے دو شر دیکھے اور دونوں میں سے چھوٹے کو اختیار کر لیا اور اس فعل میں اس کے قصد و اختیار کی علامت صاف ظاہر ہے۔ صرف اتنی بات ضرور ہے کہ وہ اس حکم کے نفاذ پر راضی نہیں۔ مگر طلاق کے نافذ ہونے پر راضی نہ ہونا طلاق کے واقع ہونے میں مخل نہیں ہوتا جیسا کہ ہنسی مذاق میں طلاق دینے کے مسئلے میں۔

مسئلہ : نشے کی حالت میں دی ہوئی طلاق واقع ہو جاتی ہے امام کرخیؒ طحاویؒ اور امام شافعیؒ کے ایک قول کے مطابق اس کی ایسی طلاق واقع نہیں ہوتی کیونکہ قصد کا مدار عقل پر ہے اور (نشے کی وجہ سے) بوقت طلاق اس کی عقل زائل ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ انسان اجوائن خراسانی یا افیون جیسی کوئی دواء پی کر زائل العقل ہو جاتا ہے (تو طلاق واقع نہیں ہوتی اور آپ بھی اسے تسلیم کرتے ہیں)۔

ہم کہتے ہیں کہ نشے کی حالت میں عقل معصیت کی وجہ سے زائل ہوتی ہے اس لیے اس کی تنبیہ اور سزا کے لیے حکماً عقل کو 'باقی' سمجھا جائے گا حتی کہ شراب پینے سے اسے سر درد ہوگیا اور سر درد سے عقل زائل ہوگئی تو اب طلاق واقع نہ ہوگی (کیونکہ سر درد شراب کے لوازم سے نہیں)۔

مسئلہ : گونگے آدمی کی طلاق اشارے سے واقع ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اس کے عندیے پر دلالت کرتا ہے۔ لہذا اشارے کو ضرورت کے تحت عبارت کے قائم مقام گردانا جائے گا (تاکہ اس کی حاجت پوری ہو سکے) ۔ ان اشارات پر کتاب الطلاق کے آخر میں بحث کی جائے گی ، ان شاء اللہ تعالی ۔

مسئلہ : لونڈی کے لیے دو طلاقیں ہوتی ہیں ، خواہ اس کا خاوند آزاد ہو یا غلام ۔ اسی طرح حُرّہ کی تین طلاقیں ہیں ، خواہ اس کا خاوند آزاد ہو یا غلام ۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ عدد طلاق کا مدار مردوں پر ہے ۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے : "الطلاق بالرجال والعدة بالنساء" یعنی طلاق کا تعلق مردوں سے اور عدت کا تعلق عورتوں سے ہوتا ہے ۔

امام شافعیؒ کی دوسری دلیل یہ ہے کہ نکاح میں عورت پر ملکیت حاصل ہونا اعزاز ہے اور آدمیت اس کی مقتضی ہے ۔ نوع انسانی میں آزاد مرد میں یہ اعزاز اپنے کمال پر ہوتا ہے اس لیے آزاد مرد کو حق ملکیت میں بھی بہرۂ وافر حاصل ہوگا ۔

ہماری دلیل حضور ﷺ کا وہ ارشاد ہے کہ باندی کی طلاقیں دو ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہیں نیز عورت کا مرد کے نکاح میں آنا اس کے حق میں بمنزلہ نعمت ہوتا ہے (کہ وہ گھر کی مالکہ بن جاتی ہے ۔ تمام اخراجات کو پورا

کرنا مرد کے ذمے ہوتا ہے) اور غلامی اس نعمت کو نصف تک محدود رکھتی ہے مگر طلاق کا نصف جزء ہو نہیں سکتا لہذا یہ نصف کامل ہو جائے گا اور باندی کی دو طلاقیں ہوں گی ۔ امام شافعیؒ کی پیش کردہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ طلاق مرد کی جانب ہی سے واقع ہو سکتی ہے ۔

مسئلہ : جب غلام اپنے مالک کی مرضی سے کسی عورت سے نکاح کر لے اور پھر اسے طلاق دے دے تو واقع ہو جائے گی اور غلام کے مالک کی طلاق اس کی بیوی پر واقع نہیں ہو سکتی ، کیونکہ ملک نکاح غلام کا حق ہے ، لہذا اسقاط حق بھی اسی کے اختیار میں ہوگا نہ کہ مالک کے اختیار میں ۔

# بَابُ اِيقَاعِ الطَّلَاقِ

مسئلہ : طلاق کی دو قسمیں ہیں : صریح اور کنایہ ۔
صریح جیسا کہ "اَنتِ طَالِقٌ وَمُطَلَّقَۃٌ وَطَلَّقتُکِ ۔" ان الفاظ سے طلاق رجعی واقع ہوگی ۔ کیونکہ یہ الفاظ طلاق ہی میں استعمال ہوتے ہیں اور غیر طلاق میں نہیں ہوتے لہذا یہ الفاظ طلاق کے لیے صریح ہیں اور رجوع کرنا نص قرآنی سے ثابت ہے ۔ (وبعولتھن اَحَقُّ بِرَدِّھِنَّ) یعنی ان کے خاوند رجوع کرنے کے زیادہ حق دار ہیں ۔

مسئلہ : طلاق صریح میں نیت کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ یہ الفاظ کثرت استعمال کی بناء پر صریح ہیں ۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ایک طلاق صریح سے بائن کی نیت کرے (تو بھی رجعی ہی ہوگی) کیونکہ شرع نے جس بینونۃ کو انقضاء عدۃ کے ساتھ معلق کیا ہے وہ اسے اسی وقت واقع کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو اس کا قصد و ارادہ قابل قبول نہ ہوگا (یعنی شرعی حکم یہ ہے کہ ایک طلاق رجعی کے بعد جب عدت گزر جائے تو وہ بائن بن

جاتی ہے اور تجدید نکاح کی ضرورت پڑتی ہے ۔ لیکن مرد نے بائن کی نیت کرکے اسے اسی وقت بائن بنانا چاہا ، مگر وہ حکم شرعی میں تبدیلی کرنے کا مجاز نہیں لہذا اس کا قصد نا قابل قبول ہوگا) ۔

مسئلہ : اگر خاوند کہے کہ لفظ طلاق سے میری مراد قید و بند سے آزادی تھی نہ کہ تعلقات نکاح سے تو عدالت میں اس کا کہنا تسلیم نہیں کیا جائے گا ، کیونکہ ظاہر کے خلاف ہے ، ہاں ما بین اللہ وبین العبد سچا مانا جا سکتا ہے کیونکہ ان الفاظ میں ان معانی کا احتمال بھی ہے ۔

مسئلہ : اگر مرد نے اَنْتِ طَالِقٌ سے ، کام سے آزادی کی نیت کی تو نہ عدالت میں قبول ہوگا اور نہ دیانت میں سچا تسلیم کیا جائے گا ۔ کیونکہ طلاق تو نکاح کی قید کے ازالہ و رفع کے لیے ہے اور وہ عمل سے مقید نہیں (گھر کا کام کاج تو عورت کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے) امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اسے دیانۃً صادق تسلیم کیا جا سکتا ہے کیونکہ لفظ طلاق تخلیص اور آزادی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے ۔

اگر مرد یوں کہے اَنْتِ مُطْلَقَةٌ تو طلاق واقع نہ ہوگی جب تک اس نے طلاق کی نیت نہ کی ہو ۔ کیونکہ یہ لفظ عرف کے لحاظ سے مستعمل نہیں لہذا صریح نہ ہوگا ۔

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ مذکورہ الفاظ

کے استعمال سے صرف ایک طلاق واقع ہوگی ، خواہ ایک سے زیادہ کی نیت کیوں نہ کرے ۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مرد کی نیت کے مطابق واقع ہوں گی ، کیونکہ لفظ میں ان کا احتمال موجود ہے ۔ طالق یعنی اسم فاعل میں مصدر بھی موجود ہوتا ہے اور مصدر میں عدد کی نیت کرنا درست ہوتا ہے جیسا کہ عالم کے ذکر میں علم کا ذکر بھی ہوتا ہے ، لہذا اس کے ساتھ عدد کو جوڑا جا سکتا ہے ۔ آپ جانتے ہیں کہ أنت طالق ثلاثاً میں ثلاثاً تفسیر و تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہوتا ہے ، ثابت ہوا کہ طالق میں عدد کا احتمال موجود ہے ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ طالق نعت مفرد ہے (یعنی فرد واحد کی صفت کے طور پر بیان ہوئی ہے) کیونکہ تثنیہ کی حالت میں طالقان کا استعمال ہوتا ہے اور تین کے لیے طالقات یا طوالق کا ، اس لیے واحد سے زیادہ عدد کا احتمال نہیں ہوگا ۔ کیونکہ تثنیہ و جمع وغیرہ واحد کی ضد ہیں ۔ رہا امام شافعیؒ کا استدلال تو اس کا جواب یہ ہے کہ طالق میں جو مصدر آپ کہتے ہیں وہ تو عورت کی صفت ہے ۔ یعنی ایک طلاق دی گئی عورت نہ کہ لفظ طلاق کی جس کے معنی تطلیق یعنی طلاق دینے کے ہیں ۔ (حوالے کے لیے دیکھیں کشاف ۔ زمخشری اور امام رازی) اور وہ عدد جو اس کے ساتھ متصل ہوتا ہے دراصل اس کا مصدر محذوف کی صفت واقع ہوتا ہے یعنی ثلاثاً سے مراد طلاقاً ثلاثاً یعنی تین

بار طلاق دینا ہوگا جیسے کہا جاتا ہے میں نے اسے کثرت سے دیا ۔ یعنی مال کثرت سے دیا ۔ یہاں لفظ مال محذوف مانا جائے گا ۔

مسئلہ : اگر مرد نے کہا : أنت الطلاق یا أنت طالق الطلاق یا أنت طالق طلاقاً اور اس کی کچھ نیت نہ ہو ۔ یا ایک یا دو کی نیت ہو تو ایک رجعی طلاق واقع ہوگی ۔ اور اگر تین کی نیت ہے تو تین واقع ہوں گی ۔ دوسرے اور تیسرے لفظ سے طلاق کا وقوع ظاہر ہے کیونکہ جب وہ صرف نعت (أنت طالق) کا ذکر کرے تب بھی (طلاق) واقع ہو جاتی ہے پھر جب نعت کا بھی ذکر کیا اور ساتھ ہی مصدر بھی مذکور ہوا تو گویا اس کی تقویۃ و تأکید میں اضافہ کر دیا ۔ پہلے جملے سے طلاق اس طرح واقع ہوتی ہے کہ مذکور اگرچہ مصدر ہے مگر اس سے مراد اسم ہے ، جیسا کہ کہا جاتا ہے : رجل عدل أی عادل تو أنت الطلاق بمنزلہ أنت طالق کے ہوگیا ۔ اسی قاعدے کے تحت مرد اگر انت طلاق کہہ دے تو طلاق واقع ہو جائے گی اور نیت کی حاجت نہ رہے گی ۔ البتہ یہ ایک رجعی طلاق ہوگی ۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ کثرت استعمال کی بناء پر یہ صریح طلاق ہے ۔

مذکورہ صورتوں میں تین کی نیت بھی درست ہے ۔ مصدر میں عموم اور کثرت کا احتمال بھی ہوتا ہے ، کیونکہ مصدر اسم جنس ہے (اور جنس میں وحدۃ شخصی اور وحدۃ

نوعی دونوں مراد لی جا سکتی ہیں) لہذا اس کا شمار باقی اسماء جنس کی طرح ہوگا تو یہ ادنی یعنی وحدۃ شخصی اور اعلی یعنی وحدۃ نوعی دونوں کو شامل ہوگی ۔

مذکورہ جملوں میں دو کی نیت درست نہیں ۔ امام زفرؒ جواز کے قائل ہیں کیونکہ دو بھی تین کا حصہ ہے ۔ جب تین کی نیت کی جا سکتی ہے تو دو کی نیت بھی درست ہوگی ۔

ہم کہتے ہیں کہ تین کی نیت مصدر کے جنس ہونے کی وجہ سے درست تھی ۔ حتی کہ اگر عورت باندی ہو تو دو کی نیت بھی درست ہے ۔ اس میں بھی اسم جنس ہی پر اعتبار ہوگا (کیونکہ سب باندیوں کو دو طلاقیں ہی دی جا سکتی ہیں) مگر آزاد عورت کے حق میں دو کا عدد جنس نہیں عدد ہے اور یہی ثابت ہے کیونکہ ان الفاظ میں وحدۃ کا مفہوم پایا جاتا ہے اور اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو ایک فرد یا ایک جنس اور دو یعنی تثنیہ نہ منفرد ہے اور نہ ہی جنس ۔ لہذا یہ مراد نہیں ہو سکتا ۔

مسئلہ : اگر مرد نے کہا : "انت طالق الطلاق" اور کہا کہ طالق سے میرا مقصد ایک طلاق تھا اور الطلاق سے دوسری (طلاق) تو اس کی تصدیق کی جائے گی (اور دو رجعی طلاقیں واقع ہوں گی) کیونکہ دونوں لفظ ایقاع طلاق کی صلاحیت رکھتے ہیں گویا اس نے طالق و طالق کہا ۔ اگر عورت مدخولہ ہو تو دو رجعی واقع ہوں گی ۔

مسئلہ : جب طلاق کو پوری عورت یا اس کے ان اعضاء کی طرف مضاف کرے جن سے مراد پوری عورت لیا جا سکتا ہے تو طلاق ہو جائے گی ، کیونکہ طلاق کی نسبت بالکل صحیح ہے - مثلاً یوں کہے : أنت طالق (تجھے طلاق ہے) کیونکہ تاء مؤنث کی ضمیر ہے (جس سے مراد عورت ہے) یا رقبتك طالق (تیری گردن کو طلاق ہے) یا عنقك طالق (تیری گردن کو طلاق ہے) یا رأسك طالق (تیرے سر کو طلاق ہے) یا روحك یا بدنك یا جسدك یا فرجك یا وجهك طالق (تیری روح یا بدن یا جسم یا تیری شرم گاہ یا منہ کو طلاق ہے) کیونکہ ان الفاظ سے پورا بدن مراد لیا جا سکتا ہے - جسد اور بدن میں تو ظاہر ہے - اسی طرح دوسرے الفاظ میں ، اللہ تعالی فرماتے ہیں : "فتحریر رقبة" (رقبہ سے مراد پورا غلام ہے) "فظلت أعناقهم" (عنق سے مراد صاحب عنق یعنی آدمی ہے) حضور کا ارشاد ہے : "لعن الله الفروج علی السروج" (فروج سے مراد عورتیں ہیں) "فلان رأس القوم یا وجه القوم (راس اور وجہ سے مراد پورا انسان ہے) وهلك روحه" یعنی نفسه ، اسی معنی میں دم (خون) کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے - جیسے دمه هدر (اس کا خون رائیگاں گیا) اسی طرح نفس کا لفظ ہے اور یہ ظاہر ہے -

مسئلہ : اسی طرح اگر جزء مشہور کی طرف طلاق کی اضافت کی جائے مثلاً کہا جائے تیرے نصف یا تیسرے

حصے کو طلاق ہے کیونکہ جزء شائع بیع وغیرہ کی طرح
تمام تصرفات کا محل بن سکتا ہے - جیسے کوئی نصف غلام
فروخت کر دے) اسی طرح جزء شائع محل طلاق بھی بن
سکتا ہے - لیکن وقوع طلاق کی صورت میں تجزی ممکن نہیں
لہذا ضرورت کے تحت پوری عورت کو طلاق واقع ہوگی -

مسئلہ : اگر مرد نے کہا کہ تیرے ہاتھ کو طلاق
ہے یا تیرے پاؤں کو طلاق ہے تو طلاق واقع نہ ہوگی -
امام زفرؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ واقع ہو جائے گی -
اسی طرح ان تمام اعضاء جسمانی کی طرف طلاق منسوب
کرنے میں اختلاف ہے جن سے عموماً تمام بدن مراد نہیں ہوتا -

امام زفرؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ عقد نکاح کی
وجہ سے عورت کے اس عضو سے تمتع ہو چکا ہے تو جس کی
یہ کیفیت ہو وہ حکم نکاح کا محل ہوتا ہے (کہ نکاح کی
وجہ سے مرد کے لیے اس کا تمتع جائز ہوا ہے) لہذا وہ عضو
محل طلاق بھی ہوگا (اس لیے طلاق کی وجہ سے نا جائز ہو
جائے گا) اور حکم طلاق اپنے منسوب کی وجہ سے اس جزء
میں ثابت ہوگا اور پھر یہی حرمت سارے جسم میں سرایت
کر جائے گی - جس طرح جزء شائع میں آپ بھی قائل ہیں -
بخلاف اس صورت کے جب نکاح کو ایسے جزء (یعنی جزء
معین) کی طرف منسوب کرنے کیونکہ ایسی صورت میں جزء
کا حکم متعدی ہو کر تمام اجزاء پر غالب نہیں آ سکتا بلکہ
باقی اجزاء کی حرمت ایک جزء کی حلت پر غالب آ جانے کی

(کیونکہ جب حلۃ و حرمۃ کا مقابلہ ہو تو غلبہ حرمۃ کو ہوتا ہے) اور طلاق کا معاملہ اس کے برعکس ہے وہاں ایک جزء بدن حرام ہو جاتا ہے تو اس کا اثر بدن کے سارے اجزاء تک سرایت کر جاتا ہے) -

ہماری دلیل یہ ہے کہ مرد نے طلاق بدن کے ایسے جزء کی طرف منسوب کی ہے جو اس کا محل نہیں ، لہذا یہ اضافت ہی لغو ہوگی جیسے مرد طلاق کو اس کے تھوک یا ناخن کی طرف منسوب کرے کیونکہ محل طلاق وہ چیز بن سکتی ہے جس میں قید پائی جائے کیونکہ لفظ طلاق اس بات سے آگاہ کرتا ہے کہ وہ قید اٹھ گئی ہے اور ہاتھ میں کوئی قید نہیں ہوتی (بلکہ قید تو مجموعۂ بدن میں ہوتی ہے کیونکہ عورت نکاح کے بعد بھی اپنے مال میں اپنے ہاتھوں سے تصرف کر سکتی ہے) اور اسی لیے عضو معین کی طرف اضافت نکاح بھی درست نہیں بخلاف 'جزء شائع' کے کیونکہ وہ ہمارے نزدیک محل نکاح ہوتا ہے۔ لہذا نکاح کی اضافت جزء شائع کی طرف درست ہے - پس جزء شائع محل طلاق بھی ہوگا - پشت اور پیٹ کی طرف طلاق منسوب کرنے میں ائمہ کا اختلاف ہے مگر مشہور یہی ہے کہ طلاق نہیں ہوگی کیونکہ ان اعضاء سے پورا بدن مراد نہیں لیا جاتا -

مسئلہ : اگر مرد نے عورت کو نصف طلاق دی یا ایک تہائی طلاق دی تو ایک طلاق واقع ہو جائے گی کیونکہ طلاق کے اجزاء نہیں ہو سکتے اور ہر وہ چیز جو اجزاء میں

منقسم نہ ہو سکے اس کے بعض حصے کے ذکر کرنے سے پوری چیز مراد ہوگی اور اس سے اوپر ہر حصے (یعنی چوتھائی حصہ دسواں حصہ وغیرہ) کے ذکر کرنے کی صورت میں بھی یہی جواب ہوگا۔

مسئلہ : اگر مرد نے عورت سے کہا : انت طالق ثلاثة أنصاف تطليقتين یعنی تجھے دو طلاقوں کے تین نصف طلاقیں ہیں تو تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی کیونکہ دو طلاقوں کا نصف ایک طلاق ہے اور جب تین نصف جمع ہوئے تو ضرورۃ تین طلاقیں بن گئیں۔

مسئلہ : اگر مرد نے کہا : "أنت طالق ثلاثة أنصاف تطليقة" ۔ یعنی تجھے تین نصف طلاقیں ہیں تو بعض کے نزدیک دو واقع ہوں گی کیونکہ تین نصف مل کر ڈیڑھ ہوگئے ۔ مگر آدھی مکمل ہو کر پوری بن گئی اور دو مکمل ہوگئیں ۔ بعض نے کہا کہ تین واقع ہوں گی کیونکہ ہر نصف مکمل ہو کر ایک بن جائے گا اور اس طرح پوری تین طلاقیں ہو جائیں گی ۔

مسئلہ : اگر مرد نے کہا : "أنت طالق من واحدة إلى ثنتين أو ما بين واحدة إلى ثنتين" یعنی تجھے ایک سے دو تک طلاقیں ہیں یا جتنی ایک سے دو تک کے درمیان ہیں تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ایک ہی واقع ہوگی ۔ (صاحبینؒ کے نزدیک دو ہوں گی اور امام زفرؒ کے نزدیک کچھ نہیں)

اور اگر یہ کہا : أنت طالق من واحدة إلى ثلاث أو ما بين واحدة إلى ثلاث تو امام ابو حنیفہ ؒ کے نزدیک دو طلاقیں واقع ہوں گی ۔ صاحبین ؒ فرماتے ہیں کہ پہلی صورت میں دو اور دوسری صورت میں تین واقع ہوں گی ۔ امام زفر ؒ فرماتے ہیں کہ پہلی صورت میں کچھ بھی نہ ہوگا ، البتہ دوسری صورت میں ایک واقع ہوگی ۔

صاحب ہدایہ ؒ فرماتے ہیں کہ امام زفر ؒ کا قول قیاس کے مطابق ہے کیونکہ دونوں اطراف اپنے منتہٰی میں داخل نہیں ہوتے ، جیسا کہ ایک آدمی کہے کہ میں نے اس دیوار سے اس دیوار تک جگہ فروخت کر دی تو دونوں دیواریں بیع میں داخل نہیں ہوں گی ۔ صاحبین ؒ کا قول استحسان پر مبنی ہے کہ جب اس قسم کا کلام مذکور ہوتا ہے تو بالعموم اس سے مراد کل ہی ہوتا ہے ۔ جیسے آپ کسی سے کہیں کہ خذ من مالی من درهم إلى مائة (تو میرے مال سے ایک سے سو درہم تک لے سکتا ہے) تو ایک اور سو بھی اس میں داخل ہوتے ہیں ۔

امام اعظم ؒ فرماتے ہیں کہ اس قسم کے کلام میں "أكثر من الأقل" اور "أقل من الأكثر" مراد ہوتا ہے (یعنی جہاں دو عددوں کے درمیان کوئی عدد ہو وہاں "أكثر من الأقل" مراد ہوگا جیسے أنت طالق من واحدة إلى ثلاث میں ۔ اب یہاں "أقل" اور "أكثر" کے درمیان ایک عدد ہے تو "أكثر من الأقل" لیں گے ۔ "أقل" ایک ہے ،

اس سے زیادہ دو ، لہذا دو طلاقیں واقع ہوں گی ۔ او اگر دو عددوں کے درمیان کوئی عدد نہ ہو ، مثلاً أنت طالق من واحدة إلی ثنتین" تو یہاں "أقل من الأکثر" لیں گے ۔ اب یہاں "أقل" ایک ہے اور أکثر دو ۔ تو "أقل" یعنی ایک مراد لیں گے) جیسے کوئی کہے کہ میری عمر ساٹھ ستر سال کے درمیان ہے تو انہتر مراد ہوگا ۔ اور اگر یوں کہے کہ میری عمر ساٹھ اکسٹھ سال ہے تو ساٹھ سال مراد ہوں گے اور لوگ عموماً یہی مراد لیتے ہیں ، جیسا کہ مذکور ہوچکا ہے ۔

صاحبینؒ کے جواب میں امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ آپ کا بیان کردہ طریق طریق اباحت ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو طلاق میں اصل ممانعت ہے (لہذا آپ کا بیان کردہ طریق یہاں جاری نہ ہوگا) ۔

امام زفرؒ کے جواب میں امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ غایة اولیٰ کا موجود ہونا ضروری ہے تاکہ اس پر غایة ثانیہ مترتب ہوسکے اور اس کا وجود جبھی تسلیم ہوسکتا ہے جب کہ واقع ہوجائے (یعنی اعداد وغیرہ میں پہلی غایة کا اعتبار ضرورة کرنا پڑتا ہے ۔ مثلاً کوئی کہے کہ میری عمر ساٹھ ستر کے درمیان ہے اور ساٹھ کا اعتبار ہی نہ کیا جائے تو ستر ستر ہی نہیں بن سکتے بلکہ دس بنیں گے ۔ لہذا غایة ثانیہ کے مترتب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ غایة اولی کا اعتبار کریں اور یہی صورت طلاق میں ہے) بخلاف

بیع کے (کہ وہاں غایۃ اولی کے اعتبار کرنے کی ضرورت نہیں) کیونکہ وہاں تو دونوں غایتیں بیع سے پہلے ہی موجود ہوتی ہیں (اور طلاق کی صورت میں طلاق سے پہلے تو غایۃ موجود نہیں۔ پہلی غایۃ طلاق دینے پر موجود ہوگی۔ اگر پہلی کا اعتبار ہی نہ کریں تو دوسری اس پر کیسے مترتب ہوگی)۔

اگر أنت طالق من واحدة إلی ثنتین میں ایک کی نیت کرے تو دیانۃً اس کی بات مانی جائے گی لیکن عدالت میں اسے تسلیم نہ کیا جائے گا۔ دیانۃً اس لیے کہ کلام میں اس کا احتمال تو ہے مگر ہے خلاف ظاہر (کیونکہ ایسے کلام میں أکثر من الأقل مراد ہوتا ہے)۔

مسئلہ : اگر مرد کہے "أنت طالق واحدة فی ثنتین" اور ضرب و حساب کی نیت کرے یا کچھ نیت نہ کرے تو ایک طلاق واقع ہوگی۔ امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ عرف حساب کے تحت دو واقع ہوں گی۔ حسن بن زیاد کا بھی یہی قول ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ عمل ضرب اجزاء کو بڑھانے کے لیے ہوتا ہے مضروب میں اضافے کے لیے نہیں (تو واحد فی ثنتین کا مطلب ۱×۲ نہیں ہوگا بلکہ یہ ہوگا کہ ایک کے دو حصے ہوگئے یعنی ۱+۲) اگر ایک طلاق کے اجزاء کثیر ہوجائیں تو اس سے تعدد لازم نہیں آتا۔

مسئله : اگر مرد أنت طالق واحدة فی اثنتین میں واحدة واثنین کی نیت کرے تو تین طلاقیں واقع ہوں گی کیونکہ الفاظ میں ان کا احتمال موجود ہے - واؤ بھی جمع کے لیے استعمال ہوتی ہے - اسی طرح ظرف بھی مظروف کے ساتھ جمع ہوتا ہے - اگر عورت غیر مدخولہ ہو تو ایک واقع ہوگی جیسا کہ أنت طالق واحدة واثنتین" کہے -

. اور اگر "أنت طالق واحدة فی ثنتین" میں "واحدة مع ثنتین" کی نیت کرے تو تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی - کیونکہ کلمہ "فی" بمعنی مع بھی مستعمل ہے کما فی قوله تعالی : "فادخلی فی عبادی ای مع عبادی -" (صاحب ہدایہ کی یہ مثال درست نہیں ہے - صاحب کشاف کہتے ہیں کہ اس آیت میں فی بمعنی مع نہیں ہے بلکہ مطلب ہے : ادخلی فی جملة عبادی) اگر "فی" سے مراد ظرفیة لے تو ایک واقع ہوگی کیونکہ طلاق میں ظرف بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی لہذا دوسری چیز یعنی فی ثنتین کا ذکر لغو ہوگا -

مسئله : اگر مرد نے کہا : أنت طالق اثنتین فی اثنتین اور ضرب و حساب کی نیت کرلی تو دو ہی طلاقیں واقع ہوں امام زفرؒ کے نزدیک تین - کیونکہ حساب کے قاعدے کے پیش نظر تو چار ہوتی تھیں مگر تین سے زیادہ طلاقوں کا وقوع نہیں ہوتا - امام زفرؒ کے جواب میں ہم وہی دلیل پیش کریں گے جو پہلے بیان کر چکے ہیں -

مسئلہ : اگر مرد نے کہا : تجھے یہاں سے ملک شام تک طلاق ہے تو یہ ایک رجعی طلاق ہوگی ۔ امام زفرؒ کے نزدیک یہ بائن ہوگی ۔ کیونکہ مرد نے طلاق کو طول سے متصف کیا ہے (اور یہ طوالت بائن ہونے کا تقاضا کرتی ہے) ۔

ہم کہتے ہیں کہ اس نے طول سے کہاں متصف کیا اس نے تو نے محدود کرکے رکھ دیا (کیونکہ "أنت طالق" ایسی عام صفت ہے کہ عورت روم میں ہو ، شام میں ہو یا ایران میں ، غرضکہ جہاں بھی ہو طلاق واقع ہوجاتی ہے ۔ تو مرد نے طلاق کو شام کے ساتھ مقید کرکے عمومیت کے امکانات کم کر دیے) لیکن مذکورہ صورت میں بھی ہر مقام پر طلاق واقع ہوجائے گی ۔ مرد کے مشروط کرنے سے تخصیص نہ ہوگی ۔

مسئلہ : اگر مرد نے کہا : "أنت طالق بمكة أو فی مكة" تو اسی وقت طلاق واقع ہوجائے گی ۔ خواہ عورت کسی شہر میں ہو ۔ اسی طرح اگر مرد نے کہا "أنت طالق فی الدار" تو طلاق ہوجائے گی کیونکہ طلاق کسی ایک مقام کے ساتھ خاص نہیں ہوتی ۔

اگر بمكة یا فی مكة کی صورت میں مرد کہے کہ میری مراد یہ تھی کہ جب تو مکہ میں آئے گی تو تجھے طلاق ہوگی تو دیانۃً مرد کی تصدیق کی جائے عدالت میں نہیں کیونکہ اس نے پوشیدہ امور کی نیت کی ، اور ایسی نیت کرنا مسلّمہ عقائد کے خلاف ہے ۔

مسئلہ : اگر مرد نے کہا : ”أنت طالق إذا دخلت مكة“ تو جب تک وہ مکہ میں داخل نہ ہوگی اس پر طلاق واقع نہ ہوگی کیونکہ مرد نے طلاق کو دخول مکہ سے معلق کر دیا ہے ۔

اگر مرد نے کہا : ”أنت طالق فی دخولك الدار“ تو یہ طلاق اس فعل سے متعلق ہوجائے گی کیونکہ ظرف اور شرط باہم ملتے جلتے ہیں لہذا ظرف مذکور نہ ہونے کی صورت میں اسے شرط گردانا جائے گا ۔

## فصل فی اضافة الطلاق إلى الزمان

# وقت اور زمانے کی طرف طلاق منسوب کرنے کا بیان

مسئلہ : اگر مرد عورت سے کہے : ”أنت طالق غداً“ تو طلوع فجر کے وقت طلاق واقع ہو جائے گی ۔ کیونکہ اس نے عورت کو آنے والے کل کے پورے دن کے ساتھ طلاق سے منسوب کیا ہے ، اس لیے تمام دن میں طلاق تبھی متصور ہوسکتی ہے جب کہ دن کے اول حصہ میں وقوع طلاق ہوجائے ۔ اگر آخر النہار کی نیت کرے تو دیانةً تصدیق کی جائے گی عدالت میں نہیں کیونکہ اس نے عموم میں تخصیص کی نیت کی ۔ اگرچہ اس کا احتمال موجود تو ہے مگر ظاہر کے خلاف ہے (لہذا عدالت میں تصدیق نہ ہوگی) ۔

مسئلہ : اگر مرد نے کہا : "أنت طالق الیوم غداً أو غداً الیوم" تو جو وقت پہلے منہ سے کہے گا اسی کا اعتبار ہوگا۔ پہلی صورت میں اسی دن اور دوسری صورت میں دوسرے دن وقوع طلاق ہوگا ، کیونکہ جب اس نے الیوم (آج) کہا تو یہ فوری طور پر نافذ ہوگا اور فوری نفاذ اضافت کا احتمال نہیں رکھتا (کہ غد کی طرف مضاف کر دیا جائے) اگر پہلے غد کہا تو اس صورت میں بھی اضافت موجود ہے اور کسی متعین وقت سے منسوب حکم کا نفاذ فوری نہیں ہوا کرتا ، کیونکہ اس سے اضافت باطل ہوجاتی ہے ، لہذا دونوں صورتوں میں دوسرا لفظ لغو قرار پائے گا۔

مسئلہ : اگر مرد نے "أنت طالق فی غد کہا" اور بتانے لگا کہ میری نیت آخر نہار کی تھی تو امام اعظمؒ کے نزدیک قضاءً بھی تصدیق کی جائے گی ، مگر صاحبینؒ کے نزدیک نہیں۔ کیونکہ مرد نے عورت کو "کل" کے سارے دن کے ساتھ طلاق سے متصف کیا ہے گویا اس نے جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے۔ "فی غد" کے بجائے "غداً" کہا۔ لہذا عدم نیت کی صورت میں دن کے اول حصے میں طلاق واقع ہوجائے گی۔ کیونکہ "فی" کا اثبات اور حذف برابر ہوتا ہے۔ اور "غد" دونوں صورتوں میں ظرف ہے۔

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ مرد نے حقیقت کلام کی نیت کی ، کیونکہ کلمہ "فی" حقیقۃً ظرف کے لیے ہے اور ظرف میں استیعاب ضروری نہیں ہوتا (ظرف کا تقاضا یہ ہوتا ہے

کہ مظروف اس کے کسی جزء میں واقع ہو) اور عدم نیت کی
صورت میں جزء اول کی تعیین اس لیے تھی کہ وہاں کوئی
مزاحم نہ تھا اور ضرورۃً ہم نے ایسا کر دیا ۔ مگر مرد نے
جب خود ہی نیت کرکے آخر نہار متعین کر دیا تو تعین
بالارادہ تعین ضروری سے اولی قرار پائے گا بخلاف اس کے
غداً کہنے کے کہ وہ استیعاب کا مقتضی ہے کیونکہ اس
نے عورت کو طلاق سے پورے دن کے ساتھ متصف کیا ہے۔
مثلاً کوئی کہے واللہ میں تمام عمر روزہ رکھوں گا ۔ اور
پہلی کی مثال یہ ہے کہ واللہ میں اپنی عمر میں روزہ رکھوں
گا اور یہی صورت دھر اور فی الدھر کی ہے ۔

مسئلہ : اگر مرد نے کہا کہ تجھے گزشتہ کل طلاق
ہے حالانکہ اس نے شادی ہی آج کی ہے تو کچھ نہ ہوگا ۔
کیونکہ اس نے طلاق کو ایک ایسی حالت معہودہ کی طرف
منسوب کیا ہے (جبکہ نکاح ہی نہیں ہوا اور) جس میں اسے
ملکیت طلاق حاصل نہ تھی لہذا یہ کلام لغو ہوجائے گا ۔
جیسے کہے : "أنت طالق قبل أن أخلق" (یعنی تجھے میری
پیدائش سے پہلے طلاق ہے) اور یہ اس لیے بھی لغو ہے کہ
اس سے مرد گویا خبر دے رہا ہے کہ کل ہمارا نکاح ہی نہ
تھا ۔ یا کل تو کسی دوسرے خاوند کی مطلقہ ہوچکی تھی ۔
(اور آج میری منکوحہ ہو تو یہ کلام بطور انشاء نہیں بطور
خبر درست ہوسکتا ہے) ۔

مسئلہ : اگر مرد (گزشتہ) کل سے پہلے نکاح کر چکا ہو تو اسی وقت طلاق واقع ہوجائے گی ، کیونکہ اس صورت میں اس نے طلاق ملکیت کی منافی حالت کی طرف منسوب نہیں کی اور اسے خبر بنا کر تصحیح بھی نہیں کی جا سکتی ، لہذا انشاء ہوگی ۔ (کیونکہ اسے حق ملکیت حاصل ہے) اور ماضی میں کسی چیز کا نفاذ گویا اس کا حال میں نافذ ہونا ہے لہذا طلاق اسی وقت واقع ہوگی ۔

مسئلہ : اگر مرد نے کہا : "أنت طالق قبل أن أتزوجك" (یعنی اس سے قبل کہ میں تجھے نکاح میں لاؤں تجھے طلاق ہے) تو کچھ واقع نہ ہوگا ، کیونکہ اس نے ملکیت طلاق کو ایسی حالت کی طرف منسوب کیا ہے جب کہ اسے ملکیت طلاق کا حق حاصل نہ تھا ۔ تو اس کا یہ کہنا اس قول کے مترادف ہوگا کہ میں نے تجھے طلاق دی جب کہ میں بچہ تھا ، یا سو رہا تھا ۔ اوز اس کلام کو بصورت خبر بھی کہا جا سکتا ہے جیسا کہ بیان ہوچکا ہے ۔

مسئلہ : اگر مرد نے کہا : أنت طالق مالم أطلقك أو متى لم أطلقك أو متى ما لم أطلقك (یعنی تجھے طلاق ہے جب تک کہ میں تجھے طلاق نہ دوں) ۔ یہ کہہ کر مرد خاموش ہوگیا تو عورت پر طلاق واقع ہوجائے گی کیونکہ اس نے طلاق کو ایک ایسے زمانے کی طرف منسوب کیا ہے جو تطلیق سے خالی ہے اور جب خاموش ہوگیا تو وہ زمانہ پایا گیا ۔ (سوال آپ "متی بمعنی" إذا کیوں نہیں لیتے تا کہ

جب تک زن و شوہر میں ایک مر نہ جائے طلاق واقع ہی نہ ہو - جواب) کلمۂ "متی" اور "متی ما" صراحۃً وقت کے لیے استعمال ہوتے ہیں کیونکہ ظرف زمان ہیں - اور اسی طرح "ما" بھی وقت کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :" مادمت حیاً أی وقت الحیاۃ (یہاں "ما" وقت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے) -

مسئلہ : اگر مرد نے کہا : "أنت طالق إن لم أطلقك" (اگر میں تجھے طلاق نہ دوں تو تجھے طلاق ہے) تو مرد کے مرنے تک طلاق واقع نہ ہوگی - کیونکہ عدم (طلاق) زندگی سے نا امیدی کے وقت تک متحقق نہیں ہوسکتا - (یہ احتمال مرنے تک موجود رہتا ہے کہ اگر آج طلاق نہیں دی تو شاید کل یا پرسوں دے دے یا اس کے بعد دے - مگر موت کے بعد احتمال ختم ہو جاتا ہے) اور وہ شرط ہے جیسا کہ مرد کہے : "أنت طالق إن لم آت البصرۃ" (اگر میں بصرے میں نہ آؤں تو تجھے طلاق ہے - مرد کی وفات تک بصرے میں آنے کا احتمال قائم رہے گا) عورت کی موت بھی وہی حیثیت رکھتی ہے جو مرد کی - یہی صحیح ہے -

مسئلہ : اگر مرد نے کہا : أنت طالق إذا لم أطلقك أو إذا ما لم أطلقك (یعنی جب تک تجھے یا اگر میں تجھے طلاق نہ دوں ، تجھے طلاق ہے) تو امام اعظمؒ کے نزدیک خاوند کی موت تک طلاق نہ ہوگی - صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ مرد کے خاموش ہوجانے پر طلاق واقع ہوجائے گی کیونکہ کلمہ

"إذا" وقت کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ کلام باری تعالی میں ہے ! "إذا الشمس کُوِّرت" (جب سورج کو لپیٹ دیا جائے گا) - یہاں "إذا" برائے وقت استعمال ہوا ہے) اسی طرح عرب شعراء کے کلام میں
وإذا تکون کریھة أدعی لھا واذا یحاس الحیس یدعی جندب

یعنی جب جنگ و جدال اور قتل و قتال کا موقع ہوتا ہے تو مجھے بلایا جاتا ہے مگر جب حلوا پکایا جائے تو جندب کو مدعو کیا جاتا ہے - (حیس چوری کو بھی کہا جاتا ہے جو روٹی گھی اور کھانڈ سے بنائی جاتی ہے) -

تو 'إذا' بمنزلہ 'متی اور متی ما' کے ہوگا - اسی بناء پر اگر مرد اپنی عورت سے کہے 'أنت طالق إذا شئت' (تو جب چاہے تجھے طلاق ہے) تو مجلس سے اٹھ جانے پر اختیار اس کے ہاتھ سے نہ جائے گا جیسا کہ متی شئت کہہ دے (صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ اگر "إن" سے اختیار دیا جائے تو اسی مجلس تک مقید ہوتا ہے لیکن جب "إذا" سے اختیار دیا جائے تو آپ بھی کہتے ہیں کہ مجلس سے مقید نہ ہوگا - لہذا ثابت ہؤا کہ "إذا" بمنزلہ "متی" ہے اور یہی ہمارا مطلوب تھا) -

امام اعظمؒ صاحبینؒ کے جواب میں فرماتے ہیں کہ "إذا" برائے شرط بھی استعمال ہوتا ہے - جس طرح (عرب کا ایک شخص اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے کہتا ہے :

واستغن ما أغناك ربك بالغنى     وإذا تصبك خصاصة فتجمل

(یعنی جب تک اللہ تعالی تجھے دولت مندی عطا کرتا ہے تو اس کا اظہار کرتا رہ اور اگر تو فقر و فاقہ میں مبتلا ہو جائے تو صبر جمیل اختیار کر ۔ دیکھیے یہاں إذا شرط کے معنوں میں ہے کیونکہ اپنے بعد مضارع کو جزم دے رہا ہے) ۔

اگر "إذا" بمعنی شرط لیا جائے تو "إن" کی طرح اسی وقت طلاق واقع نہیں ہوگی اور اگر وقت کے معنوں میں لیا جائے تو اسی وقت واقع ہوگی لہذا شک و احتمال کی بناء پر وقوع طلاق کا فتوے نہیں دیا جائے گا (یعنی یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ مرد نے شرط والا معنی مراد لیا ہے یا وقت والا) بخلاف مسئلہ مشیئۃ کے کیونکہ وقت کے معانی میں اس کا اعتبار کیا جائے تو اختیار باطل نہیں ہوتا جیسے "متی" کی صورت میں (کہ عورت جس وقت بھی چاہے اختیار اس کے ہاتھ میں باقی رہے گا) اور جب "إذا" کو شرط کے معنوں میں لیا جائے تو مجلس کے بعد اختیار اس کے ہاتھ سے جاتا رہتا ہے حالانکہ اختیار اس کے ہاتھ میں آ چکا ہے مگر ہم شک و احتمال کی وجہ سے اس کا اختیار ضائع نہیں کرتے اور باقی رکھتے ہیں ۔

امام اعظمؒ اور صاحبینؒ میں یہ اختلاف اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے جب مرد نے کوئی نیت نہ کی ہو ۔ لیکن

اگر وقت کی نیت کر لے تو اسی وقت طلاق واقع ہوگی اور ........... اگر شرط کی نیت کرے تو آخر عمر میں، کیونکہ لفظ میں دونوں احتمال موجود ہیں۔

مسئلہ : اگر مرد نے کہا : "أنت طالق مالم أطلقك أنت طالق" (تجھے طلاق ہے جب تک میں تجھے طلاق نہ دوں تجھے طلاق ہے) تو عورت دوسرے "أنت طالق" سے (استحساناً) مطلقہ ہوجائے گی۔ یہ اس وقت مراد ہوگا جب دوسری بار "أنت طالق" متصلاً ہی کہدے (اگر ذرا وقفہ کرکے دوسری بار "أنت طالق" کہے تو دو واقع ہوں گی)۔ قیاس تو یہ تھا کہ یہ طلاق زمانے کی طرف بھی منسوب ہوتی اور عورت کے مدخولہ ہونے کی صورت میں دو واقع ہوتیں مگر استحسان کے پیش نظر ایک کے واقع ہونے کا حکم دیا گیا)۔

امام زفرؒ کے نزدیک دو واقع ہوں گی کیونکہ ایسے زمانے کا وجود ثابت ہے جو طلاق سے خالی رہا ہے اگرچہ وہ زمانہ بہت ہی قلیل ہے اور وہ زمانہ "أنت طالق" سے فارغ ہونے سے پہلے ہے۔ (یعنی طلاق اس وقت واقع ہوگی جب مرد ان ت ط ا ل ق کے قاف پر پہنچے گا اور اس پر پہنچنے سے پہلے خالی وقت پایا گیا، لہذا پہلی طلاق بھی واقع ہوگئی اور دوسری بھی)۔

استحسان کی توجیہ یہ ہے کہ زمانۂ قسم (یعنی أنت طالق کہنے کا زمانہ) دلالت حال کی وجہ سے یمین سے مستثنٰی

ہوتا ہے کیونکہ مقصود ''بر'' ہی ہے اور تحقق ''بر''
یعنی قسم) ممکن نہیں ہوتا جبھ تک کہ اس قدر زمانہ
مستثنٰی نہ کیا جائے (یعنی تعلیق ایک قسم کی یمین ہوتی
ہے اور ایک شخص الفاظ یمین کو مکمل کرنے کے لیے جو
وقت صرف کرتا ہے وہ یمین سے مستثنٰی ہوتا ہے۔ جیسا
کہ کوئی شخص کہے : بخدا میں اس گھوڑے پر سواری
نہیں کروں گا مگر وہ پہلے ہی سوار ہو تو اب اترنے میں
جتنا وقت لگے گا وہ یمین سے مستثنٰی ہوگا تاکہ وہ اپنی قسم
سے بری ہوسکے لہذا جب اس قدر وقت ضرورت کے پیش نظر
مستثنٰی کرنا پڑا تو پہلی طلاق واقع نہ ہوگی) ۔ اس کی
مثال یہ ہے کہ جو شخص قسم کھائے میں اس گھر میں نہیں
رہوں گا اور وہاں سے منتقل ہونے میں اسی وقت مصروف
ہوجائے (تو یہ وقت یمین سے مستثنٰی ہوگا) ۔ ایسی ہی اور
بھی کئی مثالیں ہیں جن کی تفصیلی بحث کتاب الأیمان میں
کی جائے گی ۔

مسئلہ : جس شخص نے کسی عورت سے کہا : جس
دن میں تجھ سے نکاح کروں تجھے طلاق ہے ۔ لیکن اس نے
رات کے وقت نکاح کیا تو طلاق ہوجائے گی ۔ کیونکہ یوم
سے مراد دن کی سفیدی اسی وقت لی جائے گی جب اسے کسی
فعل ممتد سے ملا دیا جائے جیسا کہ جس دن فلاں شخص آئے
گا میں روزہ رکھوں گا یا جس دن فلاں شخص آئے گا تجھے
اختیار ہوگا ۔ کیونکہ امتداد فعل والی ایسی صورتوں میں

وقت معیار ہوتا ہے ۔ اور یہ زیادہ مناسب ہے ۔ مگر جب یوم کو فعل غیر ممتد سے ملایا جائے تو یوم سے مراد مطلق وقت ہوتا ہے (خواہ رات کا کوئی حصہ ہو یا دن کا) جیسا کہ (ومن یولھم یومئذ دبرہ) اور یہاں اس سے مطلق وقت مراد ہے ۔ لہذا اسی پر محمول ہوگا بشرطیکہ فعل غیر ممتد سے ملا دیا جائے اور طلاق بھی اسی قسم سے ہے ۔ لہذا دن اور رات دونوں کو شامل ہوگی ۔

مسئلہ : اگر مرد دعوے کرے کہ میں نے تو خصوصاً دن کی سفیدی مراد لی تھی تو قضاء تصدیق کی جائے گی ۔ کیونکہ اس نے حقیقت کلام کی نیت کی ۔ اس لیے رات سے مراد تاریکی اور دن سے مراد سفیدی ہوتی ہے اور یہ لغة ہے ۔

## فصل

مسئلہ : جو شخص اپنی عورت سے کہے : أنا منك طالق (میں تجھ سے چھوٹ رہا ہوں) خواہ طلاق ہی کی نیت کرے تو کچھ نہ ہوگا ۔ اور اگر کہے أنا منك بائن أو علیك حرام ، (یعنی میں تجھ سے بائن ہوں یا تجھ پر حرام ہوں) اور طلاق کی نیت کرے تو طلاق واقع ہوجائے گی ۔

امام شافعی[رح] فرماتے ہیں کہ پہلی صورت میں بھی بشرط نیت طلاق ہوجائے گی کیونکہ ملک نکاح میاں بیوی دونوں میں مشترک ہوتا ہے ۔ حتی کہ مرد جس طرح عورت سے

تمکن علی الوطی کے مطالبے کا حق رکھتا ہے عورت بھی مباشرت کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ اسی طرح حلت بھی دونوں میں مشترک ہوگی اور طلاق اسی حلت اور ملک نکاح کے ازالے کے لیے ہوتی ہے۔ تو اسے جس طرح عورت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، مرد کی طرف بھی منسوب کیا جا سکتا ہے اور ابانۃ و حرمۃ میں تو آپ نے بھی مرد کی طرف اضافت و نسبت کو درست تسلیم کیا ہے تو نسبت طلاق میں کیا مانع ہے۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ طلاق قید نکاح کے ازالے کے لیے ہوتی ہے اور یہ قید عورت میں پائی جاتی ہے نہ کہ مرد میں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ عورت ایک مرد کے نکاح میں ہوتے ہوئے دوسرے شخص سے نکاح نہیں کر سکتی۔ اگر طلاق کو ازالہ ملک کے لیے بھی تسلیم کیا جائے تو بھی طلاق عورت پر ہی واقع ہوتی ہے کیونکہ وہ مملوکہ ہے اور مرد مالک ہے اسی لیے مرد کو ناکح اور عورت کو منکوحہ کہا جاتا ہے بخلاف ابانت کے، کیونکہ یہ ابانت اس رشتہ و پیوند کے ازالے کے لیے ہوتی ہے جو دونوں میں مشترک ہے اور بخلاف تحریم کے کیونکہ یہ ازالۂ حلت کے لیے ہوتی ہے اور حلت بھی میاں بیوی دونوں میں مشترک ہوتی ہے تو ان دونوں کی اضافت دونوں کی طرف درست ہے۔ مگر طلاق کو صرف عورت کی طرف ہی منسوب کرنا درست ہوگا۔

مسئلہ : اگر مرد عورت سے کہے أنت طالق واحدۃ أو لا (تجھے ایک طلاق ہے یا نہیں ہے) تو کچھ نہ ہوگا۔ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ الجامع الصغیر میں اسی طرح اختلاف ائمہ کے بغیر درج ہے۔ حالانکہ امام اعظمؒ اور امام ابو یوسفؒ کا یہ آخری قول تھا۔ امام محمدؒ کے نزدیک اور امام ابو یوسفؒ کے پہلے قول کے مطابق ایک رجعی طلاق واقع ہوگی۔ امام محمدؒ کا قول کتاب الطلاق میں مذکور ہے کہ جب مرد عورت سے کہے : "أنت طالق واحدۃ أو لا شیء" تو دونوں مسئلوں میں کوئی فرق نہیں۔ اگر الجامع الصغیر میں سب کا قول مذکور ہے (تو پھر اس کی توجیہ یہ ہوگی کہ اس مسئلے میں) امام محمدؒ سے دو روایتیں ہیں۔

امام محمد اپنی دلیل اسی طرح پیش کرتے ہیں کہ مرد نے واحدۃ میں شک پیدا کر دیا کیونکہ اس نے "واحدۃ" اور نفی کے درمیان کلمہ "أو" استعمال کیا۔ اس اعتبار وحدۃ ساقط ہوگیا اور باقی صرف "أنت طالق" رہ گیا۔ (جس سے ایک طلاق واقع ہوجائے گی) بخلاف اس کے جب مرد کہے "أنت طالق أو لا" تو یہاں اصل ایقاع میں شک ہے اس لیے طلاق واقع نہیں ہوگی۔

اس کے جواب میں امام اعظمؒ اور ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ جب وصف (یعنی طلاق) کسی عدد کے ساتھ ملائی جائے تو اس کا وقوع اس وقت تک نہ ہوگا جب تک کہ

عدد کا ذکر نہ کیا جائے۔ کیا آپ کو علم نہیں کہ مرد غیر مدخولہ کو "أنت طالق" ثلاثاً کہے تو تینوں طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں اور "أنت طالق" ثلاثاً میں اگر فقط "أنت طالق" سے طلاق واقع ہوجاتی ہے تو پھر تین کا ذکر ہی لغو تھا اور یہ ثابت ہے (کیونکہ فقط "أنت طالق" ہی سے بائن ہوگئی) در حقیقت جس سے طلاق واقع ہوتی ہے وہ مصدر طلاق ہے جو محذوف مانا جاتا ہے (جس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ تم پر ایک طلاق واقع ہو (یا تم پر تین طلاقیں واقع ہوں) جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے اور جب واقع ہونے والی وہ چیز ہے جس کی صفت عدد بنتا ہے تو اصل ایقاع میں شک پیدا ہوگیا ۔ اس لیے کچھ واقع نہ ہوگا (یعنی جب صفت میں شک پیدا ہوگیا تو موصوف بھی مشکوک ہوگا اور طلاق واقع نہ ہوگی) ۔

مسئلہ : اگر مرد عورت سے کہے : "أنت طالق مع موتی أو مع موتك" (تجھے میری موت پر یا تیری موت پر طلاق ہوگی) تو کچھ واقع نہ ہوگا ، کیونکہ مرد نے طلاق کو ایک منافیٔ طلاق حالت کی طرف نسبت کیا اور مرد کی موت سے طلاق کی اہلیت ختم ہوجاتی ہے اور عورت کی موت سے طلاق کی محلیۃ ۔ حالانکہ وقوع طلاق کے لیے ان دونوں باتوں کا ہونا ضروری ہے ۔

مسئلہ : اگر مرد اپنی بیوی کا مالک بن گیا یا اس کے کچھ حصے کا ۔ یا بیوی مرد کی یا اس کے کچھ حصے کی

مالکہ بن جائے تو دونوں میں فرقت پیدا ہوجائے گی کیونکہ ملک یمین اور ملک نکاح دونوں متضاد ہیں۔ عورت کے مالکہ بننے کی صورت میں یہ نقص پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ مالکہ بھی بن جاتی ہے اور مملوکہ بھی۔ رہا مرد کی ملک کا سوال تو وہ اس لیے ممکن نہیں کہ ملک نکاح تو ضرورت کے مدنظر تھا اور جب ملک یمین اسے حاصل ہوجائے تو نکاح کی ضرورت باقی نہیں رہتی، لہذا وہ ختم ہو جاتا ہے۔

مسئلہ : اگر مرد عورت کو خرید لے اور پھر اسے طلاق دے دے تو کچھ واقع نہ ہوگا کیونکہ طلاق کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے نکاح قائم ہو اور نکاح نہ تو ضمنی طور پر باقی ہے اور نہ کامل طور پر (من وجہ کی مثال یہ ہے کہ اگر مرد عورت کو ایک رجعی طلاق دے دے تو عدت کے ختم ہونے سے پہلے دوسری طلاق بھی دے سکتا ہے کیونکہ من کل الوجوہ اگرچہ نکاح باقی نہیں مگر من وجہ باقی ہے کہ وہ عدۃ میں رجوع کر سکتا ہے۔ عورت کا نفقہ، سکنی وغیرہ مرد کے ذمے ہے)۔

ایسے ہی اگر عورت کامل طور پر مرد کی مالکہ ہوجائے یا اس کے کچھ حصے کی مالکہ بن جائے تب بھی طلاق واقع نہیں ہوگی کیونکہ تضاد موجود ہے جیسا کہ گزر چکا۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ طلاق واقع ہو جائے گی کیونکہ عورت پر عدۃ واجب ہوتی ہے بخلاف پہلی صورت

کے کہ وہاں عدۃ واجب نہیں بلکہ اسی وقت مباشرت
جائز ہے -

مسئلہ : جب عورت غیر کی لونڈی ہو اور خاوند اسے
کہے : "أنت طالق ثنتين مع عتق مولاك إياك" (تجھے مولی
کے آزاد کرنے کے ساتھ ہی دو طلاقیں ہیں) مالک نے اسے
آزاد کر دیا تو عورت پر طلاق واقع ہوجائے گی اور خاوند
رجوع کا مالک ہوگا کیونکہ مرد نے طلاق کو اعتاق یا
عتق سے معلق کیا اور لفظ عتق دونوں کو شامل ہے اور
شرط وہ ہے جو فی الحال معدوم ہے مگر عنقریب اس کے
موجود ہونے کی توقع ہے اور حکم کا تعلق اس شرط سے
ہوتا ہے اور اعتاق یا عتق بھی اس وصف کے ساتھ موصوف
ہے کہ فی الحال جب اس نے أنت طالق کہا تو عتق و اعتاق
موجود نہیں مگر اس کے موجود ہونے کی توقع ہے اور حکم
یعنی وقوع طلاق بھی اسی کے ساتھ معلق ہے کیونکہ
تعلیقات میں تصرف تطلیق ہمارے نزدیک شرط کے موجود
ہونے پر ہوگا (ہمارے نزدیک سبب شرط کے موجود ہونے
پر ہی سبب بنتا ہے بخلاف امام شافعیؒ کے) تو جب تطلیق
اعتاق و عتق سے معلق ہے تو پہلے عتق و اعتاق موجود
ہوگا پھر ایقاع طلاق اور اس کے بعد وقوع طلاق - پس
طلاق عتق سے مؤخر ہوگی اور طلاق عورت پر اس وقت
واقع ہوگی جب وہ آزاد ہو جائے گی تو دو سے مغلظہ نہ
ہوگی - ہاں یہ بات رہ جاتی ہے کہ کلمۂ "مع معية" کے معنوں

میں استعمال ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ کبھی تأخر کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ باری تعالی کے ارشاد میں (إن مع العسر یسراً إن مع العسر یسراً) (کہ تنگی کے بعد آسانی ہوتی ہے یعنی تنگی کے ختم ہونے کے بعد آسانی آتی ہے) تو شرط کی بناء پر یہاں مع بمعنی بعد ہی لیں گے۔

مسئلہ : اگر خاوند نے بیوی سے کہا : "إذا جاء غد فأنت طالق ثنتین" (جب کل آئے تو تجھے دو طلاقیں ہیں) اور مالک نے کہا : "إذا جاء غد فأنت حرة" (جب کل آئے تو تو آزاد ہے) جب کل کا دن آیا (عورت اس سے جدا ہوگئی اور) جب تک وہ دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے گی اس خاوند کے لیے حلال نہ ہوگی اور اس کی عدت تین حیض ہوگی یہ صورت شیخینؒ کے نزدیک ہے (ان کے نزدیک طلاق اس کے باندی ہونے کی صورت میں واقع ہوتی ہے ، مگر امام محمدؒ کے نزدیک آزاد ہونے کی صورت میں) ۔ لہذا امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ خاوند کو رجعت کا اختیار ہے کیونکہ شوہر نے ایقاع طلاق کو اعتاق مولی کے ساتھ اکھٹا کر دیا ہے اور خاوند نے بھی (اگلے دن کو) اسی شرط کے ساتھ معلق کیا ہے جس کے ساتھ مولی نے عتق (آزادی) کو معلق کیا ہے ۔ اس لیے معلق یعنی تطلیق شرط (یعنی اعتاق) کے پائے جانے پر سبب بنے گا اور عتق اعتاق کے ساتھ ساتھ ہی ہوگا کیونکہ اعتاق علۃ ہے اور عتق معلوم ہے (قانون) استطاعت یعنی علت دو قسم کی ہوتی ہے : مجازی اور حقیقی ۔ استطاعت

مجازی وہ ہوتی ہے کہ سلامتی اسباب و آلات ہو اور حقیقی وہ ہے جو معلول کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ مثلاً ایک شخص قسم کھائے کہ میں بشرط استطاعت لاہور جاؤں گا تو اب استطاعت مجازی یہ ہے کہ سلامتی اسباب و آلات ہو اور علۃ حقیقی یہ ہے کہ بالفعل چل پڑے اور اعصابی حرکات و سکنات سے قوت پیدا ہو جائے تو استطاعت حقیقی چلنے کے ساتھ ساتھ ہوگی) اور وقوع طلاق عتق کے بعد ہوگا لہذا اس کی صورت بھی پہلے مسئلے کی سی ہوگی اسی لیے اس کی عدت تین حیض مقرر کی جاتی ہے۔

شیخین؁ کی دلیل یہ ہے کہ خاوند نے طلاق کو اسی شرط کے ساتھ معلق کیا ہے جس کے ساتھ اس کے مولی نے عتق (آزادی) کو معلق کیا ہے۔ لہذا آزادی عورت کو اس حالت میں ملے گی جب وہ باندی تھی اور اسی طرح طلاق بھی (تو جب طلوع فجر ہوا تو ایک طرف سے طلاق وارد ہوگی اور دوسری طرف سے عتق یعنی دونوں بیک وقت وارد ہوں گے) اور دو طلاقیں باندی کے حق میں مغلظہ ہوتی ہیں۔ بخلاف پہلے مسئلہ کے۔ وہاں تو تطلیق اعتاق مولی کے ساتھ معلق تھی اور طلاق عتق کے بعد واقع ہوتی ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں بخلاف عدت کے کیونکہ وہ احتیاطاً تین حیض قرار دی جاتی ہے۔ اسی طرح حرمت کو حرمۃ غلیظہ قرار دیا گیا (یعنی دو سے مغلظہ قرار دیا گیا کیونکہ احتیاط اسی میں ہے) امام محمد؁ نے جو کچھ کہا

ہے اس کی کوئی دلیل نہیں کیونکہ عتق کو اگر اعتاق قرار دیا جائے کہ وہ اس کی علت ہے تو طلاق کو تطلیق قرار دیا جائے گا کیونکہ یہ اس کی علت ہے لہذا طلاق و عتق اس صورت میں مشابہ ہوں گے (اور دونوں مقارن ہوں گے) ۔

# فَصْلٌ فِی تَشْبِیہِ الطَّلَاقِ وَوَصْفِه

# طلاق کی تشبیہ اور وصف کا بیان

مسئلہ : جس شخص نے اپنی عورت سے کہا : أنت طالق ھکذا (تجھے اس طرح طلاق ہے) اور اپنے انگوٹھے ، شہادت والی اور درمیانی انگلی سے اشارہ کیا تو تین طلاقیں واقع ہوں گی کیونکہ عرف عام میں انگلیوں کے اشارے سے عدد کا علم ہوتا ہے جب کہ اشارہ عدد مبہم کے ساتھ ہو۔ حضور ﷺ نے فرمایا : الشھر ھکذا وھکذا (دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے تین مرتبہ اشارہ فرمایا جس سے مراد تیس دن ہیں) اگر ایک انگلی سے اشارہ کرے تو ایک طلاق واقع ہوگی دو سے اشارہ کرے تو دو واقع ہوں گی اور اشارہ کھلی انگلیوں ہی سے ہؤا کرتا ہے۔ بعض نے کہا جب انگلیوں کی بیرونی طرف سے اشارہ کرے تو وہ جڑی ہوئی ہوں (انگلیوں کی چار حالتیں ہیں ، مفتوحہ ، مقبوضہ ، منشورہ اور مضمومہ ۔ یہاں منشورہ اور مضمومہ کا مقابلہ ہے) اور اشارہ منشورہ سے واقع ہؤا کرتا ہے تو اگر مضمومتین سے اشارہ کی نیت کرے تو دیانۃً تصدیق کی جائے گی ، عدالت میں نہیں کی جائے گی۔ اسی طرح ہتھیلی سے اشارہ کرنے میں۔

پہلی صورت میں (جب حالت نشر میں دو جڑی ہوئی انگلیوں سے اشارہ کرے) دیانۃً دو ہوں گی اور دوسری صورت میں (جب حالت نشر میں کف سے اشارہ کرے تو) ایک ، کیونکہ اس کا احتمال پایا جاتا ہے ، اگرچہ خلاف ظاہر ہے ۔ اگر اس کے ساتھ "هكذا" نہ کہے تو ایک واقع ہوگی کیونکہ اشارہ عدد مبہم کے ساتھ نہیں ہوا ۔ لہذا اب اس کے باقی قول أنت طالق کا اعتبار کیا جائے گا ۔

مسئلہ : جب مرد طلاق کو کسی قسم کی زیادتی یا شدت سے موصوف کرے تو طلاق بائن واقع ہوگی ۔ مثلاً یوں کہے : أنت طالق بائن أو البتة ۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ طلاق رجعی واقع ہوگی بشرطیکہ بعد از دخول ہو ، کیونکہ طلاق اسی طرح مشروع ہے کہ اس کے بعد رجعت ہو سکے تو بینونۃ وغیرہ سے موصوف کرنا خلاف شرع ہوگا ۔ پس وصف لغو قرار پائے گا ۔ جیسے کہے : أنت طالق أن لا رجعة لی علیك (تجھے ایسی طلاق ہے جس سے مجھے رجعت کا اختیار نہ ہوگا تو اس کے ایسا کہنے کے باوجود طلاق رجعی واقع ہوگی) ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ مرد نے طلاق کو ایسی چیز سے موصوف کیا ہے جس کا احتمال لفظ میں موجود ہے ۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ دخول سے قبل اور عدت کے بعد طلاق ہی سے فرقت پیدا ہوتی ہے ۔ لہذا یہ وصف دو احتمالوں (بائن اور رجعی) میں سے ایک کا تعین کر دیتا ہے ۔ آپ کی

پیش کردہ مثال میں بھی ہم بائن کے قائل ہیں نہ کہ رجعی کے جب مرد کی کوئی نیت نہ ہو تو ایک بائنہ واقع ہوگی۔ اگر دو کی نیت کرے تو بھی ایک واقع ہوگی۔ لیکن اگر تین کی نیت کرے تو تین واقع ہوں گی۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے (کیونکہ طلاق جنس ہے جس میں وحدۃ شخصی اور وحدۃ نوعی کا احتمال ہوتا ہے اور دو نہ تو وحدۃ شخصی ہے اور نہ وحدۃ نوعی)۔

اگر أنت طالق سے ایک کی نیت کرے اور بائن یا بتہ سے دوسری کی تو دو بائن طلاقیں واقع ہوں گی کیونکہ یہ وصف اس قابل ہے کہ مرد اس سے ابتداءً ہی طلاق واقع کرے۔

مسئلہ : اگر مرد کہے أنت طالق أفحش الطلاق (تجھے فحش قسم کی طلاق ہے) تو ایک بائن طلاق واقع ہوگی کیونکہ طلاق کو اس وصف سے اسی وقت متصف کیا جاتا ہے جب کہ اس کے اثر کو معتبر سمجھا جائے اور وہ یہ ہے کہ فرقت فوراً واقع ہو جائے لہذا یہ (أنت طالق) بھی بائن کی طرح ہوگیا۔

اور جب "أخبث الطلاق (أو أسوأہ") یعنی خبیث تر یا بدتر قسم کی طلاق تو ایسی ہی صورت ہوگی جیسا کہ بیان ہو چکا۔

اگر مرد طلاق الشیطان یا طلاق البدعة کہے تو بھی ہمارے نزدیک ایک بائن ہوگی کیونکہ ایک رجعی تو سنت ہوتی ہے اور طلاق بدعة یا شیطان بائن ہوگی۔

ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ مرد کے بدون نیت أنت طالق البدعة کہدینے سے طلاق بائن نہیں ہوگی کیونکہ بعض دفعہ حیض کی حالت میں طلاق رجعی حالت ایقاع کے لحاظ سے بدعی بن جاتی ہے۔ اس لیے بینونة کے لیے نیت ضروری ہے۔

امام محمدؒ کا قول ہے کہ طلاق کو أنت طالق البدعة أو طلاق الشیطان کہنے سے رجعی واقع ہوگی کیونکہ یہ وصف تو حالت حیض میں طلاق دینے سے بھی پیدا ہوسکتا ہے تو شک کی بناء پر فرقة و بینونة ثابت نہ ہوگی۔

مسئلہ : اگر مرد کہے أنت طالق کالجبل (تجھے پہاڑ جیسی طلاق ہے) تو ایک طلاق بائن واقع ہوگی کیونکہ جبل سے تشبیہ کا تقاضا لا محالہ زیادتی ہے اور زیادتی وصف ہی میں ہوسکتی ہے۔

اسی طرح اگر مرد "مثل الجبل" کہے تو بھی یہی صورت ہوگی جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ امام یوسفؒ رجعی کے قائل ہیں کیونکہ جبل شیے واحد ہے۔ لہذا تشبیہ وحدة میں ہوگی۔

مسئلہ : اگر مرد کہے "أنت طالق أشد الطلاق أو کالف أو ملء البیت (یعنی تجھے شدید قسم کی طلاق ہے یا ہزار جیسی یا بھرے گھر جیسی) تو ایک طلاق بائن واقع ہوگی إلا یہ کہ تین کی نیت کرے۔

کیونکہ پہلی صورت میں اس نے طلاق کو شدت سے موصوف کیا اور وہ بائن ہے اور طلاق بائن (رجوع کرنے

ہے) متروک اور ساقط ہونے کا احتمال نہیں رکھتی - مگر رجعی میں یہ احتمال باقی رہتا ہے -

تین کی نیت اس لیے صحیح ہے کہ اس نے مصدر کا ذکر کیا ہے (اور مصدر جنس ہوتا ہے جس میں وحدۃ نوعی اور وحدۃ شخصی کا احتمال ہوتا ہے) -

دوسری صورت (کألف) میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ذکر عدد سے کاہے تشبیہ میں زور مراد ہوتا ہے اور کاہے عدد میں - کہا جاتا ہے : هو كألف رجل (کہ وہ ہزار مرد کے برابر ہے) اور اس سے مراد قوت ہوتی ہے تو دونوں چیزوں (قوت و عدد) کی نیت درست ہو سکتی ہے اور عدم نیت کی صورت میں کمتر چیز مراد لیں گے (یعنی ایک بائنہ)

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ عدم نیت کی صورت میں بھی تین واقع ہوں گی کیونکہ ہزار عدد ہے اس لیے (یقیناً) تشبیہ فی العدد مراد ہوگی - گویا کہ مرد نے یوں کہا : "أنت طالق كعدد ألف" (تجھے ہزار کے عدد جیسی طلاق ہے لہذا تین واقع ہوں گی)

تیسری صورت کی تفصیل یہ ہے کہ کاہے تو ایک چیز اپنے عظیم حجم ہونے کی وجہ سے گھر کو بھر دیتی ہے اور کاہے کثرت کی وجہ سے تو جس امر کی نیت کرے گا درست ہوگی اور عدم نیت کی صورت میں کمتر چیز کو ثابت کیا جائے گا -

اس قسم کی تشبیہات کے سلسلے میں امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جب طلاق کو کسی چیز کے ساتھ تشبیہ دی جائے تو بائنہ ہوتی ہے۔ خواہ مشبہ بہٖ کی عظمت کا ذکر کیا جائے یا نہ (اور مشبہ بہ فی نفسہ خواہ بڑا ہو یا چھوٹا) ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ تشبیہ زیادۃ وصف کا تقاضا کرتی ہے۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ عظمت اور بڑائی کا ذکر کرنے سے بائن ہوگی ورنہ نہیں۔ مشبہ بہ (بڑا یا چھوٹا) جس قسم کا بھی ہو کیونکہ بعض دفعہ تشبیہ سے علی طریق التجرید وحدۃ بھی مراد ہوتی ہے مگر عظمت کا ذکر لا محالہ زیادۃ وصف کے لیے ہوتا ہے۔

امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ اگر مشبہ بہ عرف عام میں اس "عظم" سے موصوف ہوسکے تو بائن ہوگی ورنہ رجعی۔

امام محمدؒ کے بارے میں بعض فقہاء کا قول یہ ہے کہ وہ امام اعظمؒ سے متفق ہیں اور بعض دوسرے فقہاء کے نزدیک وہ امام ابو یوسفؒ کے ساتھ اتفاق رکھتے ہیں۔

اس اختلاف کا ظہور اس قول مثل رأس الإبرة ، مثل عظم رأس الإبرة ، و مثل الجبل ، مثل عظم الجبل میں ہے (ان مثالوں میں پہلی مثال رأس الابرۃ امام اعظمؒ کے نزدیک بائن واقع ہوگی جب کہ امام محمدؒ امام ابو یوسفؒ کے ساتھ ہوں مثل عظم رأس الإبرة امام اعظمؒ اور ابو یوسفؒ کے نزدیک بائن۔ مثل الجبل امام اعظمؒ اور امام زفرؒ کے

نزدیک بائن۔ مثل عظم الجبل سب کے نزدیک بائن۔ امام اعظمؒ کے نزدیک وجود تشبیہ کے لیے ابو یوسفؒ کے نزدیک ذکر عظم سے اور امام زفرؒ کے نزدیک اس لیے کہ جبل عرف عام میں عظم سے متصف ہوتا ہے)۔

مسئلہ: اگر مرد نے کہا: "أنت طالق تطليقة شديدة أو عريضة أو طويلة" (تجھے شدید قسم کی یا عریض قسم کی یا طویل قسم کی طلاق ہے) تو ایک بائن طلاق واقع ہوگی۔ کیونکہ جس چیز کا تدارک ممکن نہ ہو وہ مرد کو شدید ہی معلوم ہوتی ہے اور وہ بائن ہے (اس لیے اس طلاق کا بھی رجوع کرنے سے تدارک نہیں ہوسکتا) اسی طرح جو کام انسان کے لیے سخت اور مشکل ہو اس کے لیے کہا جاتا ہے کہ یہ تو بڑا لمبا چوڑا کام ہے۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ مذکورہ الفاظ سے طلاق رجعی واقع ہوگی کیونکہ طلاق اس قسم کے اوصاف سے متصف نہیں ہوسکتی۔ لہذا یہ وصف لغو ٹھہرے گا۔

اگر مذکورہ صورتوں میں مرد تین کی نیت کرے تو درست ہوگا کیونکہ بینونۃ کی دو قسمیں ہیں (خفیفہ اور غلیظہ) اس کی بحث پہلے گزر چکی ہے اور ان الفاظ سے طلاق بائن واقع ہوتی ہے۔

## فَصْلٌ فِي الطَّلَاقِ قَبْلَ الدُّخُولِ

# قبل دخول طلاق دینے کا بیان

مسئلہ : اگر مرد اپنی غیر مدخولہ بیوی کو تین طلاقیں دے دے تو اس پر واقع ہو جائیں گی کیونکہ طلاق کا وقوع مصدر محذوف سے ہوتا ہے اور اس کے معنی ہیں طلاقاً ثلاثاً جیسا کہ بیان ہو چکا ہے (سوال : جب مرد نے غیر مدخولہ بیوی کو "أنت طالق ثلاثاً" کہا تو اس پر أنت طالق ہی سے طلاق واقع ہوگی اور ثلاثاً تو لغو ہوگا۔

جواب : ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ جب طلاق کو عدد سے متصف کیا جائے تو یہ مصدر محذوف کی صفت ہوتا ہے) تو صرف أنت طالق سے ایقاع طلاق نہ ہوگا بلکہ تینوں اکھٹی واقع ہوں گی۔

مسئلہ : اگر غیر مدخولہ عورت کو تین طلاقیں متفرق طور پر دی جائیں تو پہلی ہی سے بائن ہو جائے گی ، دوسری اور تیسری واقع نہ ہوگی جیسا کہ یہ کہے : "أنت طالق" ۔ طالق ۔ طالق (تو صرف پہلے طالق سے طلاق واقع ہوگی) کیونکہ ہر لفظ (طالق) کا الگ ایقاع ہوتا ہے بشرطیکہ آخر

کلام میں کوئی ایسی چیز (عدد یا شرط وغیرہ) ذکر نہ کی جائے جو صدر کلام میں تغیر پیدا کر دے - حتی کہ کلام کا پہلا حصہ آخر کلام پر موقوف ہو جائے گا (اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے) -

چنانچہ پہلی طلاق اس وقت واقع ہو جائے کی اور دوسری طلاق عورت پر اس وقت پہنچے گی جب کہ وہ پہلی ہی سے بائن ہو چکی ہے (لہذا لغو ہوگی)

اسی طرح اگر مرد غیر مدخولہ عورت سے یہ کہے : "أنت طالق واحدة وواحدة" (تجھے ایک اور ایک طلاق ہے) تو صرف ایک طلاق واقع ہوگی - جیسا کہ ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ عورت پہلی طلاق ہی سے بائنہ ہو جائے گی -

مسئلہ : اگر مرد کہے : "أنت طالق واحدة" (عورت مدخولہ ہو یا غیر مدخولہ) اگر وہ واحدة کے لفظ کی ادائیگی سے پہلے ہی مر گئی تو طلاق باطل ہو جائے گی کیونکہ مرد نے وصف طلاق کو عدد سے جوڑا ہے لہذا واقع ہونے والا عدد ہوگا - مگر جب ذکر عدد سے پہلے عورت مر گئی تو ایقاع طلاق سے پہلے محلیة طلاق جاتی رہی - لہذا طلاق باطل ہوگئی -

اسی طرح اگر مرد کہے "أنت طالق ثنتين أو ثلاثا" کہ تجھے دو یا تین طلاقیں ہیں (تو بھی طلاق واقع نہ ہوگی) جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں - یہ صورت بھی ما قبل کی صورت سے معنوی لحاظ سے مشابہ ہے -

مسئلہ : اگر مرد نے غیر مدخولہ عورت سے کہا : "أنت طالق واحدة قبل واحدة أو بعدها واحدة" (تجھے ایک طلاق سے پہلے ایک طلاق ہے یا ایک طلاق کے بعد ایک طلاق ہے) تو ایک واقع ہوگی ۔ اس میں اصول یہ ہے کہ جب دو چیزوں کا ذکر کیا جائے اور ان کے درمیان کلمۂ ظرف ہو ، اگر اسے ھاء کنایہ کے ساتھ ملایا جائے تو کلمۂ ظرف اس کی صفت بنتا ہے جو آخر میں ذکر کیا جائے۔ جیسے جاءنی زید قبله عمرو (یعنی عمرو زید سے پہلے آ چکا تھا) اگر ظرف کے ساتھ ھاء کنایہ کا تذکرہ نہ ہو تو کلمۂ ظرف مذکور اول کی صفت بنتا ہے ۔ جیسے جاءنی زید قبل عمرو (یعنی زید عمرو سے پہلے آیا) طلاق کا ماضی میں واقع ہونا اس کا حال میں واقع ہونا مانا جائے گا ۔ کیونکہ ماضی کی طرف منسوب کرنا اس کی وسعت ہی میں نہیں (یعنی جب قبلها واحدة کہا تو ایک تو پہلے ماضی میں واقع ہوتی ہے مگر وہ طلاق کی بات چیت زمانۂ حال میں کر رہا ہے لیکن یہ ممکن نہیں کیونکہ حالیہ کلام کا ایقاع ماضی میں کرنا اس کی وسعت سے باہر ہے) تو قبل واحدة کی صورت میں کلمۂ قبل پہلے کی صفت بنے گا ۔ لہذا طلاق ثانیہ واقع نہ ہوگی اور "بعدها واحدة" میں بعدیة دوسری کی صفت بنے گی تو ابانة پہلی سے ہوگی (لہذا ثانی لغو ہو جائے گی)

مسئلہ : اگر مرد کہے "أنت طالق واحدة قبلها واحدة" (تجھے ایک طلاق ہے جس کے پہلے بھی ایک طلاق ہے)

تو دو واقع ہوں گی کیونکہ قبلیة دوسرے واحد کی صفت بنے گی اس لیے کہ ظرف حرف کنایہ سے متصل ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ طلاق ثانی ماضی میں واقع ہو اور پہلی اسی وقت ۔ اور طلاق کا ماضی میں واقع ہونا گویا حال میں واقع ہونا مسلم ہے تو دونوں اکھٹی ہو جائیں گی اور دونوں واقع ہو جائیں گی ۔

اسی طرح اگر مرد کہے "أنت طالق واحدة بعد واحدة (تجھے ایک طلاق کے بعد ایک اور طلاق ہے) تو دو واقع ہوں گی کیونکہ کلمۂ "مع" پہلے کلمۂ "واحدة" کی صفت ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ پہلی تو اسی وقت واقع ہو جائے گی اور دوسری اس سے پہلے ۔ پس دونوں اکھٹی ہو جائیں گی ۔

مسئلہ : اگر مرد کہے : "أنت طالق واحدة مع واحدة أو معها واحدة" (تجھے ایک کے ساتھ ایک طلاق ہے ۔ یا تجھے ایک طلاق ہے جس کے ساتھ ایک ہے) تو دو واقع ہوں گی کیونکہ کلمۂ "مع" دونوں کے اقتران کو ظاہر کرتا ہے ۔

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک "معها واحدة" کی صورت میں ایک ہی واقع ہوگی کیونکہ ھا ضمیر مرجع کو چاہے گی (اور مرجع پہلے ہے تو دونوں میں قران نہ رہا بلکہ دونوں الگ ہوگئیں ، لہذا صرف پہلی واقع ہوگی) ۔

مسئلہ : مذکورہ تمام صورتوں میں مدخولہ عورت پر دو طلاقیں واقع ہوتی ہیں کیونکہ پہلی کے وقوع کے بعد دوسری کی محلیۃ باقی رہتی ہے (اس لیے کہ مدخولہ پر عدت واجب ہوتی ہے اس لیے محلیت موجود رہتی ہے) ۔

مسئلہ : اگر مرد نے غیر مدخولہ عورت سے کہا : "إن دخلت الدار فأنت طالق واحدۃ وواحدۃ" (اگر تو گھر میں داخل ہوئی تو تجھے ایک اور ایک طلاق ہے) عورت گھر میں داخل ہوگئی تو امام اعظمؒ کے نزدیک ایک طلاق واقع ہوگی ۔ صاحبینؒ دو کے وقوع کے قائل ہیں ۔

اگر مرد نے عورت سے کہا : أنت طالق واحدۃ وواحدۃ إن دخلت الدار (تجھے ایک اور ایک طلاق ہے بشرطیکہ تو گھر میں داخل ہو) اس صورت میں اگر عورت گھر میں داخل ہوئی تو سب کے نزدیک دو واقع ہوں گی ۔

پہلی صورت میں صاحبینؒ کی دلیل یہ ہے کہ واؤ مطلق جمع کے لیے استعمال ہوتی ہے (اس میں ثم وغیرہ کی طرح ترتیب کا خیال نہیں رکھا جاتا) تو دونوں اکھٹی واقع ہوں گی جیسا کہ دو پر نص کر دے (یعنی أنت طالق ثنتین کہہ دے) یا شرط کو مؤخر کر دے ۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جمع مطلق میں قران اور ترتیب کا احتمال بھی ہوتا ہے تو اعتبار اول کے لحاظ سے دو واقع ہوں گی ۔ مگر اعتبار ثانی (ترتیب) کے لحاظ سے صرف ایک ہی واقع ہوگی جیسا کہ اگر شرط کا ذکر ہی نہ

کرے اور صرف "أنت طالق واحدة وواحدة کہہ دے تو آپ بھی کہتے ہیں کہ شک کی بناء پر ایک سے زیادہ واقع نہ ہوں گی (ملاحظہ فرمائیے یہاں واؤ قران و ترتیب کے لیے ہے کیونکہ کہا جاتا ہے کہ جب پہلی سے بائن ہوگئی تو دوسری کی کیا ضرورت ہے) ۔ بخلاف اس صورت کے جب شرط کو مؤخر کر دے کیونکہ مؤخر شرط سے صدر کلام میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے اور پہلا کلام شرط پر موقوف ہے لہذا اکھٹی واقع ہوں گی ۔ لیکن جب شرط پہلے ہو تو صدر کلام میں تغیر نہیں آتا اور توقف کا سوال پیدا نہیں ہوتا ۔

اگر حرف فاسے عطف کیا جائے (اور کہے إن دخلت الدار فانت طالق واحدة فواحدة) تو امام کرخی کے قول کے مطابق اسی طرح اختلاف ہے مگر فقیہ ابو اللیث نے ذکر کیا ہے کہ بالاتفاق ایک طلاق واقع ہوگی کیونکہ فاء تعقیب کے لیے ہوتی ہے اور یہی قول زیادہ صحیح ہے ۔

کنایات : طلاق کی دوسری قسم کنایات ہے ۔ کنایات سے طلاق ، نیت یا دلالت حال سے واقع ہوتی ہے ۔ کیونکہ الفاظ کنایہ طلاق کے لیے موضوع نہیں ہوتے بلکہ ان میں طلاق کا احتمال ہوتا ہے اور دوسرا بھی ۔ لہذا نیت یا دلالت حال سے تعیین ضروری ہوگی ۔

امام قدوری فرماتے ہیں کہ کنایات کی دو قسمیں ہیں (۱) ان میں سے تین لفظ ایسے ہیں جن سے طلاق رجعی واقع

ہوتی ہے اور وہ بھی صرف ایک ۔ اور یہ الفاظ ہیں اعتدی (تو عدت گزار یا شمار کر) استبرءی رحمك (تو اپنے رحم کا استبراء کر) اور أنت واحدة (تو ایک ہے)

پہلی صورت میں اس لیے کہ اعتدی کا مطلب اعتداد عن النکاح بھی ہو سکتا ہے اور اللہ تعالی کی نعمتوں کا شمار کرنا بھی مراد لیا جا سکتا ہے ۔ اگر اول الذکر معنے کی نیت کرے تو یہ معنی نیت سے متعین ہو جائے گا۔ مگر یہ عبارت سابقاً طلاق کا تقاضا کرتی ہے (مرد نے گویا اس طرح کہا : کونی طالقاً ثم اعتدی کہ پہلے تجھے طلاق ہے پھر عدت گزار) اس طلاق کے بعد رجعت ہو سکتی ہے ۔

دوسری صورت میں اس طرح کہ استبرئی رحمك کے الفاظ بھی اعتداد کے لیے استعمال ہوتے ہیں کیونکہ عدت سے جو (استبراء) مقصود ہوتا ہے اس کلام میں اس کی تصریح موجود ہے تو یہ الفاظ بھی بمنزلہ اعتدی کے ہوگئے اور یہ احتمال بھی ہے کہ ان الفاظ سے مطلقاً استبراء مقصود ہو تاکہ اسے طلاق دے سکے (تو نیت ہی سے طلاق والا معنی متعین ہوگا) ۔

رہی تیسری صورت تو اس میں احتمال ہے کہ واحدة مصدر محذوف کی صفت ہو اور أنت واحدة کی یہ صورت ہوگی کہ أنت تطلیقة واحدة پس مرد جب طلاق کی نیت کرے گا تو گویا اس نے أنت تطلیقة واحدة کہا اور ایسی طلاق کے بعد رجعت ہو سکتی ہے ۔ اس میں دوسرا احتمال یہ ہو

سکتا ہے کہ وہ اپنے خاوند کے نزدیک یا اپنی قوم میں یکتا ہے۔

اور چونکہ ان تینوں قسم کے الفاظ میں طلاق اور عدم طلاق دونوں کا احتمال ہے لہذا طلاق کے سلسلے میں نیت کرنا ضروری ہوگا ، اور ایک ہی واقع ہوگی۔ کیونکہ پہلی دونوں صورتوں میں أنت طالق مقتضی کے طور پر اور تیسری میں مضمر صورت میں موجود ہے اس لیے کہ اگر أنت طالق ظاہر کرکے کہے تو بھی ایک ہی واقع ہوتی ہے اور جب مضمر ہو تو بدرجۂ اولی ایک ہی ہوگی۔

سوال : تیسری صورت میں آپ مصدر محذوف تسلیم کرتے ہیں تو پھر تین بھی واقع ہو سکتی ہیں۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ بعد میں واحدۃ موجود ہے جو کہ نیت ثلاثا کے منافی ہے۔

بعض نے کہا کہ واحدۃٌ کہنے سے طلاق نہ ہوگی بلکہ واحدۃ کہنے سے ہوگی اور واحدۃ کنایہ ہوگا ، مگر عام مشائخ کے نزدیک اعراب کا کوئی اعتبار نہیں اور یہی صحیح مانا گیا ہے کیونکہ عوام اعراب کی اقسام کی کوئی تمیز نہیں رکھتے۔

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے کہ باقی کنایات میں اگر طلاق کی نیت کی جائے تو ایک بائنہ واقع ہوگی۔ اگر تین کی نیت کرے تو تین اور دو کی نیت کرے تو بھی ایک بائنہ واقع ہوگی۔ کنایہ کے الفاظ کی مثالیں یہ ہیں : أنت

بائن (تو بائن ہے) وبتة وبتلة (دونوں بمعنی قطع ہے یعنی تو مقطوع ہے و حرام (اور حرام ہے) وحبلك علی غاربك (تیری رسی تیری گردن پر ہے) والحقی بأهلك (اپنے اہل کے پاس چلی جا و خلیة و بریئة (تو خالی ہے تو بری ہے) و وهبتك لأهلك (میں نے تجھے تیرے اہل کو بخش دیا) وسرحتك (میں نے تجھے چھوڑ دیا) وفارقتك (میں تجھ سے جدا ہوگیا) وأمرك بیدك (تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے) واختاری (تو اپنے آپ کو اختیار کرلے) وأنت حرة (تو آزاد ہے) وتقنعی (اپنا دوپٹہ اوڑھ لے) وتخمری (اپنی اوڑھنی لے لے) واستبرئی (استبراء کر) واغربی (دور ہو جا) آخرجی (نکل جا) واذهبی (چلی جا) وقومی (اٹھ کھڑی ہو) وابتغی الأزواج (اور خاوند تلاش کر لے) ان الفاظ میں طلاق اور عدم طلاق دونوں کا احتمال ہے ۔ لہذا نیت ضروری ہوگی ۔

البتہ اگر طلاق کا ذکر ہو رہا ہو اور مرد مذکورہ الفاظ میں سے کوئی لفظ استعمال کرے تو قضاء طلاق ہو جائے گی لیکن دیانة واقع نہ ہوگی سوائے اس صورت کے جب کہ وہ خود نیت کرے ۔

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ قدوریؒ نے مذکورہ تمام الفاظ کو برابر تسلیم کیا ہے (جب کہ حالت مذاکرۂ طلاق کی ہو) حالانکہ یہ ان الفاظ میں جائز ہے جو احتمال رد نہ رکھتے ہوں ۔

اس سلسلے میں قانون یہ ہے کہ احوال تین قسم کے

ہوتے ہیں (۱) حالت مطلقہ یعنی حالت رضا ۔ (۲) حالت مذاکرۂ طلاق ۔ (۳) حالت غضب و غصہ ۔

کنایات کی بھی تین قسمیں ہیں (۱) جو جواب و رد دونوں کی صلاحیت رکھتے ہیں (۲) جن میں جواب بننے کی صلاحیت تو ہو مگر رد کی نہ ہو (۳) جو جواب بھی بن سکتے ہیں اور سب و شتم بھی ۔

حالت رضا میں نیت کے بغیر کسی لفظ سے بھی طلاق واقع نہ ہوگی اور انکار نیت کی صورت میں مرد کی بات تسلیم کی جائے گی جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں (کیونکہ ان الفاظ میں طلاق اور عدم طلاق دونوں کا احتمال ہے لہذا مرد کی نیت پر دار و مدار ہوگا ۔

حالت مذاکرۂ طلاق میں ان الفاظ میں جو جواب کی صلاحیت تو رکھتے ہیں لیکن رد کی نہیں ۔ مرد کی تصدیق نہیں کی جائے گی (کہ میں نے طلاق کی نیت نہیں کی تھی) ۔ مثلاً خلیہ ، بریہ ، بائن ، بتہ ، حرام ، اعتدی ، أمرك بیدك اور اختاری کیونکہ ظاہراً ان سے مراد طلاق ہے جب کہ مسئلۂ طلاق در پیش ہو ۔

جو الفاظ جواب اور رد دونوں کی صلاحیت رکھتے ہیں ان میں مرد کی تصدیق کی جا سکتی ہے (کہ اس نے طلاق کی نیت نہ کی ہوگی) مثلاً اذهبی ، اخرجی ، قومی ، تقنعی، تخمری اور جو ان کے قائم مقام ہوں اغربی ، استتری (چھپ جا) وغیرہ کیونکہ ان میں رد طلاق کا احتمال بھی ہے اور اس احتمال کو

ملحوظ رکھنا زیادہ مناسب ہے لہذا اسی پر معمول کیا جائے گا۔

حالت غضب میں ان تمام الفاظ میں مرد کی تصدیق کی جائے گی کیونکہ رد کرنے اور گالی دینے کا احتمال موجود ہے مگر وہ الفاظ کہ جن میں صرف طلاق کی صلاحیت ہے رد اور سب و شتم کی نہیں۔ مثلاً اعتدی ، اختاری اور أمرك بیدك ان میں مرد کی تصدیق نہیں کی جائے گی کیونکہ حالت غیظ و غضب ہی ارادۂ طلاق پر دلالت کرتی ہے۔

امام ابو یوسف؆ فرماتے ہیں کہ لا ملك لی علیك (تجھ پر میری کوئی ملکیت نہیں) خلیت سبیلك (میں نے تیرا رستہ خالی کر دیا ہے) اور فارقتك (میں نے تجھ سے جدائی اختیار کرلی ہے) وغیرہ میں غضب کی حالت میں مرد کی بات مانی جائے گی کیونکہ ان الفاظ میں گالی گلوچ کے معنی کا احتمال ہے۔

(متن میں ذکر کردہ) پہلے تین کے علاوہ بائن طلاق کا واقع ہونا احناف کے نزدیک مسلم ہے۔ امام شافعی؆ فرماتے ہیں کہ ان سے طلاق رجعی واقع ہوگی کیونکہ مذکورہ الفاظ (طلاق کے لیے موضوع نہیں ہیں بلکہ) ان میں طلاق کا کنایہ موجود ہے اور اسی لیے نیت کرنا شرط ہے اور اس سے عدد کو کم کیا جا سکتا ہے اور ایسی طلاق کے لیے اسی طرح رجوع ہو سکتا ہے۔ جیسے صریح کی صورت میں ہوتا ہے۔ (امام شافعی؆ فرماتے ہیں : ان الفاظ سے طلاق مراد لی جاتی ہے جب ط ل ق سے طلاق دی جائے تو رجعی واقع ہوتی ہے ہاں اگر ان کے اصلی معنوں میں طلاق کا مفہوم ہوتا تو بائن

ہو سکتی تھی ۔ مگر آپ ان کے اصلی معنی نہیں لے سکتے ۔ کیونکہ (۱) اگر ان کے اپنے معنی لیں اور ان ہی سے طلاق ثابت ہو تو پھر یہ الفاظ کنایہ نہ ہوں گے ۔ (۲) اگر ان کے حقیقی معنی لیے جائیں تو یہ صریح ہوں گے اور پھر نیت کی کوئی ضرورت نہ ہوگی ۔ (۳) اور اگر ان کے اپنے معنی لیے جاتے تو پھر طلاق کا عدد کم نہ ہوتا کیونکہ مرد تین طلاقوں کا مالک ہوتا ہے مگر ایک طلاق کنایہ دینے کے بعد اگر رجوع کرے گا تو دو کا مالک ہوگا ۔ لہذا ثابت ہوا کہ ان سے مراد طلاق ہے اور ط ل ق سے رجعی واقع ہوتی ہے) ۔

احناف اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ فرقت میں تصرف اس شخص کی طرف سے ہوا ہے جو اس کا اہل ہے (کیونکہ وہ خاوند ہے اور عاقل و بالغ ہے اور اس میں طلاق دینے کی اہلیت بھی ہے) نیز فرقت کی نسبت بھی اس طرف ہوئی ہے جو محل طلاق ہے (کیونکہ وہ اس کی منکوحہ ہے) اور شریعت مرد کو بائن طلاق دینے کی ولایت بھی دیتی ہے (جو نکاح سے موجود ہوتی ہے) تو مذکورہ صورتوں میں اہلیت ، محلیت اور ولایت میں کوئی خفاء نہیں اور ولایت (ابانت) کو ثابت کرنے کی ضرورت بھی ہے تاکہ اس کا تدارک ہمیشہ کے لیے مسدود ہو کر نہ رہ جائے اور عورت کی موجودگی میں بلاقصد مراجعت نہ ہو جائے اور پھر عورت کی ذمہ داری اس پر آپڑے (کیونکہ مرد اگر اپنی بیوی سے پورے طور پر دل برداشتہ

ہو چکا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ میں اسے ایسی طلاق دوں جس سے میری گلو خلاصی ہو جائے اور بغیر ضرورت رجوع بھی نہ کر سکوں ـ لیکن اگر عورت اس طلاق سے متأثر ہو کر اپنی اصلاح کر لے اور میں اسے دوبارہ بسانا چاہوں تو حلالے وغیرہ کا چکر بھی در پیش نہ آئے لہذا اب آپ ہی بتائیں کہ اس قسم کی ضرورت طلاق رجعی سے پوری ہو سکتی ہے یا بائن سے کیونکہ نفرت مستقل ہو چکی ہے لہذا عارضی رجعت بالآخر تین طلاق پر منتج ہوگی اور وہ مغلظہ ہو جائے گی) ۔

کنایات طلاق حقیقی نہیں ہوتے (جیسا کہ امام شافعیؒ کا خیال ہے) کیونکہ یہ کنایات اپنے حقیقی معنوں میں بھی استعمال ہوتے ہیں (جب یہ کنایات مجازی ہوئے تو حقیقتاً کنایہ عن الطلاق نہ ہوں گے کہ ط ل ق کا مادہ ثابت ہو جائے اور ایک رجعی واقع ہو ـ چونکہ یہ الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں بھی استعمال ہوتے ہیں اس لیے جب انہیں طلاق کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو نیت شرط قرار دی جاتی ہے) ـ

(آپ نے نیت والی جو دلیل دی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ بینونۃ دو قسم کی ہے یعنی نکاح سے بائن یا کسی اور چیز سے جیسے نیکی وغیرہ) تو نیت کو اس لیے شرط قرار دیا جاتا ہے کہ بینونۃ کی دو قسموں میں سے ایک قسم کا تعین ہو جائے (یعنی بائن عن النکاح والی قسم کا) اس سے یہ مقصد ہرگز نہیں ہوتا کہ نیت طلاق کے لیے شرط ہوتی ہے (بلکہ

یہ تو بینونۃ کی ایک نوع متعین کرنے کے لیے شرط ہوتی ہے)۔

عدد اس لیے کم ہوتا ہے کہ ملاپ (یعنی بتہ و بائن وغیرہ کہنے سے) کو توڑ دینے سے طلاق کا ثبوت ہو جاتا ہے نہ یہ کہ ہم یہ الفاظ بول کر مراد طلاق لے رہے ہیں)۔ تین کی نیت اس لیے درست ہے کہ بینونۃ کی دو قسمیں ہیں: خفیفہ و غلیظہ اور عدم نیت کے وقت بینونت خفیفہ ثابۃ ہوگی (اور اگر غلیظہ کی نیت کر لے تو اس کا ثبوت نیت کی بناء پر ہو جائے گا)۔

مسئلہ : ہمارے نزدیک دو کی نیت کرنا درست نہیں بخلاف امام زفرؒ کے ، کیونکہ دو عدد ہے (وحدۃ نوعی اور وحدۃ شخصی نہیں) اس پر تفصیلی بحث پہلے گزر چکی ہے۔

مسئلہ : اگر مرد نے عورت سے کہا : اعتدی (تو عدت گزار) اعتدی ، اعتدی اور کہا کہ پہلے لفظ سے میری مراد طلاق تھی اور باقی دو سے حیض تو عدالت میں اس کی بات کو تسلیم کیا جائے گا کیونکہ اس نے حقیقت کلام کی نیت کی ہے اور چونکہ انسان اپنی بیوی کو طلاق کے بعد عدت ہی کا حکم دیتا ہے لہذا ظاہری صورت حال بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔

مسئلہ : اگر مرد کہے کہ باقی دو الفاظ سے میں نے کچھ نیت نہیں کی تو یہ تین طلاقیں شمار ہوں گی کیونکہ

جب اس نے پہلے لفظ سے طلاق کی نیت کی تو یہ مذاکرہ طلاق والی حالت ہوگئی پھر باقی دو الفاظ کا بھی اسی دلالت سے طلاق کے لیے تعین ہو جائے گا۔ لہذا نفی نیت میں اس کی تصدیق نہ کریں گے۔

ہاں اگر مرد کہے کہ میں نے کسی لفظ سے بھی طلاق کی نیت نہیں کی تو کچھ نہ ہوگا کیونکہ ظاہری صورت حال بھی اس کی تکذیب نہیں کرتی۔

اگر مرد کہے کہ میں نے پہلے دو الفاظ سے طلاق کی نیت نہیں کی، بلکہ تیسرے لفظ سے کی تھی تو ایک واقع ہوگی کیونکہ پہلے دو الفاظ کے وقت حالت مذاکرۂ طلاق نہ تھی۔

مذکورہ تمام صورتوں میں نفی نیت کے بارے میں مرد سے قسم لے کر اس کی تصدیق کی جائے گی کیونکہ وہ اپنے دل کی بات کی خبر دینے میں امین ہے اور ہمیشہ امین کی بات ہی تسلیم کی جاتی ہے مگر اس سے قسم لی جاتی ہے۔

باب تفویض الطلاق

# تفویض طلاق کا بیان

## اختیار کا بیان

مسئلہ : جب مرد نے عورت سے کہا : اختاری (تجھے اختیار ہے) اور اس سے طلاق کی نیت کی یا مرد نے کہا : طلقی نفسك (تو چاہے تو اپنے آپ کو طلاق دے دے) تو عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب تک اس مجلس میں رہے اپنے آپ کو طلاق دے سکتی ہے۔ لیکن اگر مجلس سے اٹھ جائے یا کسی دوسرے کام میں مصروف ہو جائے تو اختیار اس کے ہاتھ سے جاتا رہے گا کیونکہ باجماع صحابہ رض اس کا اختیار اسی مجلس تک محدود ہوتا ہے اور تفویض چونکہ عورت کو مالکہ بناتی ہے اور اس مالک بنانے کے جواب کا تقاضا اسی مجلس میں ہوتا ہے جیسا کہ بیع میں ہوتا ہے کیونکہ مجلس کی ساعات بمنزلۂ ساعۃ واحدہ شمار ہوتی ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ مجلس کبھی تو چلے جانے سے بدل جاتی ہے اور کبھی دوسرے کام میں مشغول ہونے سے، کیونکہ مجلس خورد و نوش مجلس مناظرہ سے الگ ہوتی ہے اور اسی طرح مجلس قتال ان دونوں سے علیحدہ۔

مسئلہ : عورت کا خیار محض قیام سے باطل ہو جانے کا کیونکہ مجلس سے کھڑا ہونا گویا انحراف کی علامت ہے۔ بخلاف بیع صرف اور سلم کے ، کیونکہ ان میں بغیر قبضہ سے چلے جانا مفسد ہے۔

''اختاری'' وغیرہ الفاظ میں نیت طلاق بھی ضروری ہے کیونکہ صرف لفظ اختیار سے طلاق بھی مراد ہو سکتی ہے اور کسی دوسرے تصرف کا اختیار بھی مراد ہو سکتا ہے۔

مسئلہ : اگر ''اختاری'' کے جواب میں عورت نے کہا ''اخترت'' یعنی میں نے اختیار کر لیا تو ایک بائن طلاق واقع ہوگی ۔ قرین قیاس تو یہ تھا کہ ان الفاظ سے کچھ بھی واقع نہ ہو ۔ اگرچہ خاوند نیت طلاق بھی کرے کیونکہ (أنت طالق کی طرح) خاوند ان الفاظ سے طلاق واقع نہیں کر سکتا تو ان الفاظ سے دوسرے کو کس طرح مالک طلاق بنا سکتا ہے ۔ مگر ہم نے قیاس کو چھوڑتے ہوئے استحسان کو اختیار کیا ہے ۔ کیونکہ صحابۂ کرام رض کا اجماع بھی اسی پر ہے ۔ نیز مرد کو یہ حق حاصل ہے کہ اسے نکاح میں باقی رکھے یا اسے چھوڑ دے ۔ لہذا وہ اسے اس حکم یعنی نکاح کو باقی رکھنے یا ترک کرنے کی مالکہ بنا سکتا ہے ۔ نیز اس سے بائن طلاق واقع ہوگی کیونکہ عورت کے اختیار نفس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کو اس طرح اختیار کرے کہ اس اختیار کو اپنے ساتھ مختص کرے اور

یہ بات (رجعی طلاق سے نہیں) بائن سے ہو سکتی ہے۔ (اختصاص نفس کا مطلب یہ ہے کہ مرد کا عورت پر پھر اختیار نہ رہے)۔

اس صورت میں اگر زوج تین کی نیت بھی کرے تو تین واقع نہ ہوں گی کیونکہ اختیار میں تنوع نہیں ہوتا۔ بخلاف ابانت کے، کیونکہ اس میں خفیفہ و غلیظہ ہونے کا تنوع ہو سکتا ہے۔

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ مرد یا عورت کے کلام میں نفس کا لفظ ضرور ہو حتی کہ اگر مرد نے کہا "اختاری" اور عورت نے کہا "اخترت" تو ایسا کہنا باطل ہوگا کیونکہ یہ معروف ہے اور اجماع سے ثابت ہے اور اجماع بھی ایک جانب میں نفس کے لفظ کی تفسیر چاہتا ہے۔ نیز مبہم مبہم کی تفسیر نہیں ہو سکتا اور ابہام کے ہوتے ہوئے تعیین ممکن نہیں۔

مسئلہ : اگر مرد نے عورت سے کہا : اختاری نفسک (تجھے اپنے نفس کا اختیار ہے) اور عورت نے جواب میں کہا : اخترت تو ایک بائن طلاق واقع ہو جائے گی کیونکہ مرد کا کلام (لفظ نفس کے ساتھ) مفسر ہے اور عورت کا کلام اس کے جواب میں صادر ہوا ہے۔ پس وہ مرد کے کلام کے اعادہ کو متضمن ہوگا (گویا عورت نے یوں کہا : اخترت ما امرتنی باختیارہ)

اسی طرح اگر مرد کہے اختاری اختیارۃ اور عورت کہے اخترت کیونکہ اختیارۃ کی "ھا" اتحاد و انفراد کی خبر دیتی ہے (یعنی یہ اختیار نفس ہی میں ہوگا دوسرے کاموں میں نہیں ہوگا) عورت کا اپنے نفس کو اختیار کرنا کبھی ایک بار ہوتا ہے اور کبھی متعدد بار (مثلاً مرد کہے کہ تجھے ہمیشہ اختیار ہے تو اس صورت میں جب بھی ایک طلاق کے بعد نکاح کرے گا عورت کو اختیار ہوگا) اس لیے یہ کلام بھی مرد کی طرف سے مفسر ہوگا۔

مسئلہ : اگر مرد اختاری کہے اور عورت جواب میں "اخترت نفسی" کہے۔ اگر مرد نے طلاق کی نیت کی ہے تو طلاق بائن واقع ہو جائے گی، کیونکہ عورت کا کلام مفسر ہے اور مرد نے جس کی نیت کی ہے اس کے کلام میں اس کا احتمال موجود ہے۔ (اس سے وہ طلاق کی نیت بھی کر سکتا ہے اور کسی دوسری چیز کی بھی جب ثابت ہوگیا کہ طلاق کی نیت بھی محتملات کلام سے ہے تو مرد کی جانب بھی نفس کا لفظ ثابت ہوگیا کہ گویا مرد نے بھی اختاری نفسك کہا تھا)۔

مسئلہ : اگر مرد نے کہا اختاری اور عورت نے جواب میں أنا اختار نفسی (میں اپنے نفس کو اختیار کرتی ہوں) کہا، تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ قیاس تو یہ چاہتا ہے کہ طلاق واقع نہ ہو کیونکہ (اختار بمعنی مستقبل) محض وعدہ بن جاتا ہے یا (بصورت معنی حال) اس کا احتمال رکھتا ہے تو

یہ صورت اس طرح ہوگئی طلقی نفسك (تو اپنے نفس کو طلاق دے سکتی ہے) اور عورت نے کہا أنا أطلق نفسی (یہ مسلم ہے کہ اس صورت میں طلاق نہ ہوگی) لیکن یہاں استحسان کی وجہ حضرت عائشہؓ کا قول ہے لا بل اختار الله ورسوله (نہیں بلکہ میں تو الله تعالی اور اس کے رسول ﷺ کو اختیار کرتی ہوں) تو حضور ﷺ نے اس جواب کو معتبر مانا تھا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ "اختار" کلمۂ شہادة اور دوسری گواہیوں کی طرح حقیقة حال کے معنی دیتا ہے اور مجازاً مستقبل کے۔ (کیونکہ وہاں بھی أشهد مضارع کا صیغہ استعمال کرکے حال کے معنی لیے جاتے ہیں) بخلاف أطلق نفسی کے اسے حال پر محمول نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی موجود حالت کا بیان نہیں ہے۔ بخلاف ایسی صورت کے جب کہ عورت کہے أنا أختار نفسی کیونکہ وہ حالت کا بیان ہو سکتا ہے اور وہ اس کا اپنے نفس کو اختیار کرنا ہے (یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اختار افعال قلوب سے ہے یعنی جب عورت کو اختیار دیا جاتا ہے تو پہلے اپنے دل میں اختیار کو قبول کرتی ہے اور پھر زبان سے اخترت کہتی ہے تو فعل قلب محکی عنہ اور فعل لسان حکایت ہوگا۔ مگر طلاق دینا یا لینا فعل لسانی ہے اس لیے کسی چیز کی حکایت اور بیان نہ ہوگا بلکہ مضارع کا صیغہ محض وعدہ ہوگا لہذا طلاق واقع نہ ہوگی)۔

مسئلہ : اگر مرد عورت سے کہے اختاری ، اختاری ، اختاری ، عورت جواب دے کہ میں نے پہلا ، درمیانہ اور آخری اختیار قبول کر لیا تو امام اعظمؒ کے نزدیک تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی اور مرد کے نیت کرنے کی حاجت نہ ہوگی مگر صاحبینؒ کے نزدیک اس سے ایک طلاق واقع ہوگی ۔ تاہم خاوند کا نیت کرنا ضروری نہیں ۔ کیونکہ تکرار اس امر طلاق پر دلالت کر رہا ہے اور اختیار کا تکرار صرف حق طلاق ہی میں ہو سکتا ہے (دوسرے کاموں میں نہیں) ۔

صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ پہلی طلاق اور اس کی قائم مقام طلاقوں کا ذکر اگرچہ ترتیب کا فائدہ نہیں دیتا لیکن مفرد معنوں کا فائدہ ضرور دیتا ہے ۔ لہذا جو فائدہ دے رہا ہے اسی کا اعتبار ہوگا ۔ (عورت کے اخترت الاولی کہنے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے ایک طلاق اختیار کرلی ۔ جب ایک بائن واقع ہوگئی تو دوسری اور تیسری واقع نہ ہوگی ، کیونکہ یہ عورت ایک ہی سے بائنہ ہوگئی اور باقی دو کا محل نہ رہی) (یعنی اولی ، وسطی اور آخرہ میں سے ہر ایک کی دو صفات ہیں ۔ اولی میں ایک تو اولیت ہے اور دوسری انفرادیت یعنی ایک طلاق ۔ وسطی میں ایک تو وسطیت ہےاور دوسری انفرادیت ۔ اسی طرح آخرہ میں آخریت اور انفرادیت دو صفات ہیں ۔ مگر زوجہ نے چونکہ مجموعی طور پر اختیار کی ہیں لہذا ترتیب نہ رہی اور اولیت ، وسطیت اور آخریت

والا وصف جاتا رہا ۔ صرف انفراد والی صورت باقی رہ گئی اس لیے ایک ہی واقع ہوگی) ۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ یہ وصف ہی لغو ہے کیونکہ جو شے ملک میں مجتمع طور پر آئے اس میں ترتیب نہیں ہوتی ۔ مثلاً تین چار آدمی اگر ایک مکان میں اکھٹے بیٹھے ہوں تو ان میں ترتیب ضروری نہیں ہوتی اور کلام میں ترتیب کا لحاظ ہوتا ہے اور مفرد ہونا اس کی ضروریات سے ہے ۔ لہٰذا جب کلام اصل کے لحاظ سے لغو ہوگیا تو اس امر کے حق میں بھی لغو ہوگا جو اس پر مبنی ہے (یعنی اپنے نافذ ہونے میں بھی لغو شمار ہوگا ۔ یعنی جب اصل لغو ہوا تو لوازم بھی لغو ہوں گے اور عورت کا کلام درست نہ رہے گا بلکہ لغو ہو جائے گا ۔ مگر مرد کا کلام صحیح رہے گا ۔ اس لیے عورت کے اختیار کرنے سے تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی) ۔

مسئلہ : اگر مذکورہ صورت کے جواب میں عورت اخترت اختارۃ کہے تو سب کے نزدیک تین واقع ہوں گی ۔ کیونکہ اختیارۃ برائے مرۃ استعمال ہوا ہے تو گویا عورت نے اس طرح کہا کہ میں نے تینوں کو یک بارگی اختیار کر لیا نیز اختیارۃ تاکید کے لیے ہے اور جب بغیر تاکید کے تین واقع ہوتی ہیں تو تاکید کے ساتھ بدرجۂ اولی تین واقع ہوں گی۔

مسئلہ : اگر عورت جواب میں کہے کہ میں نے اپنے آپ کو ایک طلاق دی یا اپنے آپ کو ایک طلاق کے ساتھ اختیار کیا تو ایک طلاق رجعی واقع ہوگی اور مرد رجوع کا مالک ہوگا کیونکہ لفظ کا تقاضا ہے کہ طلاق عدت کے گزرنے کے بعد واقع ہو تو گویا عورت نے اپنے نفس کو عدت کے بعد اختیار کیا ۔

مسئلہ : اگر مرد نے عورت سے کہا کہ طلاق دینے کا اختیار تیرے ہاتھ میں ہے یا تو طلاق کو اختیار کرسکتی ہے ۔ عورت نے اپنے نفس کو اختیار کر لیا تو ایک رجعی طلاق ہوگی ۔ کیونکہ مرد نے اسے اختیار تو ضرور دیا ہے لیکن صرف ایک طلاق کا ، لہذا اس کے بعد رجعت موجود ہوگی ۔

# فصل فی الأمر بالید

# اختیار دینے کا بیان

مسئلہ : اگر مرد نے تین طلاقوں کی نیت کرتے ہوئے عورت سے کہا : أمرك بیدك (تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے) عورت نے جواب میں کہا : اخترت نفسی بواحدة (میں نے اپنے لیے ایک اختیار کرلی) تو تین واقع ہوں گی - (اگر کہا جائے کہ مرد اور عورت کے کلام میں مطابقت نہیں ہے کیونکہ عورت کو جواب میں أمری بیدی کہنا تھا - مصنفؒ فرماتے ہیں کہ) اختیار (کا لفظ) بھی أمر بالید کا جواب ہو سکتا ہے - کیونکہ اختیار دینے کی طرح امر بالید سے بھی عورت کو مالک بنایا جا سکتا ہے (عورت کے کلام میں) واحدة اختیار کی صفت ہے گویا عورت نے اس طرح کہا : اخترت نفسی بمرة واحدة (میں نے اپنے نفس کو ایک بار ہی اختیار کر لیا) چنانچہ اس قول سے تین طلاقیں واقع ہوں گی -

مسئلہ : اگر عورت مذکورہ کلام کے جواب میں کہے قد طلقت نفسی بواحدة أور اخترت نفسی بتطلیقة (میں نے اپنے آپ کو ایک طلاق دی - یا میں نے ایک طلاق کو اپنے لیے

اختیار کیا) تو ایک بائن طلاق واقع ہوگی ۔ کیونکہ واحدہ، مصدر محذوف کی صفت ہے اور وہ پہلی صورت میں اختیار ہے، اور دوسری صورت (طلقت نفسی بواحدة) میں طلاق ، اور طلاق بھی بائن ہوگی ۔ کیونکہ بائن طلاق کی سپردگی ضرورت کی بناء پر ہے جب کہ خود مرد نے اسے اس امر کا مالک بنایا اور عورت کا قول اس کے جواب میں صادر ہوا ۔ چنانچہ، جو صفت تفویض میں مذکور ہوگی وہی طلاق واقع ہونے پر پائی جائے گی (لہذا مرد اور عورت کے کلام میں مطابقت موجود ہے) ۔

نیز أمرك بیدك میں تین کی نیت اس لیے درست ہے کہ امر بالید میں عموم (تین) اور خصوص (ایک) دونوں کا احتمال موجود ہے اور تین کی نیت تعمیم کی نیت ہے (جو درست ہے) بخلاف مرد کے قول "اختاری" کے کیونکہ اس میں عموم کا احتمال نہیں ۔ (اختیار قابل تقسیم نہیں ہوتا ۔ بخلاف بینونة کے کہ وہ خفیفہ و غلیظہ ہوتی رہتی ہے ۔ اس کی پوری تحقیق ہم پہلے بیان کر چکے ہیں) ۔

مسئلہ : اگر خاوند نے عورت سے کہا : أمرك بیدك الیوم وبعد غد (تجھے آج اور کل کے بعد اختیار ہے) تو اس میں رات شامل نہ ہوگی (کیونکہ وقت لگاتار نہیں ہے) ۔ اگر اس دن کا اختیار عورت نے رد کر دیا تو اس دن کا اختیار باطل ہو جائے گا اور بعد غد (یعنی پرسوں کا) اختیار عورت کے ہاتھ میں ہوگا کیونکہ مرد نے ایسے دو وقتوں کی تصریح

کی ہے جن کے بیچ میں ان کی جنس ہی کا وقت نہ ہے جس کو
أمر بالید شامل نہیں ۔ (یعنی آج اور پرسوں میں کل کا دن ہے
جو أمر بالید میں شامل نہیں ہے ۔ اب مصنفؒ فرماتے ہیں کہ
رات کیوں شامل نہ ہوگی) ۔ جب لفظ یوم کو منفرد طور
پر ذکر کیا جائے تو اس میں رات شامل نہیں ہوتی اس لیے
أمر الیوم اور أمر بعد الغد دونوں الگ الگ امر ہیں لہذا
ایک کے رد کرنے سے دوسرا رد نہیں ہوگا ۔

امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ تفویض کی دونوں صورتیں
دراصل ایک ہی أمر بالید ہیں ۔ جیسا کہ کوئی صریح طلاق
میں کہے : أنت طالق الیوم وبعد غد (تجھے آج اور پرسوں
طلاق ہے) ایسی صورت میں آپ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ
اسی دن طلاق واقع ہو جائے گی اور دو الگ الگ وقت نہیں
ہوں گے ۔

ہم کہتے ہیں کہ طلاق میں وقت مقرر کرنے کا احتمال
نہیں ہوتا (یعنی طلاق ایسی چیز نہیں ہے جو کسی وقت کے
تقرر کو قبول کر لے کیونکہ جو طلاق آج واقع ہوگی وہ
رات کو بھی اسی طرح واقع ہوگی اور پرسوں بھی) اور أمر
بالید میں یہ احتمال موجود ہے کہ آج کا اختیار الگ ہو اور
پرسوں کا الگ (تو أمر بالید پہلے وقت کے متعلق ہوگا یعنی
مرد نے دو وقت بیان کیے ہیں ۔ آج اور پرسوں تو اختیار
آج کے ساتھ مؤقت ہوگا) اور دوسرا وقت نئے سرے سے أمر
بالید قرار دیا جائے گا (یعنی پرسوں کا دن نیا امر بالید ہوگا۔

لہذا الیوم کا اختیار رد کر دینے سے بعد غد کا اختیار رد نہ ہوگا) ۔

مسئلہ : اگر مرد کہے أمرك بيدك اليوم وغداً (آج اور کل تجھے اختیار ہے) تو اس میں رات بھی شامل ہوگی ۔ اگر وہ اس دن (الیوم) کا اختیار رد کر دے تو دوسرے دن اس کے ہاتھ میں اختیار باقی نہ رہے گا کیونکہ یہ (اختیار) امر واحد ہے اور دونوں مذکور وقتوں کے درمیان ان کی جنس کا کوئی ایسا وقت مخل نہیں جس کو أمر باليد کا قول شامل نہ ہوا ہو (آج اور کل میں صرف رات شامل ہے مگر وہ اجازت ہی میں داخل ہے کیونکہ) کاہے مجلس مشورت ختم نہیں ہوتی اور رات آ جاتی ہے (تو شمول لیل کلام کا مقتضیٰ ہی ہے ۔ گویا کہ مرد نے یوں کہا : أمرك بيدك في يومين (دو دن تجھے اختیار ہے) تو اس صورت میں رات کا شمول مضر نہیں) ۔

امام اعظم سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اگر عورت الیوم کا اختیار رد کر دے تو اسے حق حاصل ہوگا کہ آئندہ روز اپنے نفس کو اختیار کر سکے کیونکہ عورت أمر باليد کو رد کرنے کی مالکہ نہیں ہوتی ۔ جیسا کہ وہ مرد کے ایقاع طلاق کو نہیں روک سکتی (یعنی اگر مرد کہے أنت طالق اليوم وغداً تو عورت پر اسی وقت طلاق واقع ہو جائے گی ۔ ایقاع طلاق کو روکنا اس کے بس میں نہیں ہے اسی

طرح اگر الیوم کے اختیار کو رد کر دے تو وہ کل کے اختیار کو رد کرنے کی مالکہ نہ ہوگی)۔

ظاہر الروایۃ کی وجہ یہ ہے کہ عورت نے جب اپنے نفس کو آج اختیار کر لیا تو پھر اس کو کل کے روز اختیار نہیں رہے گا ۔ پس اسی طرح اگر اس أمر بالید کو رد کرکے اپنے شوہر کو اختیار کر لیا (تو بھی کل کے روز اسے اپنے نفس کو اختیار کرنے کی قدرت نہ رہے گی) کیونکہ جس کو دو چیزوں کے درمیان اختیار دیا جائے اسے دو میں سے ایک کے اختیار کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے ۔

امام ابو یوسف[2] فرماتے ہیں : اگر مرد کہے أمرك بیدك الیوم وأمرك بیدك غداً (تجھے آج اختیار ہے اور تجھے کل اختیار ہے) تو یہ دو اختیار ہیں کیونکہ مرد نے ہر ایک وقت کی خبر کو علیحدہ ذکر کیا ہے (یعنی ہر کلام بذاته مستقل ہے) بخلاف پہلی صورت کے (یعنی أمرك بیدك الیوم وغداً امر واحد ہے) ۔

مسئلہ : اگر مرد نے کہا : أمرك بیدك یوم یقدم فلان (جس دن فلاں شخص آیا ، تجھے اپنے آپ کا اختیار ہوگا) پس وہ آدمی آ گیا ۔ مگر اس کی آمد کا علم نہ ہوسکا ۔ حتی کہ رات کی تاریکی چھا گئی تو عورت کے ہاتھ میں اختیار نہیں رہے گا ۔ کیونکہ أمر بالید أمر ممتد ہے (یعنی اس میں توسیع ممکن ہے طلاق کی طرح غیر ممتد نہیں کہ اسی وقت واقع ہو جائے) اس لیے جو "یوم" أمر ممتد سے متصل ہوگا اس سے

مراد دن کی سپیدی ہوگی ۔ اس کی تحقیق ہم فصل "اضافۃ الطلاق" میں بیان کر چکے ہیں لہذا اختیار دن ہی دن تک مؤقت رہے گا اور دن کے گزر جانے سے اختیار بھی ختم ہو جائے گا۔

مسئلہ : اگر مرد نے عورت کو امر بالید کا موقع دیا یا اسے اختیار دیا پس وہ اس دن اسی جگہ رہی اور کھڑی نہ ہوئی تو اسے اختیار حاصل رہے گا جب تک کہ وہ کسی دوسرے کام میں مشغول نہ ہو۔ کیونکہ یہ اختیار دینا عورت کو اپنے آپ کو طلاق دینے کی مالکہ بنانا ہوتا ہے (اس اختیار سے عورت اپنے آپ پر طلاق وارد کرنے کی مالکہ بن جاتی ہے)۔ کیونکہ مالک وہی ہوتا ہے جو اپنی رائے سے جس طرح چاہے تصرف کرے اور عورت اسی صفت سے موصوف ہے (وہ اپنے نفس کی مالکہ ہو چکی ہے ، چاہے طلاق اختیار کرے یا نہ کرے) اور مالکہ بنانے کا یہ حق مجلس تک محدود رہتا ہے جس کی تحقیق ہم "فصل اختیار" میں بیان کر چکے ہیں ۔

مسئلہ : اگر عورت مرد کے اس قول کو سن رہی ہو تو عورت کی وہی مجلس معتبر ہوگی جس میں اس نے یہ بات سنی ۔ اگر وہ خود نہیں سن رہی تو عورت کی وہ مجلس معتبر ہوگی جس میں اسے علم ہؤا یا اسے خبر پہنچی کیونکہ اس تملیک میں تعلیق کا معنی پایا جاتا ہے اس لیے مجلس کے بعد تک موقوف ہوگی اور مرد کی مجلس کا کچھ اعتبار نہ ہوگا

کیونکہ أمر بالید کا معلق کرنا شوہر کے حق میں لازم ہے (اب وہ اپنی تعلیق سے رجوع کرکے حق اختیار واپس نہیں لے سکتا) ۔ بخلاف بیع کے ۔ کیونکہ بیع میں تملیک محض تملیک ہی ہوتی ہے اور اس میں تعلیق کا شائبہ بھی نہیں ہوتا ۔

اور جب عورت کی مجلس کا اعتبار پیش نظر ہوا تو مجلس کبھی تو جگہ بدلنے سے بدل جاتی ہے اور کبھی ایک کام چھوڑ کر دوسرا کام شروع کرنے سے ۔ جیسا کہ خیار کی بحث میں ہم اس کی پوری تفصیل بیان کر چکے ہیں ۔

نیز عورت کے کھڑا ہونے سے بھی اس کے ہاتھ سے اختیار جاتا رہے گا کیونکہ یہ قیام اعراض کی دلیل ہوگا اور قیام رائے میں بھی تغیر پیدا کر دیتا ہے ۔ بخلاف اس کے جب وہ دن بھر اس طرح بیٹھی رہے ، نہ اٹھے اور نہ کسی دوسرے کام ہی میں لگے ۔ کیونکہ مجلس گاہے طویل ہوجاتی ہے اور گاہے مختصر ۔ پس مجلس برابر باقی رہے گی ۔ یہاں تک کہ کوئی ایسا امر پایا جائے جو مجلس کو برخواست کر دے یا عورت کے اعراض پر دلالت کرے ۔

الجامع الصغیر میں امام محمد کے قول "مکثت یوماً" سے مراد وقت کا اندازہ نہیں (کہ اس قدر وقت سے زائد نہ ہو ۔ بلکہ محض مثال کے طور پر بیان ہوا ہے ورنہ اس سے زائد عرصہ بھی ممکن ہے) اور ان کے قول ما لم تأخذ فی أمر آخر سے مراد وہ عمل ہے جس سے معلوم

منقطع کرنے والا ہے جس میں عورت موجود تھی ۔ مطلق کام مراد نہیں ہے (مثلاً اگر کھڑی تھی تو بیٹھ گئی یا بیٹھی تھی تو تکیہ لگا لیا ۔ تو یہ کام قاطع مجلس نہ ہوگا) ۔

مسئلہ : اگر عورت کھڑی تھی پھر بیٹھ گئی تو اس کا اختیار باقی رہے گا کیونکہ یہ تو متوجہ ہونے کی دلیل ہے ۔ اس لیے کہ بیٹھ جانا رائے کو جامع اور صائب ہونے کا موقع دیتا ہے ۔

اسی طرح اگر بیٹھی تھی پھر تکیہ لگا لیا ۔ یا تکیہ لگائے ہوئے تھی اور تکیے سے ہٹ کر بیٹھ گئی (تو اختیار باقی رہے گا) کیونکہ یہ ایک صورت نشست کو چھوڑ کر بیٹھنے کی دوسری صورت اختیار کرنا ہے ۔ لہذا یہ اعراض شمار نہ ہوگا جیسا کہ وہ دونوں زانو کھڑے کرکے بیٹھی ہو پھر چار زانو ہو جائے ۔

مصنف[a] فرماتے ہیں یہ الجامع الصغیر کی روایت ہے مگر دوسری کتب میں مذکور ہے کہ عورت اگر بیٹھی ہوئی تھی پھر تکیہ لگا لیا تو اسے اختیار نہیں رہے گا ۔ کیونکہ تکیہ لگانا اس امر سے بے اعتنائی کا اظہار کرنا ہے ۔ لہذا یہ دلیل اعراض ہوگی لیکن (امام محمد[a] کا) پہلا قول زیادہ صحیح ہے ۔

اگر عورت بیٹھی ہوئی تھی پھر لیٹ گئی تو اس مسئلے میں ابو یوسف[a] سے دو روایتیں ہیں ۔ (اختیار کا باقی رہنا اور زائل ہو جانا ۔ دلائل وہی ہیں جو اوپر بیان ہو چکے ہیں) ۔

مسئلہ : اگر عورت نے کہا لوگو ! میرے باپ کو بلا لاؤ تا کہ میں اس سے مشورہ کر لوں ۔ یا کہا کہ گواہوں کو بلا لاؤ تا کہ میں ان کو اس امر پر گواہ بناؤں تو اس کا اختیار باقی رہے گا ۔ کیونکہ مشورہ کرنا درست بات معلوم کرنے کی کوشش کے لیے ہوتا ہے اور گواہ قائم کرنا انکار سے بچنے کے لیے ہوتا ہے اس لیے دلیل اعراض نہ ہوگی ۔

مسئلہ : اگر عورت جانور پر سوار تھی ۔ پھر سواری ٹھہر گئی تو خیار باقی رہے گا ۔ لیکن اگر سواری روانہ ہوگئی تو اختیار باطل ہوجائے گا کیونکہ جانور کا چلنا اور رکنا عورت ہی کی طرف منسوب ہوگا ۔

مسئلہ : کشتی بمنزلہ گھر کے ہے کیونکہ اس کی روانی سوار کی طرف منسوب نہیں ہوتی آپ جانتے ہیں کہ سوار اس کے روکنے پر قادر نہیں ہوتا مگر جانور کا سوار اسے روکنے پر قادر ہوتا ہے ۔ (لہذا کشتی کے چلنے سے اختیار باطل نہ ہوگا) ۔

# فَصْلٌ فِی الْمَشِیْئَةِ

# مشیئت کا بیان

مسئلہ : اگر کسی شخص نے اپنی بیوی سے کہا طلقی نفسك اور مرد کی نیت کچھ بھی نہ ہو یا اس نے ایک طلاق کی نیت کی اور عورت نے جواب میں کہا طلقت نفسی تو ایک رجعی طلاق واقع ہو جائے گی ۔ اگر عورت نے اپنے آپ کو تین طلاقیں دیں اور مرد نے بھی تین کا ارادہ کیا ہو تو تینوں واقع ہو جائیں گی ۔ اس (یعنی پہلی صورت میں ایک اور دوسری میں تین واقع ہونے) کی دلیل یہ ہے کہ مرد کے قول طلقی کا مطلب یہ ہے افعلی فعل الطلاق اور طلاق اسم جنس ہے جس کا اطلاق فرد ادنی (واحد) پر ہوگا ۔ مگر کل میں (تین) کا احتمال بھی رہے گا جیسا کہ تمام اسماء اجناس کا اصول ہے ۔ اس لیے طلاق میں تین کی نیت مؤثر ہوتی ہے اور عدم نیت کے موقع پر اس سے ایک طلاق مراد لی جائے گی اور یہ ایک بھی رجعی ہوگی ۔ کیونکہ طلاق صریح عورت کے سپرد کی گئی ہے اور وہ رجعی ہوتی ہے ۔

مسئلہ : اگر مرد دو کی نیت کرے تو صحیح نہ ہوگی ۔

کیونکہ دو کی نیت عدد کی نیت ہوگی (حالانکہ اسم جنس سے وحدۃ شخصی یا وحدۃ نوعی مراد لی جاتی ہے اور دو نہ وحدت شخصی ہے اور نہ نوعی) البتہ جب یہ منکوحہ باندی ہو (تو دو کی نیت درست ہے) کیونکہ دو کا عدد اس کے حق میں جنس ہے۔

مسئلہ : مرد نے اپنی بیوی سے کہا طلقی نفسك عورت نے جواب میں کہا أبنت نفسی (میں نے اپنے آپ کو بائنہ کرلیا) تو بھی ایک رجعی ہوگی۔ اگر عورت جواب میں قداخترت نفسی کہے تو طلاق نہ ہوگی کیونکہ ابانت الفاظ طلاق سے ہے۔ کیا آپ کو یہ تسلیم نہیں کہ اگر مرد کہے ابنتك (میں نے تجھے بائن کر دیا) اور اس سے طلاق کی نیت کرے یا عورت کہے أبنت نفسی (میں نے اپنے آپ کو بائنہ کر لیا) اور مرد کہے میں اس کی اجازت دیتا ہوں تو عورت پر طلاق بائن واقع ہو جائے گی۔ کیونکہ اصل طلاق میں عورت نے شوہر کی تفویض کی موافقت کی۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ عورت نے اس میں ایک وصف کا اضافہ کر دیا یعنی ابانت کی تعجیل (کیونکہ رجعی سے تو ابانت عدت کے بعد ہونی تھی۔ مگر عورت نے ایقاع ابانت میں جلد بازی سے کام لیا) لہذا زائد وصف لغو ہو جائے گا اور (رجعی) طلاق باقی رہے گی۔ جیسا کہ عورت طلقی نفسك کے جواب میں طلقت نفسی تطلیقة بائنة کہے (تو بھی اصل طلاق یعنی رجعی واقع ہوگی) اور مناسب یہی ہے کہ طلاق رجعی واقع ہو۔ بخلاف اس صورت کے جب

عورت کہے کہ میں نے اپنے آپ کو اختیار کر لیا کیونکہ اختیار
کرنا الفاظ طلاق سے نہیں ہے۔ کیا آپ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ
اگر مرد اسے اخترتك یا اختاری کہے اور اس کی نیت طلاق
کی تھی تو طلاق واقع نہ ہوگی۔ اگر عورت پہل کرے اور
کہے اخترت نفسی اور زوج کہے کہ میں نے اجازت دی تو
کچھ واقع نہ ہوگا کیونکہ بالاجماع اخترت نفسی اس وقت
طلاق شمار ہوتی ہے جب یہ تخییر کے جواب میں واقع ہو اور
مرد کا (عورت کے جواب میں) طالق نفسك کہنا تخییر نہیں
ہے لہذا عورت کا اخترت نفسی کہنا لغو ہوگا۔

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ عورت کے قول أبنت نفسی
سے کچھ بھی واقع نہ ہوگا کیونکہ شوہر نے جو چیز عورت
کے سپرد کی تھی اس نے اس کے بجائے دوسری چیز کو اختیار
کیا کیونکہ ابانت طلاق کے مغایر ہوتی ہے۔

مسئلہ : اگر شوہر نے بیوی سے کہا طالق نفسك تو مرد
کو اپنے قول سے رجوع کرنے کا اختیار نہیں ہوگا کیونکہ
تفویض میں قسم یعنی تعلیق کے معنی ہوتے ہیں۔ اور اس
صورت میں طلاق عورت کے طلاق دینے سے معلق ہو جاتی ہے
اور تعلیق یا قسم کا تصرف واجب ہوتا ہے (جس سے رجوع
نہیں کیا جا سکتا)۔

مسئلہ : اگر عورت اپنی مجلس سے کھڑی ہوگئی تو
تفویض باطل ہو جائے گی کیونکہ یہ تملیک ہے (اور تملیک
صرف مجلس تک رہتی ہے) بخلاف اس صورت کے جب مرد

اپنی عورت سے کہے کہ تو اپنی سوت کو طلاق دے کیونکہ یہ وکیل اور نائب بنانا ہے تو یہ مجلس تک محدود نہ ہوگی، نیز اس سے رجوع بھی کیا جا سکتا ہے۔

مسئلہ: اگر مرد نے عورت سے کہا طلقی نفسك متی شئت (تو جب بھی چاہے اپنے آپ کو طلاق دے سکتی ہے) تو عورت اس مجلس میں اور اس مجلس کے بعد بھی طلاق کا اختیار رکھتی ہے کیونکہ لفظ متی سب اوقات کے بیان کرنے میں عام ہے۔ گویا مرد نے یوں کہا: فی أی وقت شئت یعنی جس وقت بھی تو چاہے۔

مسئلہ: جب ایک مرد دوسرے مرد سے کہے طلق امرأتی (تو میری عورت کو طلاق دے دے) تو اس مرد کو اختیار ہے کہ اس مجلس میں طلاق دے یا بعد میں اور خاوند رجوع بھی کر سکتا ہے کیونکہ یہ توکیل (وکیل بنانا) اور استعانت ہے تو لازم نہیں (بلکہ اس سے رجوع بھی کیا جا سکتا ہے) اور نہ مجلس تک محدود ہوگا (بخلاف مرد کے اپنی عورت کو طلقا نفسك کہنے کے کیونکہ عورت اب اپنے آپ پر تصرف کر سکتی ہے تو یہ تملیک ہے توکیل نہیں ہے۔

مسئلہ: اگر مرد نے کسی شخص سے کہا طلقها إن شئت (اگر تو چاہے تو اسے طلاق دے دے) تو وکیل کو صرف اسی مجلس میں طلاق دینے کا اختیار ہوگا اور زوج کو اپنے قول سے رجوع [illegible] کا حق حاصل نہ ہوگا۔

امام زفر؀ فرماتے ہیں کہ یہ اور پہلی صورت (طلق امرأتی) دونوں برابر ہیں ۔ کیونکہ مشیئت کی تصریح کرنا یا نہ کرنا برابر ہے اس لیے کہ وکیل اپنی مشیئت سے تصرف کرتا ہے (یعنی وکیل کی مرضی پر منحصر ہے کہ طلاق دے یا نہ دے خاوند إن شئت کہے یا نہ کہے) لہذا ''وکیل طلاق''وکیل بیع'' کی طرح ہوگا ۔ جب وکیل بیع کو یہ کہا جائے بعد إن شئت (اگر تو چاہے تو اسے بیچ دے تو یہ اختیار مجلس تک محدود نہ ہوگا) ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ تملیک ہے (کیونکہ خاوند نے إن شئت سے وکیل کے تصرفات کا دائرہ اتنا وسیع کر دیا کہ اب وہ پورے طور پر مالک جیسے اختیارات رکھتا ہے) کیونکہ خاوند نے (طلاق کو) وکیل کی مشیئۃ سے معلق کر دیا ہے اور مالک وہی ہوتا ہے جو اپنی مرضی سے تصرف کرتا ہے اور طلاق ایسی چیز ہے جو تعلیق (شرط) کو برداشت کرتی ہے مگر بیع میں یہ بات ممکن نہیں ۔

مسئلہ : اگر مرد نے بیوی سے کہا طلقی نفسك ثلاثاً (تو اپنے آپ کو تین طلاقیں دے) لیکن عورت نے اپنے آپ کو ایک طلاق دی تو ایک ہی واقع ہوگی کیونکہ جب وہ تین واقع کرنے کی مالکہ بن گئی ہے تو ایک طلاق کے ایقاع کی بھی ضرورۃ مالکہ ہوگی ۔

مسئلہ : اگر مرد اپنی بیوی سے کہے طلقی نفسك واحدۃ مگر عورت نے اپنے آپ کو تین طلاقیں دیں تو امام اعظم؀

کے نزدیک کچھ بھی واقع نہ ہوگا اور صاحبینؒ کے نزدیک ایک واقع ہو جائے گی ۔ کیونکہ عورت نے وہ کچھ کیا جس کی وہ مالکہ تھی مگر ساتھ کچھ اضافہ بھی کر دیا (لہذا اضافہ لغو ہوگا اور ایک طلاق واقع ہو جائے گی) جیسا کہ شوہر اسے ایک ہزار طلاق دے ڈالے (تو تین واقع ہوں گی اور باقی لغو ہوں گی) ۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ عورت نے وہ چیز کی جو شوہر نے اس کی سپرد نہیں کی تھی ۔ تو گویا یہ نئے سرے سے اپنے آپ کو طلاقیں دے رہی ہے (اور عورت کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ ابتداءً اپنے آپ کو طلاق دے سکے) کیونکہ خاوند نے تو اسے صرف ایک طلاق کا مالک بنایا تھا اور تین کا عدد ایک نہیں ہوتا ۔ کیونکہ ثلاث ایک مرکب جمع عدد کا نام ہے اور واحد فرد ہے جس میں ترکیب نہیں پائی جاتی ۔ تو ایک اور تین میں باہم ضدین کی مغائرت ہے ۔ بخلاف زوج کے کہ وہ اپنی ملک کے دائرہ میں تصرف کرتا ہے (لہذا جب اس نے ہزار طلاق دی تو ایجاب صحیح ہے مگر بقدر محل تین واقع ہوں گی) اور اسی طرح پہلے مسئلے میں (أی طلقی نفسك ثلاثاً فطلقت واحدة) کیونکہ وہ تین کی مالکہ تھی (اور تین میں ایک بھی موجود ہوتا ہے) مگر اس صورت میں وہ تین کی مالکہ نہیں ہے اور جو کچھ اس نے کیا ہے وہ اس کے اختیار میں نہیں دیا گیا تھا ۔ لہذا تفویض ہی لغو ہوگئی ۔

**مسئلہ :** اگر شوہر نے عورت کو ایسی طلاق کا حکم دیا جس سے وہ رجوع کر سکے مگر عورت نے اپنے آپ کو طلاق بائن دے دی یا مرد نے بائن طلاق کا حکم دیا اور عورت نے رجعی واقع کی تو طلاق خاوند کے حکم کے مطابق واقع ہوگی ۔

اس پہلے مسئلے کی صورت یہ ہے کہ جب خاوند کہے تم اپنے کو ایسی طلاق دے سکتی ہو جس سے میرے لیے رجوع ممکن ہو تو عورت کہے کہ میں اپنے نفس کو بائن طلاق دیتی ہوں مگر رجعی طلاق واقع ہوگی کیونکہ اس نے اصل کے ساتھ کچھ مزید اپنے اوپر وارد کیا تو وصف زائد لغو ہو جائے گا اور اصل باقی رہ جائے گا جیسا کہ بیان ہو چکا ہے اور دوسرے مسئلے کی صورت یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو طلاق بائن دے سکتی ہو ۔ اور عورت جواب میں کہے کہ میں نے اپنے آپ کو ایک رجعی طلاق دی لیکن طلاق بائن واقع ہوگی کیونکہ عورت کا یہ کہنا کہ اس نے ایک طلاق رجعی دی ، لغو ہے ۔ اور یہ لغو حرکت خود عورت کی طرف سے ہے ۔ کیونکہ جب خاوند نے سپرد کردہ طلاق کی صفت معین کر دی تو عورت کا کام یہ ہے کہ وہ اسی (موصوف) طلاق کو واقع کر لے ۔ اپنی طرف سے وصف کا تعین نہ کرے تو گویا عورت نے اصل طلاق پر اکتفاء کیا ۔ پس رجعی یا بائن اسی صفت کے ساتھ واقع ہوگی جو مرد نے معین کی ہے ۔

مسئلہ : اگر مرد نے عورت سے کہا طلقی نفسك ثلاثاً إن شئت (اگر تو چاہے تو اپنے آپ کو تین طلاقیں دے سکتی ہے) اور عورت نے ایک اختیار کی تو کچھ واقع نہ ہوگا کیونکہ مرد کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر تو تین چاہے مگر عورت کے ایک واقع کرنے سے معلوم ہوا کہ اس نے تین کو نہیں چاہا ، لہذا شرط نہ پائی گئی -

مسئلہ : اگر خاوند نے بیوی سے کہا طلقی نفسك واحدة إن شئت یعنی اگر تو چاہے تو اپنے آپ کو ایک طلاق دے سکتی ہے مگر عورت نے تین دیں تو بھی امام اعظمؒ کے نزدیک وہی حکم ہوگا کیونکہ تین کی مشیئت ایک کی نہیں ہوتی - جیسا کہ تین کا واقع کرنا ایک کا واقع کرنا نہیں ہوتا (یعنی مرد کہے کہ تو ایک طلاق دے سکتی ہے اور عورت تین دے دے تو یہ تین کا ایقاع ایک کا ایقاع نہ ہوگا) -

صاحبینؒ کا قول ہے کہ ایک واقع ہوگی کیونکہ تین طلاقوں کی مشیئة میں ایک طلاق بھی موجود ہے جیسا کہ تین طلاقوں کا واقع کرنا ایک کا واقع کرنا بھی ہوتا ہے پس شرط پائی گئی -

مسئلہ : اگر مرد نے بیوی سے کہا : أنت طالق إن شئت (اگر تو چاہے تو تجھے طلاق ہے) بیوی نے جواب میں کہا : شئت إن شئت (اگر تو چاہے تو مجھے منظور ہے) مرد نے طلاق کی نیت کرتے ہوئے کہا : شئت (میں تو چاہتا

ہوں) تو عورت کا اختیار باطل ہوگیا ، کیونکہ شوہر نے تو
عورت کی طلاق کو اس کی آزاد رائے کے ساتھ معلق کیا تھا ۔
مگر عورت نے اپنی رائے کو خود مقید کر دیا تو (تفویض
کی) شرط برقرار نہ رہی اور وہ عورت کا لاطعنی باتوں میں
مشغول ہونا ہے (یعنی اس نے مرسلہ کو چھوڑ کر معلقہ کو
اختیار کر لیا تو اختیار اس کے ھاتھ سے جاتا رھا) لہذا مرد
کے شئت کہنے سے طلاق واقع نہ ہوگی خواہ وہ طلاق کی نیت
بھی کر لے کیونکہ بیوی کے قول میں طلاق کا ذکر نہیں ہے
تاکہ مرد اس کی طلاق کا چاہنے والا ہو (یعنی عورت نے
صرف اتنا کہا کہ میں چاہتی ہوں اگر تو چاہے ۔ اس قول
میں طلاق کا لفظ مذکور نہیں ہے) ۔ نیت ایسی چیز میں کچھ
کام نہیں آتی جو مذکور ہی نہ ہو ۔ البتہ اگر مرد شئت إن شئت
کے جواب میں یوں کہے شئت طلاقك (میں تیری طلاق چاہتاہوں)
تو طلاق واقع ہو جائے گی بشرطیکہ نیت طلاق بھی ہو ۔
کیونکہ یہ تو گویا از سر نو طلاق دینا ہے اور طلاق کا
چاہنا اس کے ہونے کی خبر دے رہا ہے بخلاف أردت طلاقك
کہنے کے (کہ میں تیری طلاق کا ارادہ کرتا ہوں) کیونکہ
ارادہ اس کے موجود ہونے کی خبر نہیں دیتا ۔ اسی طرح اگر
عورت نے جواب میں کہا : شئت إن شاء أبي (مجھے منظور ہے
اگر میرے والد کو منظور ہو) یا شئت إن كان كذا (اگر یہ
کام اس طرح ہو جائے تو مجھے منظور ہے) یعنی کسی ایسے
کام سے مشروط کر دے جو ابھی وقوع پذیر نہیں ہوا (تو

یہی صورت ہوگی) جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ عورت نے اپنی مشیئت کو معلق کر دیا ہے) حالانکہ وہ مطلق تھی) اس لیے طلاق واقع نہ ہوگی اور اختیار باطل ہو جائے گا۔

**مسئلہ** : اگر عورت نے مشیئت کو کسی ایسے کام سے معلق کیا جو پہلے واقع ہو چکا ہے تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ کیونکہ کسی موجود چیز سے مشروط کرنا گویا فوری نافذ کرنا ہے۔

**مسئلہ** : اگر خاوند نے زوجہ سے کہا ، أنت طالق إذا شئت أو إذا ما شئت أو متی شئت أو متی ما شئت (تو جب چاہے اپنے آپ کو طلاق دے سکتی ہے) مگر عورت نے اس تفویض کو رد کر دیا۔ لیکن یہ رد نہیں ہوگی اور نہ ہی مجلس تک محدود رہے گی۔

رہا کلمۂ متی اور متی ما تو یہ دونوں وقت کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور یہ تمام اوقات کے لیے عام ہیں گویا مرد نے یوں کہا : فی أی وقت شئت تو یہ اختیار بالاجماع مجلس تک محدود نہ ہوگا۔ اگر عورت اختیار کو رد کر دے تو بھی رد نہ ہوگا کیونکہ مرد نے اسے ہر اس وقت میں جب بھی وہ چاہے طلاق کا مالک بنا دیا ہے۔ لہذا اس کو ایسا چاہنے سے پہلے تملیک طلاق ثابت نہ ہوگی کہ رد کرنے سے رد ہو جائے۔

عورت اپنے آپ کو ایک طلاق دے سکتی ہے کیونکہ کلمۂ متی زمانے کے لیے تو عام ہے لیکن فعل کے لیے عام

نہیں ۔ پس عورت کو ہر زمانے میں طلاق دینے کا اختیار تو ہوگا مگر ایک دفعہ طلاق دینے کے بعد دوبارہ طلاق کا اختیار نہ ہوگا ۔

کلمۂ إذا اور إذا ما صاحبینؒ کے نزدیک متی کے ہم معنی ہیں ۔ مگر امام اعظمؒ کے نزدیک اگرچہ إذا کا استعمال شرط کے لیے ہوتا ہے جیسا کہ وقت کے لیے بھی ہوتا ہے ۔ لیکن اس صورت میں عورت کے ہاتھ میں اختیار آ چکا ہے تو شک کی وجہ سے زائل نہ ہوگا ۔ اس کی بحث اضافۃ الطلاق إلی الزمان کی فصل میں گزر چکی ہے ۔

مسئلہ : اگر مرد نے عورت سے کہا : أنت طالق کلما شئت (تو جب بھی چاہے تجھے طلاق ہے) تو عورت اپنے آپ کو ایک کے بعد دوسری طلاق دے سکتی ہے حتی کہ تین طلاقیں بھی دے سکتی ہے کیونکہ کلمۂ کلما تکرار فعل کا تقاضا کرتا ہے ۔ مگر یہ تعلیق یا اختیار عورت کو اسی وقت تک حاصل ہوگا جب تک وہ اس مرد کے نکاح میں رہے ورنہ اگر کسی دوسرے خاوند سے طلاق لے کر اس پہلے مرد کے نکاح میں آ جائے اور اپنے آپ کو طلاق دے تو طلاق واقع نہ ہوگی کیونکہ یہ نیا ملک ہے ۔ نیز عورت کو یہ اختیار نہیں کہ یکبارگی اپنے آپ کو تین طلاقیں دے ۔ کیونکہ کلمۂ کلما ایک طلاق کے عموم کا تقاضا کرتا ہے ، اکٹھی طلاقوں کا نہیں ۔ لہذا عورت کو یکبارگی (تین طلاقیں) دینے اور جمع کرنے کا اختیار نہ ہوگا ۔ (کہ میں نے

مسئلہ : اگر مرد نے عورت سے کہا أنت طالق حیث شئت او أین شئت (تو جہاں بھی چاہے تجھے طلاق ہے) تو جب تک عورت نہ چاہے طلاق نہ ہوگی ۔ اگر وہ اس مجلس سے اٹھ کھڑی ہوئی تو اسے اختیار باقی نہ رہے گا کیونکہ حیث اور أین دونوں اسم مکان ہیں ۔ اور طلاق کا کسی مکان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔ لہذا جگہ کا ذکر لغو ہو گیا اور مطلق مشیئت باقی رہ گئی اس لیے مجلس تک محدود ہوگی بخلاف زمانے کے کیونکہ طلاق کا تو زمانے سے تعلق ہوتا ہے ۔ حتی کہ طلاق کسی زمانے میں واقع ہوتی ہے اور کسی میں نہیں ۔ اس لیے بطور خصوص اور بطور عموم زمانے کا اعتبار کرنا ضروری ہے (یعنی خاص زمانہ ہو جیسے أنت طالق غداً یا عام ہو جیسے أنت طالق فی أی وقت شئت) ۔

مسئلہ : اگر مرد نے عورت سے کہا أنت طالق کیف شئت (تو جس طرح چاہے تجھے طلاق ہے) تو عورت پر ایک طلاق واقع ہوگئی جس میں مرد کو رجعت کا اختیار ہے ۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ عورت کی مشیئت سے پہلے ہی ایک طلاق واقع ہو جائے گی (پھر عورت جس طرح کی طلاق چاہے، بائن یا رجعی ، وہ بھی وارد ہو جائے گی) ۔

اگر عورت کہے کہ میں بائن یا تین چاہتی تھی اور مرد کہے میری نیت بھی یہی تھی تو مرد کے کہنے کے مطابق ہوگا کیونکہ اس صورت میں عورت کی مشیئت اور مرد کے ارادے میں مطابقت ثابت ہوگی۔ لیکن اگر عورت تین کا ارادہ

کرے اور زوج ایک بائن کا یا علی العکس تو ایک رجعی واقع ہوگی کیونکہ دونوں میں عدم موافقت کی وجہ سے عورت کا تصرف لغو ہو جائے گا اور زوج کا طلاق واقع کرنا باقی رہ گیا ۔

اگر مشیئت کا اختیار دیتے وقت زوج کی کوئی نیت نہ ہو تو مشائخ متاخرین کے قول کے مطابق عورت کی مشیئت کا کا اعتبار کیا جائے گا کیونکہ تخییر کا تقاضا یہی ہے ۔

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ امام محمدؒ نے مبسوط میں اس کو امام اعظمؒ کا قول قرار دیا ہے ۔ اور صاحبینؒ کے نزدیک اس وقت تک واقع نہ ہوگی جب تک کہ عورت واقع نہ کرے (یعنی مذکورہ مسئلے میں امام اعظمؒ کے نزدیک ایک تو عورت کی مشیئت سے قبل ہی واقع ہو جاتی ہے مگر صاحبینؒ عدم وقوع کے قائل ہیں) پس وہ عورت رجعی طلاق چاہے یا بائن یا تین چاہے (اس کی مشیئت کے مطابق واقع ہوگی) مسئلہ عتاق بھی اسی اختلاف پر مبنی ہے (مثلاً ایک شخص اپنے غلام سے کہے أنت حر کیف شئت ، امام اعظمؒ کے نزدیک اسی وقت آزاد ہو جائے گا اور صاحبینؒ کے نزدیک جب چاہے گا) ۔

صاحبینؒ کی دلیل یہ ہے کہ خاوند نے طلاق کو عورت کے سپرد کر دیا ہے جس کیفیت پر بھی چاہے تو ضروری ہے کہ اصل طلاق عورت کی مشیئت کے ساتھ معلق ہوتا کہ ہر حالت میں اس کے لیے مشیئت ثابت رہے ۔ ہر حالت سے مراد یہ ہے کہ دخول سے پہلے ہو یا بعد، کوئی فرق نہ ہوگا ۔

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ کلمۂ کیف وصف دریافت کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ کیف أصبحت یعنی تو نے صبح کیسے کی (یعنی صحت کے ساتھ یا بیماری یا کسی اور عارضے میں مبتلا ہو کر یہاں وصف مراد ہے نہ کہ صبح) اور وصف طلاق کو سپرد کرنا اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ اصل طلاق پہلے موجود ہو اور طلاق اسی صورت میں موجود ہو سکتی ہے جبکہ وہ پہلے واقع ہو جائے (لہذا مشیئت سے قبل وجود طلاق ضروری ہے) -

مسئلہ : اگر مرد نے عورت سے کہا أنت طالق کم شئت أو ما شئت (تو جتنی طلاقیں چاہے اپنے آپ کو دے سکتی ہے) تو عورت اپنے نفس کو جتنی طلاقیں چاہے دے سکتی ہے کیونکہ کلمۂ کم اور ما عدد کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور مرد نے عورت کو وہ عدد سپرد کر دیا ہے جو وہ چاہے -

اگر عورت مجلس سے اٹھ کھڑی ہوئی تو تفویض باطل ہو جائے گی اور اگر اختیار کو رد کر دیا تو رد ہو جائے گا - کیونکہ یہ تفویض امر واحد ہے (کلما کی طرح اس میں تکرار نہیں ہوتا) اور فوری خطاب ہے - لہذا اس کا تقاضا یہ ہے کہ جواب بھی فوری ہو -

مسئلہ : اگر مرد عورت سے کہے طلقی نفسك من ثلاث ما شئت (یعنی تو تین میں سے جتنی طلاقیں چاہے اپنے آپ کو

سکتی ہے تین نہیں دے سکتی - یہ صورت امام اعظمؒ کے نزدیک ہے -

صاحبینؒ کہتے ہیں کہ اگر چاہے تو تین بھی دے سکتی ہے کیونکہ کلمۂ "ما" خصوصاً عموم کے لیے ہی آتا ہے (تأویل و تخصیص کا احتمال نہیں رکھتا) اور کلمۂ "من" کا ہے تمیز اور پہچان کے لیے آتا ہے لہذا وہ جنس کی تمیز اور پہچان پر محمول ہوگا - (ہاں کا ہے من بعضیہ بھی ہوتا ہے مگر یہاں تو بیان کے لیے ہے یعنی تین طلاقوں سے جس قدر چاہے اپنے اوپر وارد کر لے تو اس صورت میں تین بھی وارد کر سکتی ہے) جیسا کہ کہا جاتا ہے کل من طعامی ما شئت (تو اس صورت میں پورا طعام بھی کھایا جا سکتا ہے) اسی طرح طلق من نسائی من شاءت (میری بیویوں میں سے جو بھی چاہے اسے طلاق دے دے) تو اس صورت میں بھی سب کو طلاق دی جا سکتی ہے) -

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ "من" کا حقیقی استعمال بعضیۃ کے لیے ہوتا ہے اور "ما" کا عموم کے لیے تو ان دونوں کو ملا کر عمل کیا جائے گا (یعنی بعض عام مراد ہوگا) اور جو مثالیں آپ نے پیش کی ہیں پہلی میں تو بعضیۃ کو اس لیے چھوڑا گیا ہے تاکہ سخاوت کا اظہار ہو سکے - اور دوسری مثال میں عموم صفت ہے اور یہ صفت مشیئۃ ہے (یعنی جب فعل کا فاعل عام ہو تو فعل میں بھی عموم ہوتا ہے - اسی

بھی عام ہوگا ۔ اس بناء پر تمام عورتوں کو بھی طلاق دی
جا سکتی ہے) اگر مرد طاق من نسائی من شئت کہہ دے تو
پھر اس صورت کے خلاف ہوگا (کیونکہ اب فاعل خاص ہے
لہذا فعل بھی خاص ہوگا اور ساری عورتوں کو طلاق نہ
دے سکے گا ۔

## باب الأيمان فى الطلاق

# طلاق میں قسم کھانے یا شرط لگانے کا بیان

مسئلہ : اگر مرد طلاق کو (ہونے والے) نکاح سے مشروط کردے تو نکاح کے فوراً بعد طلاق واقع ہو جائے گی ۔ مثلاً کوئی شخص کسی عورت سے کہے إن تزوجتك فأنت طالق (اگر میں تجھ سے نکاح کروں تو تجھے طلاق ہے) یا کل امرأة أتزوجها فهی طالق (میں جس عورت سے بھی نکاح کروں اسے طلاق ہے) (تو طلاق واقع ہو جائے گی) ۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ طلاق واقع نہ ہوگی کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے : لا طلاق قبل النکاح (نکاح سے پہلے طلاق نہیں ہوا کرتی) ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ تصرف یمین (قسم) ہے کیونکہ اس میں شروط و جزاء دونوں موجود ہیں تو اس کلام کے صحیح ہونے کے لیے فوری طور پر ملک طلاق موجود ہونا شرط نہیں، کیونکہ وقوع (طلاق) تو شرط کے موجود ہونے پر ہوگا اور شرط کے موجود ہونے کے وقت ملک یقیناً حاصل ہو جاتی ہے۔

اور شرط کے وجود سے قبل اس کا اثر رکا رہتا ہے اور مرد
اگے تصرف پر موجود ھو جاتا ہے۔ امام شافعیؒ کی پیش کردہ
حدیث کا مطلب یہ ہے کہ فوری طور پر ایسی عورت پر طلاق
واقع نہ ہوگی جس پر ملک ہی حاصل نہ ہو ۔ اور حدیث کا
یہ مطلب عمرؓ ، ابن مسعودؓ ، شعبیؒ ، زہریؒ وغیرہم
علمائے سلف سے مروی ہے ۔

**مسئلہ** : اگر مرد نے طلاق کو کسی شرط سے معلق
کیا تو شرط کے پورا ہونے پر طلاق واقع ہو جائے گی ۔ مثلاً
مرد اپنی عورت سے کہے إن دخلت الدار فأنت طالق (اگر تو
گھر میں داخل ہوئی تو مجھ پر طلاق ہے) اس پر سب ائمہ کا
اتفاق ہے کیونکہ ملک نکاح اس حالت میں قائم ہے اور ظاہر
یہی ہے کہ شرط کے موجود ہونے تک یہ ملک قائم رہے گی ۔
(صاحب هدایہ نے ظاہر کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کیونکہ
یہ احتمال بھی موجود ہے کہ وجود شرط سے پہلے ہی اسے
طلاق دے دے اور ملک ہی باقی نہ رہے) ۔ پس یہ قول قسم
بننے یا طلاق واقع کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔

**مسئلہ** : طلاق کو کسی شرط سے مشروط کرنا اس وقت
تک صحیح نہیں ہو سکتا جب تک قسم کھانے والا ملک طلاق
نہ رکھتا ہو یا وہ اسے ملک کی طرف منسوب نہ کرے کیونکہ
یہ ضروری ہے کہ شرط کی جزء ظاہر ہوتا کہ مرد عورت کو
اس سے ڈرا سکے ۔ تو قسم کی صورت پیدا ہو جائے گی اور وہ

قدرت اور غلبہ ہے اور سبب ملک کی یعنی نکاح کی طرف منسوب کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ نفس ملک کی طرف منسوب کیا جائے کیونکہ سبب ملک (ملک) کے وقت ظاہر ہو جاتا ہے (جیسا کہ کوئی شخص سبب ملک کی طرف نسبت کرتے ہوئے کہے إذا اشتریتك فأنت حر یعنی جب میں تمہیں خریدلونگا تو آزاد ہو جائے گا - یہ بمنزلہ اضافة إلى الملك ہے۔ یعنی ان ملكتك فأنت حر کے قائم مقام ہے) -

**مسئلہ** : اگر مرد نے کسی اجنبیہ سے کہا اذا دخلت الدار فأنت طالق (اگر تو گھر میں داخل ہوئی تو تجھے طلاق ہے) پھر اس سے شادی کر لی اور وہ عورت گھر میں داخل ہوئی تو طلاق واقع نہیں ہوگی - کیونکہ قسم کھانے والا بالفعل طلاق کا مالک نہیں ہے اور نہ ہی اس نے طلاق کو ملک یا سبب ملک کی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ (مالک طلاق ہونے کے لیے) ملک کا ہونا یا سبب ملک کی طرف منسوب ہونا ضروری ہے -

**مسئلہ** : شرط کے الفاظ یہ ہیں : إن (اگر) إذا - إذا ما (جب ، جب کبھی) کل۔ کلما (جب کبھی بھی) متی اور متی ما کیونکہ شرط جس مصدر سے مشتق ہے اس کے ایک معنی علامت بھی ہیں اور مذکورہ الفاظ ایسے ہیں جن کے ساتھ جب افعال واقع ہوتے ہیں تو قسم توڑنے کی علامت بن جاتے ہیں (مثلاً اگر کسی نے عورت سے کہا : کلما دخلت الدار فأنت طالق تو جب بھی گھر میں داخل ہوگی تجھے طلاق ہوگی تو اس کا گھر میں داخل

ہونا "طلاق" ہونے کی علامت ہوگا۔ الغرض ان الفاظ شرط کے بعد جو افعال آتے ہیں جب ان کا وقوع ہوگا تو یہ جزاء یعنی طلاقوں کی علامت ہوں گے)۔ پھر کلمۂ إن تو محض شرط کے لیے ہے اس میں وقت کے معنی نہیں پائے جاتے (کیونکہ "إن" دوسرے الفاظ شرط کی طرح ظرف نہیں ہے) اور باقی الفاظ "إن" کے ساتھ ملحق ہیں اور کلمۂ (کل) در حقیقت شرط نہیں ہے کیونکہ "کل" کے ساتھ جو کلمہ متصل ہوتا ہے وہ اسم ہوتا ہے اور شرط وہ ہوتی ہے جس کے ساتھ جزاء ہو اور جزاء کا تعلق افعال سے ہوتا ہے مگر "کل" کو الفاظ شرط کے ساتھ اس لیے ملایا گیا کہ فعل کا تعلق اسی اسم کے ساتھ ہو جاتا ہے جو (کل) سے متصل ہو جیسا کہ آپ کہیں: کل عبد اشتریتہ فھو حر یعنی جو غلام بھی میں خریدوں وہ آزاد ہوگا (اس مثال میں آزادی خریداری کے ساتھ مشروط ہے اور خریداری کا تعلق عبد سے ہے جس پر لفظ (کل) داخل ہے تو اسم بمنزلۂ فعل ہوگیا اور "کل" کو لفظ شرط قرار دیا گیا)۔

مسئلہ: امام قدوری فرماتے ہیں ان الفاظ میں جب شرط پائی گئی تو قسم تحلیل ہو کر ختم ہو جائے گی (یعنی إن دخلت الدار فانت طالق کی صورت میں عورت اگر گھر میں داخل ہو گئی تو اس پر طلاق بائن واقع ہو جائے گی اور قسم بھی ختم ہو جائے گی) کیونکہ لغت کی رو سے یہ الفاظ عموم اور تکرار کا تقاضا نہیں کرتے فعل کے ایک بار پائے جانے سے شرط پوری ہو جاتی ہے

اور شرط کے بغیر قسم باقی نہیں رہتی (اگر بعد میں عورت گھر میں داخل ہو تو کچھ نہ ہوگا) البتہ "کلما" فعل کے عموم کا مقتضی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کلما نضجت جلودھم بدلناھم جلوداً غیرھا (یعنی جب بھی ان کے چمڑے گل سڑ جائیں گے تو ہم نئے چمڑے تبدیل کر دیں گے ۔ اس آیۃ میں فعل کا عموم ظاہر ہے) اس میں عموم پائے جانے کی بناء پر تکرار لازم ہوگا ۔

امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ اگر مرد نے اس عورت سے (جو دوسرے خاوند سے طلاق حاصل کر چکی ہے) پھر نکاح کر لیا اور شرط کا تکرار (یعنی گھر میں داخل ہونا) پایا گیا تو اب کچھ واقع نہ ہوگا کیونکہ پہلے نکاح میں مرد جن تین طلاقوں کا مالک تھا وہ ان کو پورے طور پر استعمال کر چکا ہے ۔ لہذا اب جزاء باقی نہ رہی اور قسم کی بناء تو اس جزاء پر تھی یا شرط پر (لہذا اب قسم ختم ہوگئی) ۔ اس مسئلے میں امام زفرؒ کو اختلاف ہے جسے ہم إن شاء اللہ تعالیٰ بعد میں بیان کریں گے ۔

مسئلہ : اگر کلمہ "کلما" نفس تزوج پر داخل ہو ۔ مثلاً یوں کہے کلما تزوجت امرأۃ فھی طالق (یعنی میں جب بھی کسی عورت سے نکاح کروں تو اسے طلاق ہے) تو ہر بار نکاح کرنے پر حانث ہوگا خواہ یہ نکاح دوسرے خاوند کے طلاق دینے کے بعد ہی کیوں نہ ہو ۔ کیونکہ اس قسم کا انعقاد اس حق طلاق کی وجہ سے ہے جس کا مالک وہ نکاح کرنے کی

وجہ سے بنتا ہے اور اس کا کوئی شمار نہیں ہو سکتا ۔ (یعنی جب بھی وہ نکاح کرے گا طلاق واقع ہو جائے گی) ۔

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں قسم کھانے کے بعد ملک کا زائل ہونا قسم کو باطل نہیں کرتا کیونکہ شرط پوری نہیں ہو سکی لہذا قسم باقی رہی ۔ اور محل جزاء یعنی عورت کے باقی ہونے سے جزاء بھی باقی ہے (تو جب شرط و جزاء دونوں باقی ہیں) یمین بھی باقی ہوگی ۔ پھر اگر شرط اس کی ملک میں پائی گئی تو قسم تحلیل ہو جائے گی اور طلاق واقع ہوگی ۔ کیونکہ شرط پائی گئی اور "محل" یعنی عورت میں جزاء کی اہلیت موجود ہے اور قسم نہ رہے گی جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اور اگر شرط غیر کے ملک میں پائی جائے تو قسم تحلیل ہو جائے گی کیونکہ شرط پائی گئی مگر طلاق واقع نہیں ہوگی کیونکہ عورت اب محل طلاق نہیں رہے گی ۔

مسئلہ : اگر میاں بیوی میں شرط کے بارے میں اختلاف پیدا ہو جائے تو مرد کی بات تسلیم کی جائے گی ۔ البتہ اگر عورت گواہ پیش کر دے (تو اس کی تصدیق کی جائے گی) کیونکہ مرد کا تمسک اصل سے ہے اور وہ شرط کا نہ ہونا ہے اس لیے کہ زوج مدعی علیہ اور زوجہ مدعیہ ہے اور ان دونوں میں متمسک بالاصل مدعی علیہ ہوتا ہے) دوسری بات یہ ہے کہ مرد وقوع طلاق اور زوال ملک کا منکر ہے اور عورت اس کی مدعیہ ہے (والقول قول المنکر) ۔

مسئلہ : اگر شرط اس قسم کی ہو کہ اس کا علم عورت

کے بتانے ہی سے ہو سکتا ہو تو اس کے اپنے حق میں اس کی
بات قبول کی جائے گی (ورنہ نہیں) مثلاً مرد عورت سے کہے
إن حضت فأنت طالق وفلانة (اگر تجھے حیض آئے تو تجھے اور
فلاں عورت کو طلاق ہے) عورت نے کہا کہ مجھے حیض آ گیا
تو اس پر طلاق واقع ہو جائے گی۔ مگر ''فلاں" عورت پر
طلاق واقع نہ ہوگی ۔ اس عورت پر بھی طلاق کا واقع ہونا
بطریق استحسان ہے ۔ ورنہ قیاس تو یہ ہے کہ (جب مرد
منکر ہو تو) طلاق واقع نہ ہو کیونکہ یہ شرط ہے اس لیے
عورت کی تصدیق نہ کی جائے ۔ جس طرح گھر میں داخل
ہونے کے مسئلے میں (کہ اگر مرد انکار کرے اور عورت
دخول دار کا دعوی کرے تو مرد کی بات مانی جاتی ہے) ۔

استحسان کا سبب یہ ہے کہ عورت کو اپنے نفس کے
بارے میں علم ہونا اس کے لیے بمنزلہ امانت کے ہے ۔ کیونکہ
اس شرط کا علم محض عورت کی جانب ہی سے ممکن ہے لہذا
اسی کا قول مقبول ہوگا جیسا کہ عدت اور وطی کے بارے
میں ہوتا ہے (جب تک عورت انقضاء عدت کی خبر نہ دے
مرد کو نان و نفقہ دینا پڑے گا ۔ اسی طرح جب عورت
دوسرے خاوند سے طلاق لے کر پہلے خاوند کے پاس آئے اور
کہے کہ اس خاوند نے مجھ سے مباشرت کر لی ہے تو عورت
کی بات مان لی جائے گی ۔ یا عورت اپنے خاوند سے کہے کہ
میں ایام حیض میں ہوں تو مرد اس کی بات مان لیتا ہے) (یہ
عورت اگرچہ اپنے نفس کے حق میں تو امینہ ہے) لیکن اپنی

سوات کے حق میں بطور گواہ شمار ہوگی ۔ بلکہ اس پر الزام
عاید ہوگا (کہ اسے تو طلاق ہو چکی ہے لیکن اپنی سوت کو
خواہ مخواہ عذاب میں مبتلا کر رہی ہے) لہذا اس کی بات
سوت کے حق میں مقبول نہ ہوگی ۔ اور اس طرح اگر مرد نے
عورت سے کہا إن كنت تحبين أن يعذبك الله فى نار جهنم فأنت
طالق وعبدى حر (اگر تیرے نزدیک یہ امر پسندیدہ ہے کہ
اللہ تعالی تجھے دوزخ کی آگ میں عذاب دے تو تجھے طلاق
ہے اور میرا غلام آزاد ہے) عورت نے جواب دیا أحبه (میں اس
کو پسند کرتی ہوں) یا مرد نے کہا إن كنت تحبينى فأنت طالق
وهذه معك (اگر تو مجھ سے محبت کرتی ہے تو تجھے طلاق ہے
اور تیرے ساتھ اس کو بھی عورت نے کہا أحبك (میں تجھ سے
محبت کرتی ہوں) تو عورت پر طلاق واقع ہو جائے گی مگر
غلام آزاد نہ ہوگا اور نہ ہی اس کی سوت کو طلاق ہوگی ۔
اس کی دلیل اوپر مذکور ہو چکی ہے اور عورت کے کذب
پر یقین نہیں کیا جا سکتا ۔ کیونکہ بعض اوقات اسے خاوند
سے اس قدر شدید بغض و کینہ ہو جاتا ہے کہ وہ اس سے
عذاب کے بدلے بھی رہائی حاصل کرنے کو ترجیح دیتی ہے
اور اس عورت کے حق میں حکم کا تعلق اس کے خبر دینے پر
ہے خواہ وہ جھوٹی ہی کیوں نہ ہو مگر دوسری عورت کے
حق میں حکم اصل پر رہے گا اور وہ محبت ہے جس کا علم
نہیں ہو سکتا ہے (یعنی سوت کے بارے میں یہی اصل ہوگا
کہ وہ خاوند سے محبت کرتی ہے اور عذاب نار پسند
نہیں کرتی) ۔

مسئلہ ، اگر مرد نے عورت سے کہا إذا حضنت فأنت طالق (جب تجھے حیض آئے تو تجھے طلاق ہے) پس عورت نے حیض کا خون دیکھا تو طلاق واقع نہ ہوگی ۔ جب تک کہ یہ خون تین دن تک جاری نہ رہے کیونکہ جو خون تین دن سے پہلے منقطع ہو جائے حیض نہیں ہوتا ۔ اور جب تین دن مکمل ہوگئے تو ابتدائے حیض سے طلاق کا فیصلہ کیا جائے گا ۔ کیونکہ تین دن گزرنے پر معلوم ہوا کہ یہ خون رحم سے آ رہا ہے اور حیض کا ہے ۔ لہذا ابتداء ہی سے حیض متصور ہوگا ۔

مسئلہ : اگر مرد نے بیوی سے کہا "إذا حضت حیضة فأنت طالق" (جب تجھے ایک حیض آ گیا تو تجھے طلاق ہے) تو جب تک عورت حیض سے پاک نہ ہوگی طلاق واقع نہ ہوگی ۔ کیونکہ لفظ حیضة جب "ۃ" کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد پورا حیض ہوتا ہے ۔ اسی لحاظ سے استبراء کی حدیث میں لفظ حیضہ کو پورے حیض پر محمول کیا گیا ہے ۔ (حضور ﷺ نے اوطاس کی قیدی عورتوں کے بارے میں فرمایا تھا لا توطا حامل حتی تضع ولا غیر ذات حمل حتی تحیض حیضة یعنی حاملہ عورتوں سے وضع حمل تک مباشرت نہ کی جائے اور غیر حاملہ عورتوں سے پورا حیض آنے تک وطی نہ کی جائے) اور حیض پورا اسی وقت شمار ہوتا ہے جب اختتام پذیر ہو جائے اور یہ اختتام طہر آنے سے ہوتا ہے ۔

مسئلہ : اگر مرد نے بیوی سے کہا أنت طالق إذا صمت

یوماً (جب تو نے کسی دن روزہ رکھا تو تجھے طلاق ہے) تو عورت جس دن روزہ رکھے گی اس دن غروب آفتاب کے بعد اس پر طلاق ہو جائے گی کیونکہ دن کو جب ایک مسلسل فعل کے ساتھ منسوب کیا جائے تو اس سے مراد دن کی سپیدی ہوتی ہے۔ بخلاف اس صورت کے جب کہ مرد کہے انت طالق اذا صمت (جب تو روزہ رکھے تو تجھے طلاق ہے) اس صورت میں گھڑی بھر کے روزے سے بھی طلاق ہو جائے گی)۔ کیونکہ مرد نے روزے کے لیے کوئی معیار مقرر نہیں کیا اور روزہ اپنے رکن اور شرط کے ساتھ پایا گیا۔

مسئلہ : جس شخص نے اپنی بیوی سے کہا إذا ولدت غلاماً فانت طالق واحدة وإذا ولدت جاریة فانت طالق ثنتین (جب تیرے بطن سے لڑکا پیدا ہو تجھے ایک طلاق ہے اور جب لڑکی پیدا ہو تو دو طلاقیں ہیں) چنانچہ لڑکا اور لڑکی اکھٹے پیدا ہوئے اور یہ معلوم نہیں کہ ان دونوں میں سے پہلے کون پیدا ہوا ہے تو قانوناً ایک طلاق واقع ہوگی۔ مگر دیانة اور تنزیہاً دو واقع ہوں گی۔ اور اس کی عدت بھی ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ جب اس نے پہلے لڑکا جنا تو ایک طلاق واقع ہوگئی اور لڑکی کے پیدا ہونے پر عدت ختم ہوگئی۔ البتہ لڑکی کی پیدائش سے کوئی مزید طلاق نہیں پڑے گی۔ کیونکہ وہ عدت گزارنے کی حالت میں ہے۔

لیکن اگر لڑکی پہلے پیدا ہوئی تو دو طلاقیں واقع ہوں گی اور لڑکے کی پیدائش سے عدت ختم ہو جائے گی۔ اور مزید کوئی

طلاق واقع نہ ہوگی ۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ وہ عدت گزارنے کی حالت میں ہے تو اب صورت یہ ہوئی کہ پہلی حالت میں ایک واقع ہوتی ہے اور دوسری میں دو ۔ تو دوسری طلاق بوجہ شک و احتمال کے واقع نہ ہوگی ۔ مگر احتیاط و تقوی اسی میں ہے کہ دو کے وقوع کے قول پر عمل کیا جائے اور عدت تو یقیناً ختم ہو جائے گی جیسا کہ بیان ہو چکا ہے ۔

مسئلہ : ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر تو نے ابو عمرو اور ابو یوسف سے کلام کیا تو تجھے تین طلاقیں ہیں لیکن اس کے بعد مرد نے اسے ایک طلاق دے دی اور عورت کی عدت گزر گئی اور وہ بائن ہو گئی ۔ (مطلقہ ہو جانے کے بعد) اس عورت نے ابو عمرو سے گفتگو کر لی ۔ پھر اس سے اسی خاوند نے دوبارہ شادی کر لی شادی کے بعد عورت نے ابو یوسف سے بھی گفتگو کر لی تو اس پر پہلی طلاق کو ملا کر تین واقع ہو جائیں گی ۔

امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ طلاقیں واقع نہ ہوں گی ۔ اس مسئلے کی کئی صورتیں ہیں :

۱۔ اگر دونوں شرطیں (یعنی ابو عمرو اور ابو یوسف سے گفتگو) حالت نکاح میں پائی گئی تو طلاق ہو جائے گی اور یہ ظاہر ہے ۔

۲۔ اگر دونوں شرطیں اس وقت پائی جائیں جب کہ نکاح زائل ہو چکا ہے تو کچھ بھی واقع نہ ہوگا ۔

۳- پہلی شرط حالت نکاح میں اور دوسری حالت عدم نکاح میں پائی گئی تو بھی بالاتفاق تین طلاقیں واقع نہیں ہوں گی - کیونکہ جزاء غیر ملک میں مؤثر نہیں ہوتی -

۴- پہلی شرط غیر ملک میں اور دوسری شرط ملک میں پائی گئی - کتاب کا اختلافی مسئلہ اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے -

امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ پہلی کا دوسری پر قیاس کریں گے (یعنی جس طرح شرط اول ملک میں اور دوسری غیر ملک میں واقع ہو تو تین واقع نہیں ہوتیں ، اسی طرح اس صورت میں بھی واقع نہیں ہوں گی) اس لیے دونوں شرطیں طلاق کے حکم میں ایک ہی چیز کی مانند ہیں -

ہماری دلیل یہ ہے کہ کلام کی صحت و درستی متکلم کی اہلیت کے مطابق ہوتی ہے (اور جب مرد نے شرط بیان کی تو اس میں اہلیت موجود تھی لہذا اس کا کلام اثر انداز ہوگا) البتہ (کلام کو مؤثر بنانے کے لیے) شرط بیان کرتے وقت ملک کا ہونا ضروری ہے تاکہ جزاء (یعنی وقوع طلاق) کا وجود غالب ہو سکے - کیونکہ وہ حالت مذکورہ کے ساتھ ہے ، لہذا قسم صحیح ہوگی (کیونکہ صحیح قسم وہی ہوتی ہے جس کا پورا کرنا غالباً ممکن ہو - اگر یہ لفظ کسی مردہ عورت کو مخاطب کرکے کہے تو قسم لغو ہوگی ، کیونکہ اس صورت میں قسم کا پورا ہونا ممکن نہیں اس لیے ملک کو شرط قرار دیا گیا) - اور شرط کے پورا ہونے کے وقت

بھی ملک شرط ہے تاکہ جزاء اپنے محل میں صحیح طور پر وارد ہو سکے اور جزاء اسی وقت وارد ہو سکتی ہے جب "محل جزاء" ملک میں ہو۔ مگر دونوں مذکورہ امور کے درمیان قسم باقی رہنے کی حالت ہے (یعنی ملک میں قسم کھانے سے شرط کے پائے جانے تک جو حالت ہوتی ہے وہ قسم کے باقی رہنے کی حالت ہوتی ہے) وہ ملک کے قیام و بقا کی محتاج نہیں کیونکہ شرطیہ قسم کی بقائت اپنے محل کے ساتھ ہوتی ہے اور وہ (قسم کھانے والے کا) ذمہ ہے۔

مسئلہ : اگر مرد نے عورت سے کہا إن دخلت الدار فأنت طالق ثلاثا (اگر تو گھر میں داخل ہو تو تجھے تین طلاقیں ہیں) مگر (شرط کے وقوع سے پہلے) مرد نے اسے دو طلاقیں دے دیں اور عورت نے دوسرے مرد سے شادی کر لی اور اس نے عورت سے مباشرت بھی کر لی اور پھر (طلاق لے کر) پہلے خاوند کی طرف لوٹ آئی اور گھر میں داخل ہوئی تو امام اعظمؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس پر تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ایک طلاق جو باقی رہ چکی ہے وہی واقع ہوگی۔ امام زفرؒ سے بھی یہی روایت ہے۔

امام اعظمؒ اور امام ابو یوسفؒ کا اصول یہ ہے کہ دوسرے شوہر سے نکاح کرنا تین سے کم طلاقوں کو بھی معدوم کر دیتا ہے تو عورت پھر پہلے شوہر کی طرف تین طلاقوں کی ملکیت (نئے سرے سے) لے کر لوٹتی ہے مگر امام محمد اور

امام زفرؒ کے نزدیک تین سے کم معدوم نہیں ہوتیں۔ اس لیے عورت باقی (حق طلاق) کو لے کر لوٹے گی۔ اس کی تفصیل إن شاء اللہ بعد میں بیان کی جائے گی۔

مسئلہ : اگر مرد نے اپنی بیوی سے کہا إن دخلت الدار فأنت طالق ثلاثاً (اگر تو گھر میں داخل ہوئی تو تجھے تین طلاقیں ہیں) پھر کہا انت طالق ثلاثاً (تجھے تین طلاقیں ہیں) پھر عورت نے دوسرے مرد سے نکاح کر لیا۔ اور اس نے اس سے مجامعت بھی کی۔ پھر پہلے خاوند کی طرف لوٹ آئی اور گھر میں داخل ہوئی تو اب کچھ نہ ہوگا۔

امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ تین واقع ہو جائیں گی۔ کیونکہ جزاء (یعنی وقوع ثلاثہ) لفظ کے مطابق ہونے کی وجہ سے مطلق ہے (کیونکہ مرد نے یہ شرط تو نہیں لگائی تھی کہ اگر ابھی تو گھر میں داخل ہو تو تجھے طلاق ہے بلکہ اس کا قول مطلق ہے اور طلاق کے وقوع کا احتمال باقی ہے (کہ دوسرے مرد سے طلاق لے کر پھر پہلے سے نکاح کر لے) لہذا یمین باقی رہے گی۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ جزاء کی تین طلاقیں اسی ملک نکاح کی طلاقیں ہیں کیونکہ یہی طلاقیں اس کو گھر میں داخل ہونے سے منع کرنے والی ہیں اور جو ملک دوسرے شوہر (کی طلاق) کے بعد پیدا ہوتی ہے وہ بظاہر معدوم ہوتی ہے اور قسم کا مدعا تو یہ ہے کہ کسی کام سے روکا جائے یا اس کے کرنے کی ترغیب و تحریک دلائی جائے تو مذکورہ صورت میں جب

یہ ثابت ہوگیا کہ تین طلاقوں کا تعلق اسی ملک نکاح سے تھا مگر فوری طور پر تین طلاقوں کی وجہ سے جزاء ختم ہوگئی ۔ کیونکہ ان تین طلاقوں نے محلیت ہی کو باطل کر دیا تو قسم باقی ہی نہ رہی ۔ بخلاف اس صورت کے جب مرد عورت کو (ایک یا دو طلاقیں دے کر عدت گزرنے کی وجہ سے) بائنہ کر دے (تو قسم باقی رہتی ہے) کیونکہ بقاء محل کی بناء پر جزاء باقی ہے) ۔

مسئلہ : اگر بیوی سے کہا إذا جامعتك فأنت طالق (جب میں تجھ سے مباشرت کروں تو تجھے طلاق ہے) پھر عورت سے مجامعت کی تو جیسے ہی دونوں کے فروج باہم ملیں گے تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی اور اگر مرد گھڑی بھر بھی ٹھہرا رہا (یعنی عورت سے فوراً جدا نہ ہوا) تو بھی اس پر مہر واجب نہیں ہوگا ۔ لیکن اگر اس نے عضو کو نکالنے کے بعد پھر داخل کیا تو اس پر مہر واجب ہوگا اور یہی حکم ہے ۔ جب کوئی شخص اپنی لونڈی سے کہے "اذا جامعتك فأنت حرة" (جب میں تجھ سے مجامعت کروں تو آزاد ہے) ۔

امام ابو یوسف پہلی صورت میں بھی (یعنی جبکہ فوراً جدا نہ ہو) مہر واجب قرار دیتے ہیں ۔ کیونکہ عضو کے برابر دخول سے مباشرت پائی گئی (اور یہ مجامعت حرام تھی) کیونکہ دونوں کے فروج ملتے ہی طلاق واقع ہوگئی (اور بعد میں مجامعت حرام تھی ۔ البتہ (اس جماع حرام سے) حد زنا لازم نہ آئے گی ۔ کیونکہ جماع کا اطلاق آغاز سے آخر تک ہوگا ۔

(لیکن اس کی ابتداء جائز تھی لہذا آخر حرام ہونے سے جماع کے ایک ہی ہونے کی وجہ سے حد لازم نہ آئے گی) ۔

ظاہر الروایۃ کی وجہ یہ ہے کہ جماع فرج کو فرج میں داخل کرنے کو کہتے ہیں اور داخل کرنا کوئی ایسی چیز نہیں کہ جس کے لیے دوام ہو بخلاف اس صورت کے جب کہ نکال کر پھر داخل کرے ۔ کیونکہ اس صورت میں طلاق کے بعد "ادخال" پایا گیا ، ہاں مگر اس چیز کو مد نظرر کھتے ہوئے کہ مجلس اور مقصود ایک ہے ، حد زنا واجب نہ کریں گے (کیونکہ شبہ سے حد ساقط ہو جاتی ہے) تو جب حد واجب نہ ہوئی مہر واجب ہو جائے گا کیونکہ وطی کرنے پر دونوں (حد اور مہر) میں سے ایک چیز لازمی ہے (یعنی جائز ہے تو مہر ملے گا اور ناجائز ہے تو حد جاری ہوگی) ۔

اگر مذکورہ شرط میں طلاق رجعی دے تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ادخال کے بعد کچھ دیر ٹھہرنے سے رجوع بھی خود بخود ہو جائے گا کیونکہ مساس پایا گیا مگر امام محمدؒ کو اختلاف ہے ۔

اگر اخراج کے بعد پھر ادخال کرے تو تمام ائمہ کے نزدیک رجوع ثابت ہو جائے گا کیونکہ اب از سر نو جماع پایا گیا ۔

# فَصْلٌ فی الاستثناء

# استثناء کے بیان میں

مسئلہ : اگر کسی شخص نے اپنی بیوی سے کہا: أنت طالق اور ساتھ ہی إن شاء اللہ کہہ دیا تو طلاق واقع نہ ہوگی - کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس نے طلاق یا عتاق کی قسم کھائی اور اس کے متصل ہی إن شاء اللہ کہہ دیا تو وہ حانث نہیں ہوتا -

یہ بھی کہا جا سکتا کہ قسم کھانے والے نے یہ قول شرط کی صورت میں کہا ہے اس لیے شرط کی بناء پر یہ تعلیق ہوجائے گی - اور تعلیق جزاء کے لیے شرط کے وقوع سے پہلے مانع ہوتی ہے - مگر اس مذکورہ صورت میں شرط کا علم نہیں ہوسکتا - لہذا (جزاء بھی) اصل کے لحاظ سے معدوم ہوگی - اسی لیے یہ شرط ہے کہ إن شاء اللہ پہلے کلام کے ساتھ بالکل متصل ہی کہا جائے جیسا کہ دوسری شرائط ہوتی ہیں -

مسئلہ : اگر مرد نے أنت طالق کہہ کر کچھ دیر توقف کیا تو کلام کے پہلے حصے کا حکم ثابت ہو جائے گا

(یعنی طلاق واقع ہوجائے گی) پھر سکوت کے بعد إن شاء اللہ کہنا یا کوئی دوسری شرط بیان کرنا پہلے کلام سے رجوع کرنے کے مترادف ہوگا (مگر طلاق تو واقع ہوگئی ۔ اب رجوع سے کچھ نہ ہوگا) ۔

اسی طرح اگر مذکورہ صورت میں إن شاء اللہ کہنے سے پہلے عورت مر جائے (یعنی مرد نے أنت طالق ہی کہا تھا کہ عورت کا دم نکل گیا تو اب بھی طلاق واقع نہ ہوگی ۔ کیونکہ استثناء کی وجہ سے کلام موجب طلاق نہ رہا ۔ اسی کو صاحب ہدایہ بیان کرتے ہیں) کیونکہ إن شاء اللہ سے پہلا کلام واجب ہوجاتا ہے مگر یہ موت کے بعد کہا گیا لہذا اسے مؤثر تسلیم نہ کیا جائے اور پہلے کلام ہی کا اعتبار کیا جائے ۔ اس کے جواب میں صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ) موت حکم کے واجب کرنے کی نفی کرتی ہے باطل کی نفی نہیں کرتی ۔ (یعنی إن شاء اللہ کا جملہ موجب (ما قبل) نہیں ہے کہ موت اس کے منافی ہو ۔ بلکہ یہ تو (ما قبل کا مبطل ہے اور یہ موت کے منافی نہیں ۔ کیونکہ خود موت بھی تو مبطل ہے ۔ تو جب إن شاء اللہ ما قبل کا مبطل بنا تو طلاق واقع نہ ہوئی) ۔

بخلاف اس صورت کے جب شوہر إن شاء اللہ کہنے سے پہلے مر گیا (تو عورت پر طلاق واقع ہوجائے گی) کیونکہ اس کلام کے ساتھ استثناء یعنی إن شاء اللہ متصل نہیں ہوا ۔

مسئلہ : اگر مرد نے بیوی سے کہا : أنت طالق ثلاثاً إلا

واحدۃ (تجھے تین طلاقیں ہیں سوائے ایک کے) تو عورت پر دو طلاقیں واقع ہوں گی ۔ اور اگر مرد نے کہا أنت طالق ثلاثاً إلا ثنتین (تجھے تین طلاقیں ہیں سوائے دو کے) تو ایک طلاق ہی واقع ہوگی ۔ قاعدۂ کلیہ یہ ہے کہ استثناء حقیقت میں اس چیز کا بیان ہوتا ہے جو مستثنی کے بعد باقی رہ جائے اور یہی قول صحت کے زیادہ قریب ہے ۔ اس کے معنی ہیں کہ استثناء اس کلام کو کہا جاتا ہے جو مستثنی منہ کے باقی (حصے) کو شامل ہو ۔ لفلان علی درہم (مجھے فلاں آدمی کا ایک درہم دینا ہے) اور لفلان علی عشرۃ إلا تسعۃ (میں نے فلاں کے دس درہم دینے ہیں سوائے نو کے میں کوئی فرق نہیں ۔ کل سے بعض کا استثناء کرنا درست ہے کیونکہ استثناء کرنے کے بعد کا بیان باقی رہ جاتا ہے لیکن کل سے کل کا استثناء درست نہیں ہوتا ، کیونکہ استثناء کرنے کے بعد ایسی کوئی چیز باقی نہیں رہتی جس کو بیان کیا جا سکے اور الفاظ کو اس کی طرف پھیرا جا سکے (مثلاً لفلان علی عشرۃ إلا عشرۃ کہنا غلط ہے ۔ کیونکہ استثناء کرنے کے بعد باقی کچھ نہیں رہتا اس لیے ایسا کلام لغو ہوگا) ۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ استثناء اسی وقت صحیح ہوتا ہے جب وہ ما قبل کلام سے متصل ہو جب یہ قاعدہ کلیہ ثابت ہوگیا تو ہم اس قاعدے کا اجراء کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پہلی صورت أنت طالق ثلاثاً إلا واحدۃ) میں استثناء کے بعد دو طلاقیں باقی رہتی ہیں ۔ لہذا یہی دو واقع

ہوں گی اور دوسری صورت میں ایک باقی رہتی ہے لہذا ایک ہی واقع ہوگی -

اگر خاوند کہے أنت طالق ثلاثاً إلا ثلاثاً تو تین واقع ہوں گی کیونکہ یہ استثناء کل من الکل ہے - لہذا استثناء درست نہ ہوگا اور تین طلاقوں کا وقوع ہو جائے گا (یعنی کلام کا ابتدائی حصہ أنت طالق ثلاثاً برقرار رہے گا اور إلا ثلاثاً لغو ہو جائے گا) واللہ اعلم -

# بابُ طَلَاقِ المَرِیض

# مریض کی طلاق کا بیان

مسئلہ : جب خاوند نے اپنے مرض موت میں اپنی بیوی کو طلاق بائن دی اور عورت کی عدت کے دوران ہی مرد کی وفات ہوگئی تو عورت خاوند کی میراث میں حصہ دار ہوگی ۔ اگر خاوند کی وفات عدت گزرنے کے بعد ہو تو وہ میراث سے محروم رہے گی ۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ عورت دونوں مذکورہ صورتوں میں میراث کی حقدار نہ ہوگی ۔ کیونکہ طلاق بائن کے پیش آنے سے زوجیۃ باطل ہوگئی اور میراث کا سبب یہی زوجیت تھی ۔ لہذا اگر مذکورہ صورتوں میں عورت کی وفات ہو جائے تو مرد اس کی وراثت سے محروم رہتا ہے ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ مرد کے مرض الموت میں عورت کی زوجیت وارث ہونے کا سبب بنتی ہے ۔ مگر شوہر نے اس سبب کو ضائع کرنے کا قصد کیا (کیونکہ ایسی حالت میں طلاق دینے سے اور کیا مقصد ہوسکتا ہے) لہذا شوہر کے اس قصد کو کس طرح باطل کر دیا جائے گا کہ جب تک عورت

کی عدت پوری نہ ہو جائے مرد کے قصد کو ملتوی رکھا جائے گا تاکہ عورت نقصان سے محفوظ رہے۔ اور اس قسم کا التواء ممکن بھی ہے۔ کیونکہ عدت کے اندر بعض آثار کے لحاظ سے نکاح باقی ہوتا ہے (جیسا کہ اگر شوہر عدت کے اندر رجوع کرنا چاہے تو کر سکتا ہے اور زمانۂ عدت میں نفقہ و سکنی وغیرہ مرد کے ذمے ہوتا ہے) تو یہ بھی ممکن ہے کہ مرد سے عورت کے میراث پانے کے حق کے لیے بھی نکاح کو باقی تسلیم کر لیا جائے بخلاف اس صورت کے جب عدت گزر جائے (اس لیے کہ انقضاء عدت کے بعد مرد کے مقصد کو جاری ہونے سے کوئی شے نہیں روک سکتی) کیونکہ اب امکان نہیں رہا (کہ نکاح کسی ایک وجہ سے بھی باقی ہو)۔

امام شافعیؒ کے قیاس کا جواب دیتے ہوئے صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ) اس حالت میں (یعنی جب مرد بیماری کی حالت میں طلاق دے اور عورت پہلے مر جائے) زوجیت مرد کے عورت کے مال پر وارث ہونے کا سبب نہیں بنتی۔ پس وراثت کا حق مرد کے بارے میں باطل ہو جائے گا۔ خصوصاً جب کہ مرد اپنی مرضی سے عورت کو طلاق دے دے (کیونکہ اس طرح اس نے اپنا حق اپنی ہی مرضی سے باطل کر دیا)۔

مسئلہ : اگر مرد (حالت مرض میں) عورت کے کہنے پر اسے تین طلاقیں دے یا مرد نے عورت کو اختیار دیا اور اس نے قبول کر لیا۔ یا عورت نے مرد سے خلع لے لیا۔ پھر

خاوند کی وفات ہوگئی اور عورت ابھی عدت گزار رہی تھی تو اس صورت میں وہ مرد کی وراثت سے محروم رہے گی۔ کیونکہ عورت خود حق میراث کو باطل کرنے پر راضی ہوئی ہے۔ اور (پہلے) تأخیر و التواء اسی کے حق کی بناء پر تھا (مگر جب اس نے اپنا حق خود ہی باطل کر دیا تو التواء بے معنی ہے)۔

مسئلہ : اگر عورت نے طلاق رجعی کا مطالبہ کیا مگر مرد نے تین بائن دے دیں تو (اس صورت میں خاوند کی وفات پر) عورت وارث ہوگی۔ کیونکہ طلاق رجعی سے نکاح کا (کلیۃً) ازالہ نہیں ہوتا۔ لہذا عورت کو طلاق رجعی کا مطالبہ کرنے پر اپنے حق کے بطلان پر راضی تصور نہیں کیا جائے گا۔

مسئلہ : اگر مرد نے مرض موت میں اپنی بیوی سے کہا : میں نے صحت کے دنوں میں تجھے تین طلاقیں دی تھیں اور تیری عدت بھی گزر چکی ہے۔ عورت نے مرد کے قول کی تصدیق کر دی۔ پھر شوہر نے اقرار کیا میرے ذمہ عورت کا کچھ قرض تھا یا شوہر نے اپنے مال سے اس کے لیے وصیت کر دی تو قرض یا وصیت سے جو رقم بھی کم ہوگی وہ عورت کو ملے گی۔ امام اعظمؒ قرض اور وصیت کے ساتھ میراث کو بھی شامل کرتے ہیں (کہ تینوں میں سے کم رقم دی جائے گی) مگر صاحبینؒ صرف قرض اور وصیت کے قائل ہیں۔

اگر مرد نے مرض میں عورت کے کہنے پر تین طلاقیں دیں ، پھر قرض کا اقرار کیا یا وصیت کر دی تو متفقہ طور پر قرض ، وصیت اور میراث میں سے جو کم ہو وہی ملے گا۔ امام زفرؒ اختلاف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قرض یا وصیت جس کا بھی اقرار کرے پورا پورا ملے گا۔ کیونکہ جب عورت کے مطالبے کی بناء پر حق میراث باطل ہوگیا تو اب اقرار و وصیت سے کوئی چیز مانع نہیں ہے (کیونکہ وراثت وصیت سے مانع ہوتی ہے مگر اب حق وراثت باطل ہوچکا ہے)

پہلے مسئلے میں صاحبینؒ اپنے قول کی یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ جب زوجین نے وقوع طلاق اور انقضاء عدت کو باھمی طور پر تسلیم کر لیا ، تو یہ عورت خاوند کے لیے ایک اجنبیہ کی طرح ہوگئی حتی کہ شوہر اس عورت کی بہن سے نکاح کر سکتا ہے (تو اب اقرار و وصیت بھی جائز ہے) اور (ایک وارث کو دوسرے وارث پر فضیلت دینے کی) تہمت کا بھی سوال نہ رہا ۔ کیا آپ کو تسلیم نہیں کہ اب عورت کے حق میں مرد کی گواہی قبول کی جا سکتی ہے اور وہ اسے زکاۃ دے سکتا ہے بخلاف دوسرے مسئلے کے کیونکہ ابھی عدت باقی ہے اور یہ تہمت کا سبب بھی بن سکتی ہے اور تہمت کے سبب پر حکم جاری کیا جا سکتا ہے (کہ مرد عورت کو خواہ مخواہ وصیت کرکے اسے دوسرے وارثوں پر فوقیت دے کر ان کا حق سلب کر رہا ہے) اور اسی بناء پر نکاح و قرابت پر حکم کا مدار ہے ۔ (جہاں قرابت و نکاح ہو

وہاں ضرور تہمت کا موقع پیدا ہو جاتا ہے اس لیے شہادت بھی قبول نہیں کی جاتی اور زکاۃ بھی نہیں دی جا سکتی) اور پہلے مسئلے میں عدت باقی نہیں رہتی (لہذا تہمت لگانے کا بھی کوئی موقع پیدا نہیں ہوتا) ۔

امام اعظمؒ دونوں مسئلوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ دونوں صورتوں میں امکان تہمت موجود ہے ۔ کیونکہ عورت کبھی اس غرض کے تحت بھی طلاق اختیار کر لیتی ہے کہ اقرار و وصیت کا دروازہ اس کے لیے واجب ہوجائے اور اس کے حق میں اضافہ ہوسکے ۔ بعض دفعہ میاں بیوی خفیہ طور پر سازش کرکے طے کر لیتے ہیں کہ وقوع طلاق اور انقضاء عدت کا اقرار کرلیں (تاکہ عورت کو میراث سے زیادہ رقم بذریعہ وصیت یا اقرار قرض مل سکے) تو یہ تہمت اضافے کے سلسلے میں ہے مگر ہم نے اضافے کو رد کر دیا ۔ میراث کی مقدار میں کوئی تہمت نہیں ۔ لہذا ہم نے مقدار میراث کو برقرار رکھا ۔ اس لیے قرض ، وصیت اور میراث سے جو بھی کم ہو اس کے دینے کا فیصلہ کیا جائے گا ۔ (صاحبینؒ نے اپنے مطلوب کے اثبات کے لیے جو مثال دی تھی اس کے جواب میں امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ) عموماً زکاۃ دینے ، بیوی کی بہن سے نکاح کرنے اور شہادت کے لیے اس قسم کی خفیہ تدابیر نہیں کی جاتیں ۔ لہذا ان صورتوں میں تہمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ (کیونکہ ایسے واقعات بہت کم پیش آتے ہیں کہ بیوی کو زکاۃ دینے یا اس کی بہن سے شادی

کرنے یا اس کی شہادت کو قابل قبول بنانے کے لیے میاں بیوی بائن ہونے کا اقرار کرلیں) ۔

مسئلہ : امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا : جو شخص دشمنوں کے محاصرے میں ہو یا لڑائی کی صف میں اور اپنی عورت کو تین طلاقیں دے دے تو عورت وراثت سے محروم رہے گی ۔ اگر مرد میدان جنگ میں کسی مقابل کے سامنے آیا ، یا قصاص میں قتل کرنے کے لیے پیش کیا گیا ، یا رجم کرنے کے لیے (میدان میں) لایا گیا ۔ (اور ان حالات میں وہ طلاق دے) تو عورت وارث ہوگی ۔ جب کہ مرد مارا جائے یا قتل کیا جائے ۔ اس کی دلیل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ جو شخص میراث سے بھاگنے کے لیے طلاق دے تو بدلیل استحسان عورت اس کی وراثت میں شریک ہوگی ۔ فرار (عن المیراث) کا حکم اسی وقت ثابت ہوسکتا ہے جب کہ عورت کا حق مرد کے مال میں ثابت ہو رہا ہو ۔ اور اس کا حق مرد کے مال سے اسی وقت متعلق ہو جائے گا جب مرد ایسے مرض میں مبتلا ہو جائے جس سے غالباً ہلاکت کا اندیشہ ہو ۔ جیسا کہ وہ مستقلاً صاحب فراش ہوجائے اور تندرست آدمی کی طرح اپنی ضروریات کو سر انجام نہ دے سکے ۔

گاہے فرار کا حکم ایسے امر سے بھی ثابت ہو جاتا ہے جو ہلاکت میں غالباً مرض الموت کے ہم معنی و مشابہ ہو ۔ مگر جس امر میں سلامتی اور بچاؤ کا پہلو غالب اور نمایاں

ہو اس سے فرار کا حکم ثابت نہ ہوگا۔ اب جو شخص قلعہ میں محصور ہو، یا جنگ کی صف میں کھڑا ہو اس کی سلامتی اور بچ نکلنے کا خیال زیادہ غالب ہوتا ہے۔ کیونکہ قلعہ عموماً دشمن کے ضرر اور نقصان سے بچاؤ کرتا ہے اور لشکر کے متعلق بھی یہی گمان ہوتا ہے (کہ اس قدر لشکر جرار اس کو دشمن کی مضرت سے بچا لے گا) لہذا ان دونوں صورتوں میں حکم فرار ثابت نہ ہوگا۔ مگر جو شخص عملی طور پر دشمن کے مقابلے میں سینہ سپر ہوگیا یا قصاص یا رجم کے لیے میدان میں لایا گیا تو ان صورتوں میں ہلاکت کا پہلو نمایاں ہے لہذا ایسے حالات میں (طلاق دینے سے) فرار ثابت ہوجانے کا اس مسئلے کی اور بھی کئی مثالیں ہیں جن میں مذکورہ اصول کا اجراء کیا جا سکتا ہے۔ (جیسا کہ کوئی شخص ایسے جنگل میں پھنس جائے جہاں مہلک قسم کے درندے ہوں، یا دریا کے وسط میں کشتی میں شگاف پڑ جائے، یا ہوائی جہاز کے انجن پرواز کے دوران خراب ہو جائیں تو ان تمام حالات میں طلاق دینے سے فرار ثابت ہوگا)۔

امام محمدؒ کا یہ قول "إن مات فی ذلك الوجه أو قتل" اگر اس بناء پر مر جائے یا قتل کر دیا جائے۔ اس امر کی دلیل ہے کہ اس سبب سے مرے یا اس سبب سے کوئی فرق نہیں (حکم فرار ثابت ہوگا) جیسا کہ ایک صاحب فراش کو جو بوجہ مرض صاحب فراش ہے قتل کر دیا جائے۔

مسئلہ : اگر صحت کی حالت میں خاوند نے اپنی بیوی

سے کہا : إذا جاء رأس الشهر أو إذا دخلت الدار أو إذا صلی فلان الظهر أو إذا دخل فلان الدار فأنت طالق" (یعنی جب مہینے کی ابتداء ہو یا جب تو گھر میں داخل ہو یا جب فلاں شخص ظہر کی نماز ادا کرے یا جب فلاں شخص گھر میں داخل ہو تو تجھے طلاق ہے) مگر ان سب امور کا وقوع اس وقت ہوا جب کہ خاوند بیمار تھا تو عورت (خاوند کی وفات پر) وارث نہ ہوگی اور اگر مذکورہ باتیں بحالت مرض ہوں تو عورت وارث ہوگی - سوائے ایک صورت کے جب مرد اسے (مرض میں) کہے :" "إن دخلت الدار" (کیونکہ اس صورت میں عورت اگر گھر میں داخل ہوئی تو اس نے اپنا حق اپنے اختیار سے ساقط کر دیا) -

اس مسئلے کی کئی صورتیں ہیں - پہلی یہ کہ طلاق کو کسی وقت کے آنے پر معلق کیا جائے - دوسری یہ کہ طلاق کو کسی اجنبی کے فعل سے معلق کرے تیسری یہ کہ اپنے فعل سے معلق کرے اور چوتھی یہ کہ عورت کے فعل سے معلق کرے - پھر ہر ایک کی دو دو صورتیں ہیں - اول یہ کہ تعلیق کرنا حالت صحت میں اور شرط کا وجود حالت مرض الموت میں ہوا دوم یہ کہ تعلیق اور وجود شرط دونوں حالت مرض میں ہوں -

اب پہلی دو صورتوں کو لیجیئے - یعنی (۱) جب تعلیق کا تعلق وقت سے ہو مثلاً یوں کہے کہ جب مہینے کی ابتداء ہو تو تجھے طلاق ہے (۲) جب تعلیق کسی اجنبی کے فعل

سے ہو مثلاً إذا صلی فلان الظهر أو إذا دخل فلان الدار (فأنت طالق)۔

اگر ان دو صورتوں میں تعلیق اور شرط بحالت مرض ہوں تو عورت کو میراث ملے گی ۔ اس حالت میں شوہر کی طرف سے فرار کا ثبوت ہو جاتا ہے کیونکہ اس نے تعلیق طلاق ایسی حالت میں کی جب کہ عورت کا حق اس کے مال سے متعلق ہو چکا تھا ۔

(۳ ، ۴) اگر مذکورہ دونوں صورتوں میں تعلیق بوقت صحت ہو اور وجود شرط بوقت علالت تو اسے میراث ہرگز نہیں ملے گی ۔ امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ اسے میراث ملے گی ، کیونکہ جو طلاق شرط سے معلق ہو وہ وجود شرط کے وقت اسی کیفیت میں واقع ہوتی ہے جو بغیر تعلیق کے (اسی وقت) دی جاتی ہے ۔ تو گویا مرد نے مرض الموت ہی میں طلاق دی ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ تعلیق سابق وجود شرط کے وقت حکماً طلاق بنتی ہے ، قصداً نہیں بنتی ۔ اور قصد کے بغیر ظلم ثابت نہیں ہوتا تو اس کا تصرف رد نہ ہوگا (یعنی مرد نے گویا حالت صحت میں طلاق دی) ۔

(۵ ، ۶) تیسری صورت یہ ہے کہ مرد طلاق کو اپنے فعل سے معلق کرلے ۔ اور تعلیق صحت میں ہو اور وجود شرط مرض میں یا دونوں مرض میں ہوں ۔ تو ہر دو صورت میں کوئی فرق نہ ہوگا ۔ اسی طرح اگر طلاق کو اپنے فعل

سے معلق کرائے جس سے اسے چارہ ہو (مثلاً فلاں وقت کھانا) یا اسے چارہ نہ ہو (مثلاً کھانا ، نماز ، رفع حاجت وغیرہ) تو بھی کچھ فرق نہیں - شوہر کو فرار کرنے والا مانا جائے گا کیونکہ اس میں عورت کے حق کو ساقط کرنے کا قصد پایا جاتا ہے - خواہ وہ مرض میں تعلیق کرے یا مرض میں شرط کو وجود میں لائے (کوئی خاص فرق نہیں پڑتا) کیونکہ اگر اسے فعل شرط سے چارہ نہیں تھا تو تعلیق نہ کرنے میں اسے ہزار طرح سے چارہ تھا (یعنی اس نے اپنے ایسے فعل سے طلاق کو معلق کیا جس سے اسے مفر نہ تھا تو اس نے کیوں ایسی تعلیق کی جس پر اسے کسی نے مجبور نہیں کیا تھا) لہذا مرد کا تصرف رد کر دیا جائے گا تا کہ عورت کو ضرر و نقصان سے بچایا جا سکے -

(۷ ، ۸) چوتھی صورت یہ ہے کہ طلاق کو عورت کے اپنے فعل سے معلق کیا جائے - اگر تعلیق اور وجود شرط دونوں حالت مرض میں ہوں اور فعل بھی ایسا ہو جس سے عورت بچ سکتی ہو - مثلاً کسی سے کلام کرنا یا کسی کے گھر جانا تو عورت وارث نہ ہوگی - کیونکہ اپنا حق ساقط کرنے میں اس کی رضاء پائی گئی -

لیکن اگر تعلیق عورت کے ایسے فعل سے کی گئی ہو جس سے گریز کی کوئی صورت نہیں - جیسے کھانا یا نماز یا ماں باپ سے بات چیت - تو ان افعال سے (طلاق واقع ہونے پر) عورت وراثت کی حقدار ٹھہرے گی - کیونکہ وہ ان

افعال کو کرنے پر مجبور تھی۔ اور ان مذکور افعال سے باز رہنے میں دنیا یا عاقبت کی ہلاکت و خسران کا اندیشہ تھا اور اضطرار کے ہوتے ہوئے رضاء کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اگر تعلیق صحت میں ہو اور شرط بحالت مرض پائی جائے اور فعل بھی ایسا ہو جس سے عورت بچ سکتی ہو تو عورت کے میراث میں حقدار نہ ہونے میں کوئی اشکال نہیں۔

لیکن اگر تعلیق ایسے فعل سے ہو جس سے عورت کے لیے بچنے کی کوئی صورت نہیں تو امام محمدؒ کے نزدیک وہی حکم ہے (کہ اسے میراث نہ ملے گی) امام زفرؒ کا بھی یہی قول ہے کیونکہ جب عورت کا حق مرد کے مال سے متعلق ہوچکا تو مرد کی طرف سے اس حق کو ساقط کرنے والی کوئی چیز نہیں پائی گئی۔ (لہذا مرد قصور وار نہ ہوگا) امام اعظمؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک عورت وارث قرار پائے گی) کیونکہ اس فعل کے نہ کرنے کی گنجائش نہ تھی لہذا مرد کی طرف سے زیادتی پائی گئی) کیونکہ شوہر ہی نے اسے عمل میں لانے پر مجبور کیا تھا۔ تو یہ فعل مرد کی طرف راجع ہوگا۔ کیونکہ اس کام میں عورت مرد کی آلۂ کار تھی جیسے اکراہ یا مجبوری کی حالت میں ہوتا ہے (مثلاً ا، اگر ب کو کسی مال کے تلف کرنے پر مجبور کرے تو ا مال کا ضامن ہوگا۔

مسئلہ: امام محمدؒ الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں کہ اگر شوہر نے حالت مرض میں تین طلاقیں دیں، پھر تندرست

ہوگیا ۔ مگر بعد میں مرگیا تو اب عورت وارث نہ ہوگی ۔

امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ وارث ہوگی ۔ کیونکہ مرد نے حالت مرض میں طلاقیں واقع کی تھیں ۔ اس لیے قصد فرار ثابت ہوگیا اور عورت عدت میں تھی جب کہ (وہ تندرست ہوکر) مرا ۔

لیکن ہماری دلیل یہ ہے کہ مرض کے بعد جب وہ صحت یاب ہوگیا تو وہ مرض بمنزلۂ صحت ہوگا ۔ کیونکہ اب اس کا مرض الموت ہونا باقی نہ رہا ۔ اور ظاہر ہوگیا کہ عورت کا کچھ حق بھی مرد کے مال سے متعلق نہیں ہوا ۔ اس لیے یہ تصور نہ کیا جائے گا کہ خاوند نے راہ فرار اختیار کی ۔

مسئلہ : اگر مرد نے عورت کو مرض موت میں طلاق دی ۔ پھر خدانخواستہ عورت مرتد ہوگئی ۔ اس کے بعد دوبارہ اسلام لے آئی ۔ اور شوہر اس مرض میں مر گیا تو عورت وارث نہ بن سکے گی ۔ البتہ اگر عورت مرتد نہ ہوئی لیکن خاوند کے بیٹے کو مجامعت پر راضی کرلیا تو وہ وارث ہوگی ۔

دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ عورت نے مرتد ہوکر وراثت کی اہلیت ضائع کر دی کیونکہ مرتد کسی (مسلمان) کا وارث نہیں ہوسکتا ۔ اور وراثت کی اہلیت کے بغیر وارثت باقی نہیں رہ سکتی ۔ مگر خاوند کے بیٹے کے ساتھ مجامعت کرنے سے اس کی اہلیت وارثت ضائع نہیں ہوتی ۔ کیونکہ محرمیۃ میراث کے منافی نہیں ہوتی (جیسا کہ مرد کی

ماں اور بہن وارث بنتی ہیں ۔ حالانکہ وہ اس کے لیے دائمی طور پر حرام ہیں) اور ہم صرف میراث ہی کو باقی رکھتے ہیں (کیونکہ عورت تو پہلے ہی مرد پر تین طلاقوں کی بناء پر حرام ہوچکی ہے) بخلاف اس صورت کے جب عورت قیام نکاح کی حالت میں خاوند کے بیٹے سے برضا مندی مجامعت کرے) تو بھی میاں بیوی میں جدائی ہوگی اور وہ وراثت سے محروم ہوگی) کیونکہ قیام نکاح کی حالت میں (خاوند کے بیٹے سے مجامعت کرنا) جدائی ثابت کر دیتا ہے ۔ پس عورت نے اپنا حق اپنی رضاء سے باطل کر دیا ۔ مگر تین طلاقوں کے بعد شوہر کے بیٹے کو جماع پر راغب کرنا حرمت والی فرقت پیدا نہیں کرتا کیونکہ جدائی تو پہلے تین طلاقوں سے پیدا ہوچکی ہے ، اس لیے دونوں صورتوں میں فرق ظاہر ہوگیا ۔

مسئلہ : جس شخص نے اپنی تندرستی کے زمانے میں عورت پر زنا کی تہمت لگائی ۔ اور لعان حالت مرض میں کیا تو عورت وارث ہوگی ۔ امام محمدؒ کے نزدیک وارث نہ ہوگی ۔ اگر مرض کے دوران تہمت لگائی ہو تو سب کے نزدیک وارث ہوگی ۔

مسئلے کی یہ صورت ایسی تعلیق سے منسوب ہے جس میں عورت کے لیے ایسا فعل کرنے سے کوئی چارہ کار نہیں ۔ کیونکہ عورت اپنی ذات سے زنا کی تہمت دور کرنے کے لیے دعوے کرنے پر مجبور ہے ۔ ہم اس کی توجیہ پہلے بیان

کرچکے ہیں (کہ مرد نے عورت کو جدائی کے لیے آلۂ کار بنایا اس لیے اس کی صورت اکراہ کی سی ہوگی) ۔

مسئلہ : اگر مرد نے صحت کی حالت میں عورت سے ایلاء کیا ۔ پھر ایلاء کی وجہ سے عورت بائنہ ہوگئی ۔ اور خاوند ابھی مریض تھا تو عورت وارث نہ بنے گی ۔ اگر ایلاء بھی مرض میں کیا ہو تو عورت وارث بنے گی ۔ کیونکہ ایلاء بھی طلاق کو معلق کرنے کے مترادف ہے جب کہ چار ماہ بغیر مباشرت کے گزر جائیں تو وہ تعلیق آنے والے وقت سے منسوب ہوجائے گی ۔ اور اس کی وجہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں (کہ تعلیق سابق تعلیق فی الحال ہوتی ہے) ۔

مصنف‍ؒ فرماتے ہیں کہ جس طلاق میں مرد کو رجوع کرنے کا اختیار ہو اس کی تمام صورتوں میں عورت وارث شمار ہوگی ۔ جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں ۔ کیونکہ رجعی طلاق سے نکاح زائل نہیں ہوتا حتی کہ مجامعت جائز ہوتی ہے تو سبب (یعنی عدت) قائم رہا ۔ اور جہاں کہیں بھی ہم نے عورت کے وارث ہونے کا ذکر کیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ صرف ایسی صورت میں وارث ہوگی جب اس کی عدت کے دوران ہی خاوند کی وفات ہو جیسا ابتداء باب میں اسے بیان کیا جا چکا ہے ۔

## بَابُ الرَّجْعَةِ

# رجوع کرنے کا بیان

مسئلہ : اگر خاوند نے اپنی بیوی کو ایک یا دو رجعی طلاقیں دے دیں تو اسے یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ عدت میں رجوع کرلے ۔ خواہ عورت اس پر راضی ہو یا نہ ہو کیونکہ اللہ تعالی کا ارشاد "فامسکوھن بمعروف" مطلق مذکور ہوا ہے (کہ عورت کی رضاء ہو یا نہ ہو) نیز عدت کا قیام ضروری ہے کیونکہ رجعت کے معنی ہیں ملک کو برابر قائم رکھنا (اور عدت گزر جانے کے بعد ملک نکاح قائم نہیں رہتی) کیا آپ اسے تسلیم نہیں کرتے کہ (قرآن کریم میں) رجعت کو امساك کہا گیا ہے ۔ اور امساك کے معنی باقی رکھنے کے ہیں اور ملک کا باقی رکھنا عدت ہی میں ہو سکتا ہے ۔ کیونکہ عدت گزر جانے کے بعد ملک نکاح باقی نہیں رہتی ۔

مسئلہ : رجعت اس طرح ہوتی ہے کہ مرد عورت کو مخاطب کرکے کہے کہ میں نے تجھ سے رجوع کیا ۔ (یا گواہوں کو مخاطب کرکے کہے) کہ میں نے اپنی بیوی سے رجوع کرلیا ۔ یہ الفاظ رجعت میں بالکل صریح ہیں اور ان میں ائمہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے ۔

مسئلہ : امام قدوری نے فرمایا : مرد اس سے مجامعت
کرے یا اسے چوم لے یا شہوت سے اسے مس کرے یا اس
کے فرج کی طرف شہوت سے نظر کرے (تو اس طرح بھی
رجعت ہو سکتی ہے) اور یہ تمام صورتیں احناف کے
نزدیک ہیں مگر امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جب کہنے پر
قدرت حاصل ہو تو بغیر کہے رجعت صحیح نہ ہوگی -
کیونکہ (امام شافعیؒ کے نزدیک) رجعت نکاح جدید کی طرح
ہے حتی کہ عدت کے دوران عورت سے مجامعت حرام ہے -
مگر ہمارے نزدیک رجعت استدامت نکاح کے حکم میں ہوتی
ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں اور آئندہ بھی اس کی
مزید وضاحت کی جائے گی - مرد کا فعل بھی اس کے نکاح کے
قائم ہونے کی اسی طرح دلیل بن سکتا ہے جیسا اختیار کے
ساقط کرنے میں (مثلاً کسی نے ایک گھوڑا تین دن کے
اختیار پر لیا مگر سواری کرنے کے بعد وہ کہیں اپنے کام
پر چلا گیا تو خیار ساقط ہوگیا ، اور بیع قائم ہوگئی - یا
کسی نے ایک باندی خیار پر خریدی اور اس سے وطی کرلی
تو خیار ساقط ہوگیا) - اور فعل کا دلیل رجعت ہونا ایسے
افعال سے ہوتا ہے جو نکاح کے ساتھ خاص ہوں اور یہ
مذکورہ افعال نکاح ہی سے خاص ہیں - خصوصاً آزاد عورت
کے حق میں - بخلاف اس مس اور نظر کے جو بغیر شہوت
ہوں - کیونکہ بغیر شہوت چھونا اور دیکھنا کبھی بغیر
نکاح کے بھی جائز ہوتا ہے جیسے دائی اور طبیب وغیرہ کا

(مس کرنا اور دیکھنا لہذا ایسا مس و نظر معتبر نہ ہوگا یا ان کے علاوہ دوسروں کا مس کرنا یا دیکھنا مثلاً ختنہ کرنے والے یا زنا کے گواہ کا) اور فرج کے علاوہ نظر پڑنے کا تو ایک جگہ پر رہنے والوں میں بھی بارہا اتفاق ہوجاتا ہے اور عدت کے دوران شوہر عورت کو ساتھ ہی رکھتا ہے لہذا فرج کے علاوہ دوسرے اعضاء پر نظر کرنے کو بھی اگر رجعت قرار دیں (تو خاوند چونکہ رجعت کا خواہاں نہیں) لہذا پھر اس کو طلاق دے گا اور عورت کی عدت خواہ مخواہ طویل ہوتی چلی جائے گی ۔

مسئلہ : امام قدوریؒ نے فرمایا : مستحب یہ ہے کہ رجعت پر دو گواہ قائم کرے ۔ اگر گواہ نہ ہوں تو بھی رجعت صحیح ہوگی ۔ امام شافعیؒ کے ایک قول کے مطابق اور امام مالکؒ کے نزدیک گواہ کے بغیر رجعت صحیح نہیں ۔ کیونکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے : ''واشھدوا ذوی عدل منکم'' (دو عادل گواہ قائم کرلو) اور امر وجوب کے لیے ہوتا ہے ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم کی نصوص گواہوں کی قید کے بغیر بھی ہیں ۔ (جیسے ''فامسکوھن بمعروف'' ۔ ''الطلاق مرتان فامساك بمعروف وبعولتھن أحق بردھن ۔ فلا جناح علیھما أن یتراجعا'' وغیرہ) نیز چونکہ رجعت نکاح کا باقی رکھنا ہے اور نکاح کو باقی رکھنے میں شہادت (اسی طرح شرط نہیں ہوتی جیسے ایلاء میں رجوع کرتے وقت شرط نہیں ہے ۔ ہاں گواہ قائم کرنا احتیاط کے پیش نظر مستحسن

ضرور ہے تاکہ لوگوں کو اس سے لاعلمی نہ رہے۔ اور امام شافعیؒ نے جو آیۃ بطور دلیل پیش کی ہے اس میں بھی امر استحباب پر محمول ہوگا۔ کیا آپ تسلیم نہیں کرتے کہ اس شہادت کو مفارقت کے ساتھ لایا گیا ہے (یعنی اس آیۃ میں جہاں رجعت کے ساتھ گواہوں کا ذکر ہے وہیں "فارقوھن" کے ساتھ بھی گواہوں کا ذکر ہے) حالانکہ بوقت مفارقت (طلاق) گواہ قائم کرنا مستحب ہے اور یہ بھی مستحب ہے کہ رجعت کے متعلق عورت کو بتا دے تاکہ وہ کسی معصیت میں مبتلا نہ ہوجائے (کہ عدت کے بعد وہ کسی اور کے پاس چلی جائے یا عدت ہی میں کسی دوسرے کے ساتھ وعدو مواعید کرنے لگے)۔

مسئلہ : جب عدت ختم ہو جائے اور مرد کہے کہ میں نے عدت ہی میں تجھ سے رجوع کرلیا تھا۔ عورت بھی تصدیق کر دے۔ تو یہ رجعت شمار ہوگی اور اگر وہ مرد کی بات کو جھٹلا دے تو عورت کی بات تسلیم کی جائے گی کیونکہ خاوند نے ایسی بات کی خبر دی ہے جس کو وہ فوری طور پر موجود کرنے کا مالک نہیں لہذا وہ اس میں متہم ہوگا (کہ اب عدت گزرنے کے بعد وہ کسی حیلے بہانے سے رجوع کرنا چاہتا ہے اور اس کا قول قابل قبول نہ ہوگا) البتہ عورت کے تصدیق کرنے سے تہمت رفع ہوجائے گی۔ امام اعظمؒ کے نزدیک عورت پر قسم واجب نہیں ہے اور یہ قسم لینے کا مسئلہ بھی چھ باتوں میں ہے جس کے متعلق کتاب النکاح میں بیان کیا جا چکا ہے۔

مسئلہ : اگر مرد نے عورت سے کہا میں نے تجھ سے رجوع کیا مگر عورت نے جواب دیتے ہوئے کہا میری عدت گزر چکی ہے تو امام اعظمؒ کے نزدیک رجعت صحیح نہیں ہوگی ۔ صاحبینؒ کہتے ہیں کہ رجعت صحیح ہوگی ۔ کیونکہ رجعت کا عدت سے اتصال پایا گیا (یعنی مرد نے رجوع پہلے کرلیا ہے) عورت نے بعد میں کہا ہے کہ میری عدت گزر چکی ہے کیونکہ بظاہر عدت اس وقت تک رہتی ہے جب تک کہ عورت عدت کے گزرنے کی خبر نہ دے ۔ مگر خبر دینے سے پہلے رجعت واقع ہوچکی ہے ۔ اسی بناء پر اگر مرد عورت سے کہے کہ میں نے تجھے (دوسری) طلاق دے دی ۔ مگر عورت جواب دے کہ میری عدت گزر چکی ہے تو طلاق واقع ہوجائے گی ۔

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ رجعت کا وقوع اختتام عدت کی حالت میں ہوا ہے کیونکہ عورت عدت گزرنے کی خبر دینے کی امین ہے ۔ جب اس نے شوہر کو اس کی خبر دی تو اس سے ثابت ہوا کہ عدت پہلے گزر چکی ۔ اور عدت گزرنے کی قریبی حالت وہی ہے جب مرد نے رجعت کی بات کی تھی تو (عدت پہلے گزری اور مرد کا کہنا بعد میں ہوا) اور مسئلہ طلاق میں بھی اسی طرح اختلاف ہے ۔ اگر ہم تسلیم بھی کرلیں کہ طلاق کا مسئلہ بلا اختلاف ہے (تو ہم کہتے ہیں کہ طلاق دینے میں اور رجعت میں فرق ہے) کیونکہ طلاق تو عدت گزرنے کے بعد شوہر کے اقرار سے

واقع ہوتی ہے مگر مراجعت اس کے اقرار سے ثابت نہیں ہوتی
(کیونکہ مراجعت کی صورت میں مرد متہم ہوسکتا ہے۔ اس
لیے عورت کی بات تسلیم کی جاتی ہے لیکن عورت خواہ عدت
گزرنے کے متعلق کچھ بتائے یا نہ بتائے) طلاق تو بہرصورت
مرد کے اختیار ہی میں ہوتی ہے۔

**مسئلہ :** جب باندی کے شوہر نے اس کی عدت گزرنے
کے بعد اسے کہا کہ میں نے عدت میں رجوع کرلیا تھا اور
مولی نے بھی اس کی تصدیق کی، لیکن باندی نے اس کی
تکذیب کر دی، تو امام اعظمؒ کے نزدیک باندی کا قول
قابل قبول ہوگا۔

صاحبینؒ کہتے ہیں کہ مولی کی بات مانی جائے گی
کیونکہ عدت گزرنے کے بعد عورت سے تمتع کے حق کا
مالک مولی ہی ہوتا ہے۔ لہذا مولی نے اپنے حق خالص کا
باندی کے شوہر کے لیے اقرار کیا اور یہ ایسے ہی ہوگا
جیسے کہ مولی باندی کے نکاح کا اقرار کرے (کہ یہ نکاح
میری اجازت سے ہوا ہے۔ ایسی صورت میں باندی کی بات
تسلیم نہیں کی جاتی بلکہ مولی کے قول پر عمل کیا جاتا ہے)۔

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ رجعت کا حکم (یعنی صحیح
ہونا یا نہ ہونا) عدت پر مبنی ہوتا ہے۔ اور عدت کے متعلق
باندی کا قول ہی قابل اعتماد ہوتا ہے (کیونکہ وہ اپنے
بارے میں امینہ ہے) تو اسی طرح جو بات عدت پر مبنی
ہوگی (اس میں باندی کا قول قابل اعتبار ہوگا)۔

اگر مذکورہ مسئلے کی صورت علی العکس ہو جائے (یعنی انقضاء عدت کے بعد شوہر نے عدت میں رجعت کا دعوی کیا اور باندی نے بھی تصدیق کر دی مگر مولی نے جھٹلا دیا) تو صاحبین[ؒ] کے نزدیک مولی کی بات مانی جائے گی ۔ اور صحیح روایت کے مطابق امام اعظم[ؒ] کا بھی یہی قول ہے ۔ کیونکہ فوری طور پر تو یہ باندی اپنی عدت گزار چکی ہے، اور مولی کے لیے باندی سے تمتع کرنا ظاہر اور ثابت ہے، تو مولی کی ملک کو باطل کرنے میں باندی کی بات تسلیم نہ کی جائے گی ۔ بخلاف پہلی صورت کے) کیونکہ امام اعظم[ؒ] کے نزدیک پہلی صورت میں مولی کی ملک ظاہر نہیں ہوئی تھی اور باندی کی بات تسلیم کرلی گئی تھی) کیونکہ مولی نے جب رجعت میں شوہر کی بات کی تصدیق کر دی تو اس سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ وہ رجعت کے وقت بھی قیام عدت کا قائل ہے اور عدت کے ہوتے ہوئے مولی ملک متعہ کا مالک نہیں بن سکتا ۔

مسئلہ : اگر باندی نے کہا کہ میری عدت گزر چکی ہے اور مولی اور خاوند نے کہا کہ تمہاری عدت ابھی نہیں گزری تو باندی کی بات تسلیم کی جائے گی کیونکہ وہ اپنے قول میں امینہ ہے اور عدت گزرنے کا علم اسے ہی ہوسکتا ہے ۔

مسئلہ : جب تیسرے حیض کا خون دس دن کے بعد منقطع ہوگیا تو مرد کا حق رجعت ختم ہوجائے گا ۔ اگرچہ عورت نے غسل نہ بھی کیا ہو ۔ لیکن اگر حیض کا خون

دس دن سے کم میں رک جائے تو جب تک عورت غسل نہ کرے یا ایک نماز کا پورا وقت نہ گزر جائے حق رجعت ختم نہ ہوگا ۔ کیونکہ حیض دس دنوں سے آگے نہیں بڑھتا ۔ تو (دس دن کے بعد) خون کے ختم ہوتے ہی وہ حیض سے فارغ قرار پائے گی ۔ اور عدت بھی پوری ہوجائے گی اور حق رجعت منقطع ہوگا ۔ مگر دس دن سے کم میں خون رک جانے کے بعد یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ شاید خون دوبارہ آنے لگے ۔ تو اس کے منقطع ہونے کا یقین ضروری ہے ۔ اور یہ یقین حقیقی غسل کر لینے سے حاصل ہوگا ۔ یا پاک عورتوں کے ساتھ کسی حکم میں شامل ہونے سے مثلاً ایک نماز کا وقت گزر جائے ۔ بخلاف اس صورت کے جب عورت کتابیہ ہو ۔ کیونکہ اس کے حق میں کسی اور زائد علامت کی توقع نہیں ۔ لہذا خون کے منقطع ہونے پر ہی اکتفا کیا جائے گا ۔

ابو حنیفہؒ اور ابو یوسفؒ کے نزدیک رجعت اس وقت منقطع ہوجائے گی جب عورت تیمم کرکے کوئی (نفلی یا فرض) نماز پڑھ لے ۔ یہ نماز پڑھنے کی قید بطور استحسان لگائی گئی ہے ۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ تیمم کرتے ہی رجعت ختم ہو جائے گی اور قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے ۔ کیونکہ جب پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہو تو تیمم کرنا مطلقاً طہارت ہوتا ہے (خواہ نماز ادا کرے یا نہ کرے) ۔ حتی کہ جو احکام

غسل سے ثابت ہوتے ہیں وہ تیمم سے بھی ثابت ہوجاتے ہیں۔ لہذا تیمم بمنزلۂ غسل ہوگا۔

شیخین؁ فرماتے ہیں کہ تیمم درحقیقت انسان کو پاک نہیں کرتا بلکہ آلودہ کرتا ہے (یعنی مٹی یا ریت سے تیمم کرنے سے ہاتھ منہ خاک آلود ہوجاتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ حقیقی طور پر طہارت حاصل نہیں ہوتی مگر شریعت میں) تیمم کو ضرورت کے مدنظر طہارت قرار دیا گیا تاکہ فرائض میں اضافہ نہ ہوتا رہے (مثلاً ایک شخص پندرہ دن تک غسل پر قادر نہ ہو تو اس کے ذمے (نمازوں کا ایک انبار لگ جائے گا)۔ نیز تیمم کی یہ ضرورت نماز کی ادائیگی کے وقت پیش آتی ہے نہ کہ نماز سے پہلے اوقات میں۔ (اس اعتراض کا کہ سجدۂ قراءۃ وغیرہ کے وقت بھی تیمم کیا جاتا ہے تو صرف نماز کے لیے کہاں ضروری رہا؟ جواب دیتے ہوئے صاحب ہدایہ فرماتے ہیں) کہ دوسرے جن امور کے لیے تیمم کا حکم ہے وہ بھی نماز کے مقتضی ہونے کی ضرورت سے ثابت ہوتے ہیں۔ (کیونکہ سجدۂ تلاوت قرآن یا دخول مسجد وغیرہ بھی نماز کے تقاضوں ہی سے ہیں)۔

نیز یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شیخین؁ کے نزدیک نماز شروع کرتے ہی رجعت منقطع ہوجائے گی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نماز سے فراغت کے بعد ہوگی تاکہ نماز کے جواز کا حکم مستحکم ہوجائے۔ (کیونکہ اگر نماز کے دوران پانی مل جائے تو تیمم باطل ہوجائے گا)۔

مسئلہ : جب عورت نے غسل کیا اور جسم کا کوئی ایسا عضو بھول گئی جس تک پانی نہیں پہنچا ۔ تو یہ حصہ اگر پورا عضو ہو یا اس سے زیادہ تو رجعت منقطع نہ ہوگی اور اگر پورے عضو سے کم حصہ ہو تو رجعت منقطع ہو جائے گی ۔ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ یہ مسئلہ بھی بطریق استحسان ہے ۔ ورنہ قیاس تو یہ چاہتا ہے کہ عضو کامل رہ جانے کی صورت میں بھی رجعت باقی نہ رہے ۔ کیونکہ اس نے اکثر حصۂ بدن دھو لیا ہے ۔ (وللاکثر حکم الکل) اور عضو سے کم حصہ رہ جانے کی صورت میں قیاس یہ ہے کہ رجعت باقی رہے ۔ کیونکہ جنابت (ناپاکی بدن) اور حیض کے حکم کی تقسیم نہیں ہوسکتی ۔ (مثلاً کہا جائے کہ اگرچہ ایک جزء کی جنابت باقی ہے مگر اکثر حصہ پاک ہوچکا ہے ۔ تو اس قسم کی تقسیم ممکن نہیں بلکہ ایک جزء کے رہ جانے سے مکمل جنابت باقی رہے گی) اور استحسان کی وجہ یہ ہے کہ اگر پورے عضو سے کم حصہ خشک رہ جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ شاید یہ حصہ اپنے کم ہونے کی بناء پر جلد ہی خشک ہوگیا ہو ۔ اس لیے پانی کے نہ پہنچنے کا یقینی حکم نہیں دیا جا سکتا ۔ تو ہم نے یہ فیصلہ کر دیا کہ اس صورت میں رجعت منقطع ہوجائے گی ۔ مگر دوسرے شوہر سے (ابھی) نکاح کرنا جائز نہ ہوگا تاکہ دونوں باتوں یعنی (انقطاع رجعت اور دوسرے نکاح) میں احتیاط پر عمل کیا جائے ۔ بخلاف عضو کامل کے ۔ عضو کامل جلد خشک نہیں

ہوتا (جب کہ باقی بدن تر ہے) اور نہ ہی (نہانے میں) عادۃً عضو کامل سے غفلت برتی جاتی ہے (اس سے عضو کامل اور عضو قلیل کا فرق واضح ہوگیا) لہذا دونوں مسائل جداگانہ نوعیت کے شمار ہوں گے۔

امام ابو یوسفؒ سے روایت ہے کہ کلی کرنا یا ناک میں پانی چڑھانا اگر چھوٹ جائے تو گویا پورا عضو چھوٹ گیا اور ان سے ایک دوسری روایت ہے جو کہ امام محمدؒ کی رائے بھی ہے کہ یہ دونوں عضو سے کم شمار ہوں گے۔ کیونکہ کلی کرنے اور ناک میں پانی چڑھانے کی فرضیت میں اختلاف ہے۔ بخلاف دیگر اعضاء کے (امام مالکؒ و امام شافعیؒ کے نزدیک غسل جنابت میں یہ دونوں سنت ہیں اور امام احمدؒ کے نزدیک فرض)۔

مسئلہ : جس شخص نے اپنی عورت کو طلاق دی اور عورت حاملہ تھی یا اس سے بچہ تولد ہوا۔ اور مرد نے کہا کہ میں نے اس عورت سے مجامعت ہی نہیں کی۔ تو اسے رجعت کا اختیار ہوگا۔ کیونکہ حمل کا ظہور جب اس قدر عرصے میں ہوجائے کہ اسے شوہر کا قرار دیا جا سکے تو اسی کا قرار دیا جائے گا۔ اسی سلسلے میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے الولد للفراش یعنی بچہ فراش والے کا ہوتا ہے اور یہ اس مرد کے وطی کرنے کی دلیل بھی بن جائے گا۔ (یعنی مرد نے عدم مباشرت کا جو دعوی کیا ہے وہ غلط ہے)۔

اسی طرح جب بچے کا نسب اس مرد سے ثابت ہوجائے تو مرد کو وطی کرنے والا شمار کیا جائے گا۔ لہذا جب وطی ثابت ہوگی تو ملک مستحکم ہوگی اور مستحکم ملک میں جو طلاق دی جائے اس کے بعد رجعت بھی ہوسکتی ہے اور اس کے دعوے کو (کہ میں نے وطی نہیں کی) شریعت تسلیم نہیں کرے گی۔ کیا آپ کے نزدیک یہ مسلم نہیں کہ ایسی وطی سے احصان ثابت ہو جاتا ہے (مثلاً اگر اس کے بعد زنا کرے تو اسے محصن آدمی کی طرح رجم کیا جائے گا) تو رجعت کا صحیح ہونا (اس وطی سے) بدرجۂ اولی ثابت ہوگا۔ اور مذکورہ مسئلے کی تاویل (یعنی صحیح صورت) یہ ہے کہ طلاق واقع ہونے سے پہلے بچہ جنے۔ کیونکہ اگر وقوع طلاق کے بعد بچے کی ولادت ہوئی تو عدت ولادت ہی سے ختم ہوجائے گی اور رجعت کا سوال ہی نہ رہا۔

مسئلہ : اگر مرد نے عورت کے ساتھ خلوت کی اور دروازہ بند کر دیا۔ یا پردہ لٹکا دیا۔ مگر کہا کہ میں نے مباشرت نہیں کی۔ پھر عورت کو طلاق دے دی تو اب رجعت کا مالک نہ ہوگا۔ کیونکہ ملک نکاح وطی سے متأکد اور مستحکم ہوتی ہے۔ لیکن خاوند عدم مباشرت کا اقرار کر رہا ہے تو اپنے بارے میں اس کی تصدیق کی جائے گی کیونکہ رجعت مرد ہی کا حق تھا (جو خود اس نے اپنے اقرار سے ساقط کر دیا) لہذا شریعت میں اسے جھٹلایا نہ جائے گا۔ بخلاف مہر کے (یعنی خلوت صحیحہ کے بعد عورت

مہر کی مستحق ہوجائے گی) کیونکہ مہر مسمی اسی وقت واجب ہوتا ہے جب عورت خود کو مرد کے سپرد کر دے۔ اس سے تمتع شرط نہیں ہے۔ بخلاف پہلی صورت کے (جب کہ عورت حاملہ تھی۔ یا اسے بچہ ہوچکا تھا کیونکہ اس صورت میں تو شریعت نے مرد کی تکذیب کر دی تھی اور وہ رجعت کر سکتا تھا۔ مگر اس صورت میں شریعت نے اس کی تکذیب نہیں کی۔ لہذا رجعت اس کے اپنے اقرار کی بناء پر ساقط ہوگئی)۔

مسئلہ: پھر اگر مرد نے (خلوت صحیحہ کے بعد) رجعت کرلی، اور کہا کہ میں نے اس سے مباشرت نہیں کی۔ پھر اس عورت کے دو برس سے ایک روز کم تک بچہ پیدا ہوا، تو رجعت صحیح ہوگی۔ کیونکہ اس بچے کا نسب اس مرد سے ثابت ہوجاتا ہے جب کہ عورت نے عدت کے گزرنے کا اقرار نہیں کیا اور بچے کا دو برس تک پیٹ میں رہنا ممکن ہے۔ لہذا مرد کو طلاق سے پہلے وطی کرنے والا مانا جائے گا نہ کہ طلاق کے بعد۔ کیونکہ دوسری صورت (یعنی طلاق کے بعد وطی کرنے کی صورت) میں طلاق واقع کرتے ہی ملک نکاح ختم ہوجاتی ہے اس لیے کہ طلاق سے پہلے وہ مدخولہ نہیں تھی۔ لہذا یہ (بعد کی وطی) حرام ہوگی۔ اور مسلمان حرام کام کا ارتکاب نہیں کرتا۔

مسئلہ: اگر مرد نے عورت سے کہا: ”جب تو بچہ جنے تجھ پر طلاق ہے“ اور عورت کے ہاں بچہ پیدا ہوگیا

(تو عورت پر طلاق واقع ہوجائے گی) پھر اس عورت کے ہاں دوسرا بچہ پیدا ہوگیا تو یہ رجعت شمار ہوگی یعنی دوسرا بچہ دوسرے پیٹ سے جنے اور وہ چھ ماہ کے بعد پیدا ہو اگرچہ دو سال سے زائد ہوجائے۔ بشرطیکہ عورت نے عدت کے گزر جانے کا اقرار نہ کیا ہو۔ کیونکہ پہلے بچے کی پیدائش کی وجہ سے عورت پر طلاق پڑ گئی اور عدت واجب ہوگئی تو دوسرا بچہ عدت ہی میں شوہر کے نئے تعلق سے پیدا ہوا۔ کیونکہ عورت نے عدت گزر جانے کا اقرار نہیں کیا لہذا شوہر کو رجوع کرنے والا قرار دیا جائے گا (کیونکہ اس نے رجوع کرکے ہی وطی کی تھی۔ یا وطی ہی سے رجوع ہوگیا تھا)۔

مسئلہ: اگر وہ اپنی بیوی سے کہے: "کلما ولدت ولداً فانت طالق"۔ جب کبھی تو نے بچہ جنا تجھے طلاق ہے۔ عورت نے الگ الگ بطن سے تین بچے جنے۔ تو پہلے بچے کی ولادت طلاق شمار ہوگی اور دوسرے کی ولادت سے رجعت کیونکہ دوسرا بچہ رجعت کی دلیل ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ دوسری طلاق بھی وارد ہوجائے گی) اور اسی طرح تیسرے کی ولادت پر دوسری طلاق سے رجعت ہوگی مگر تیسری طلاق واقع ہوجائے گی۔ کیونکہ جب عورت کے پہلا بچہ ہو تو اس پر پہلے بچے کی پیدائش سے طلاق واقع ہوگئی۔ اور عورت معتدہ ہوگئی (یعنی عدت گزارنے والی) اور دوسرے بچے کی ولادت سے رجوع ہوجائے گا۔ جیسا کہ ہم

بیان کر چکے ہیں کہ اس کا حمل اس وطی سے قرار پایا جو عدت کے اندر پائی گئی ۔ دوسرے بچے کے پیدا ہونے پر دوسری طلاق واقع ہوگی ۔ کیونکہ قسم میں ''کلما'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور عدت واجب ہوگی ۔ اور تیسرے بچے کی پیدائش سے مرد رجوع کرنے والا شمار ہوگا ۔ مگر ساتھ ہی اس تیسرے بچے کی ولادت سے تیسری طلاق بھی واقع ہوجائے گی اور عدت کا شمار حیض سے کیا جائے گا ۔ کیونکہ اس عورت پر جب طلاق واقع ہوئی تھی تو یہ حائضہ عورتوں میں سے حاملہ تھی ۔

مسئلہ : معتدہ عورتوں کے لیے کن امور کا جواز ہے ۔ جو عورت رجعی طلاق کی عدت گزار رہی ہو ۔ اسے اچھی طرح زیب و زینت کرنی چاہیے کیونکہ وہ اپنے خاوند کے لیے حلال ہے ۔ جب کہ نکاح دونوں میں قائم ہے اور رجعت کرنا بھی امر مستحب ہے اور عورت کا بناؤ سنگار مرد کو رجعت کی طرف مائل کرے گا ۔ لہذا سنگار کرنا شرعی طور پر درست ہوگا ۔

نیز شوہر کے لیے مستحب یہ ہے کہ وہ عورت کے پاس اچانک نہ جا دھمکے بلکہ اس سے اجازت لے یا اسے جوتوں کی آہٹ سے آگاہ کر دے ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ شوہر کے لیے یہ حکم اس حالت میں ہے جب کہ رجوع کرنے کا قصد نہ رکھتا ہو ۔ کیونکہ بسا اوقات عورت برہنہ تن ہوتی ہے اور مرد کی نظر بدن کے ایسے حصے پر پڑ سکتی ہے

کہ جس سے وہ رجوع کرنے والا قرار پائے اور پھر اسے طلاق دے ۔ کیونکہ اس طرح عورت کی عدت طویل ہوتی چلی جائے گی ۔

مسئلہ : شوہر کو یہ حق حاصل نہیں کہ اسے سفر پر ساتھ لے جائے جب تک کہ اس سے رجوع نہ کرے اور رجعت کے لیے گواہ بھی قائم کر دے ۔

امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ مرد کو اسے سفر پر لے جانے کا حق حاصل ہے ۔ کیونکہ نکاح ان کے مابین قائم ہے اس لیے ہمارے نزدیک مرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس سے مجامعت کر سکے ۔

ہماری دلیل ارشاد خداوندی ہے "لا تخرجوھن من بیوتھن" یعنی تم مطلقہ عورتوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالو ۔ دوسری بات یہ ہے کہ مرد کے رجوع کرنے کی رعایت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی طلاق کے اثر میں تراخی یعنی وقفہ کیا گیا ۔ لیکن جب عدت گزر گئی (اور مرد نے رجوع نہ کیا) تو معلوم ہوا کہ مرد کو اس کی کچھ حاجت نہیں ۔ لہذا یہ ظاہر ہوگیا کہ طلاق نے اپنا عمل اسی وقت سے شروع کیا جبکہ وہ وجود میں آئی تھی ۔ اس کو جو حیض آچکے ہوتے ہیں وہ عدت میں شمار کیے جاتے ہیں تو خاوند کو اسے باہر لے جانے کا اختیار نہ ہوگا ۔ صرف یہی صورت ہوگی کہ وہ اپنی رجعت پر گواہ قائم کرے تاکہ عدت ختم ہوجائے اور مرد کی ملک نکاح مستحکم ہوجائے ۔

امام محمدؒ کا قول ہے حتی یشهد علی رجعتها کہ گواہوں کا قائم کرنا مستحب ہے (واجب نہیں) اس کی تفصیل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ۔

مسئلہ : طلاق رجعی سے وطی حرام نہیں ہوتی ۔ امام شافعیؒ حرمت وطی کے قائل ہیں کیونکہ مرد و عورت کا ازدواجی تعلق طلاق سے زائل ہو جاتا ہے ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ زوجیت ہنوز قائم ہے حتی کہ شوہر عورت کی رضا مندی کے بغیر بھی رجوع کر سکتا ہے (اگر زوجیت باقی نہ ہوتی تو رجوع کے سلسلے میں عورت کی رضا مندی ضروری ہوتی) کیونکہ رجعت کا حق شوہر کی رعایت کو مدنظر رکھتے ہوئے ثابت ہے تاکہ ندامت محسوس کرنے پر شوہر کے لیے تدارک ممکن ہو (یعنی طلاق دینے کے بعد اگر وہ اپنے فعل پر نادم ہو تو رجوع سے اس کا تدارک کیا جا سکتا ہے) ورنہ حق رجعت تو ــ امام شافعیؒ کے قول کے مطابق ــ عورت پر ظلم شمار ہوگا (یعنی نکاح قطعاً باقی نہ رہا لیکن مرد نے پھر بھی رضا مندی کے بغیر ہی اس سے رجوع کرلیا) (استبداده به کا مطلب یہ ہے کہ مرد مراجعت کے معاملے میں مستقل اور منفرد حیثیت رکھتا ہے ۔ یہ نہیں کہ عورت کی رضا مندی حاصل کرکے رجوع کرسکے) اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رجعت کے معنے نکاح کو برابر رکھنے کے ہیں نہ کہ از سرنو نکاح کرنے کے ۔ کیونکہ دلیل مذکور اس کے منافی ہے (اور اگر نکاح ازسرنو نافذ قرار

دیا جائے تو عورت کی رضا مندی ضروری ہوتی ہے) نیز طلاق کا عمل سب کے نزدیک ایک مدت تک معرض التواء میں رہتا ہے یا شوہر کے حق کی رعایت پیش نظر ہوتی ہے جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے۔

## فَصْلٌ فِيمَا تُحِلُّ بِهِ الْمُطَلَّقَةُ

# ان امور کا بیان جن سے مطلقہ حلال ہو جاتی ہے

مسئلہ : جب تین سے کم بائن طلاقیں ہوں تو مرد کو اختیار ہوتا ہے کہ عدت کے اندر یا عدت کے بعد نکاح کرے کیونکہ عورت کی حلت اس کے لیے ابھی باقی ہے اور حلت کے ازالے کا مدار تیسری طلاق پر ہے (قرآن کریم میں تیسری طلاق کے متعلق ارشاد ہے : فان طلقها فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجاً غیره یعنی تیسری طلاق کے بعد ملک کلیۃً زائل ہوجاتی ہے) اور تیسری طلاق سے پہلے حلت زائل نہ ہوگی۔

دوسرے آدمی کو (عورت کی) عدت میں نکاح سے اس لیے منع کیا گیا ہے کہ نسب میں اشتباہ نہ پیدا ہو (کیونکہ مطلقہ اگر عدت ہی میں نکاح کرلے اور اسے حمل بھی ہو۔ اور دوسرے شوہر کے پاس جا کر اس کا بچہ پیدا ہو تو بچے کا نسب مشتبہ ہوجائے گا کہ کس کے نطفہ سے ہے۔ اس لیے عدت میں دوسرے کے ساتھ نکاح سے منع کر دیا گیا) مگر

پہلے شوہر کے متعلق عدت کے دوران یا بعد از عدت نکاح کرنے میں مطلقاً کوئی اشتباہ نہیں (کیونکہ اگر عورت حاملہ بھی ہوئی تو بچہ اسی مرد کے نطفہ سے ہوگا)۔

مسئلہ : اگر کسی آزاد عورت کو تین طلاقیں یا کسی باندی کو دو طلاقیں دے دی جائیں تو ایسی عورت اپنے شوہر کے لیے حلال نہ ہوگی جب تک کہ وہ دوسرے مرد سے نکاح صحیح نہ کرے اور وہ اس "عورت" کے ساتھ مجامعت نہ کرے پھر وہ اسے طلاق دے دے یا مر جائے اس کی دلیل اللہ تعالی کا یہ ارشاد ہے فان طلقها فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجاً غیره ۔ یعنی اگر مرد نے اپنی بیوی کو تیسری طلاق دے دی تو اس کے بعد وہ اس کے لیے حلال نہ ہوگی جب تک کہ دوسرے زوج سے نکاح نہ کرے اور لونڈی کو دو طلاقیں دینا آزاد عورت کو تین طلاقیں دینے کے برابر ہے کیونکہ غلامی جیسا کہ اصول کی کتابوں میں معروف ہے نعمت حلت کو نصف کر دیتی ہے۔

(صاحب ہدایہ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ قرآن کریم کی مذکورہ آیۃ میں تو فقط دوسرے مرد سے نکاح کرنا شرط ہے مگر آپ نے اس کے ساتھ دخول کا بھی اضافہ کر دیا ، فرماتے ہیں کہ) غایت کلام تو بظاہر دوسرے شخص کا مطلقاً نکاح کرنا ہے اور مطلق زوجیت نکاح صحیح سے ثابت ہوجاتی ہے (تو نکاح کا ثبوت عبارۃ النص یعنی ظاہر الفاظ سے ہوا) اور دخول کی شرط اشارۃ النص (یعنی مفہوم

کلام) سے ثابت ہوئی ۔ اور وہ اس طرح کہ نکاح بمعنی وطی
لیا جائے تاکہ کلام کا کوئی فائدہ بھی مترتب ہو محض
تکرار اوز اعادہ نہ ہو ۔ کیونکہ نکاح تو قرآنی لفظ زوج کے
مطاق بیان ہونے ہی سے معلوم ہوگیا (یعنی حتی تنکح زوجاً
غیرہ میں زوج کے لفظ ہی سے نکاح کا علم ہوجاتا ہے ۔
کیونکہ جب اس سے نکاح نہ کیا جائے تو اسے زوج کیسے کہہ
سکتے ہیں ۔ اب اگر تنکح سے بھی صرف نکاح ہی مراد لیں
تو یہ اعادہ و تکرار ہوگا ۔ لہذا صحیح مفہوم کے ظاہر
کرنے کے لیے نکاح بمعنی وطی لیں گے) ۔

ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ آیۃ کے ساتھ وطی کی
قید کا اضافہ حدیث مشہور کی بناء پر کرلیں گے ۔ آنحضرت ﷺ
نے فرمایا "لاتحل للأول حتی تذوق عسیلة الآخر" یعنی تین
طلاق یافتہ عورت پہلے خاوند کے لیے حلال نہ ہوگی جب تک
کہ دوسرے کا مزہ نہ چکھے ۔ اس بارے میں کئی روایات
منقول ہیں ۔ اور سوائے سعید ابن المسیب کے اس میں کسی
کا بھی اختلاف مذکور نہیں (وہ پہلے شوہر کی حلت کے لیے
صرف نکاح ہی کافی شمار کرتے ہیں) لیکن سعید ابن المسیب
کا یہ قول غیر معتبر ہے حتی کہ اگر کسی قاضی نے اس قول
کے مطابق فیصلہ کیا تو نافذ نہ ہوگا ۔

نیز حلت کے لیے دخول شرط ہے انزال ضروری نہیں ۔
کیونکہ انزال سے تو وطی کامل ہوجاتی ہے اور انزال کو
دخول میں مبالغے کی حیثیت حاصل ہوتی ہے لہذا کمال کی

قید زائد ہے۔ (اس لیے انزال شرط نہ ہوگا)۔

مسئلہ : بالغ ہونے کے قریب لڑکا بھی تحلیل میں بالغ کی طرح ہے۔ کیونکہ نکاح صحیح میں دخول پایا گیا اور نص سے یہی شرط معلوم ہوتی ہے۔

قریب البلوغ لڑکے کے بارے میں امام مالکؒ کا اختلاف ہے۔ مگر ہماری بیان کردہ دلیل ان پر حجت ہے۔

امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں "مراھق" کی تشریح اس طرح کی ہے کہ ایسا لڑکا جو ابھی بالغ نہیں ہوا (قریب البلوغ ہے) اور اس کی اس عمر کے لڑکے مجامعت کرتے ہیں۔ ایسے لڑکے نے عورت سے مجامعت کی تو عورت پر غسل واجب ہوگا اور وہ اس کو پہلے خاوند کے لیے حلال کردے گا امام محمدؒ کا مفہوم یہ ہے کہ لڑکے کے عضو میں انتشار ہو اور وہ جماع کا آرزومند ہو۔ اور عورت پر غسل اس لیے واجب ہوگا کہ دونوں کے اعضاء مل گئے۔ اور یہی عورت کے انزال کا سبب ہوتا ہے۔ اور غسل صرف عورت پر واجب ہوگا (کیونکہ وہ بالغہ ہے) لڑکے پر واجب نہ ہوگا۔ البتہ حسن اخلاق کی تعلیم کے مدنظر اسے بھی غسل کا حکم دیا جائے گا۔

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ اگر مولی اپنی مطلقہ باندی سے وطی کرے تو وہ پہلے شوہر کے لیے حلال نہ ہوگی۔ کیونکہ مقصود تو دوسرے خاوند کے ساتھ نکاح

کرنا ہے (اور مولی شوہر نہیں ہے) اگر دوسرا خاوند صرف تحلیل کی شرط کے ساتھ ہی نکاح کرے تو یہ مکروہ ہوگا (مکروہ سے مراد مکروہ تحریمی ہے) کیونکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے : حلالہ کرنے والے اور جس کے لیے حلالہ کیا گیا دونوں پر اللہ تعالی کی لعنت ہے ۔ اور اس حدیث کا مصداق یہی صورت ہے (کہ بغرض حلالہ نکاح کرے) ۔ ۔

مسئلہ : اگر دوسرا خاوند مجامعت کے بعد اسے طلاق دے دے تو وہ پہلے کے لیے حلال ہوجائے گی ۔ کیونکہ نکاح صحیح کے ساتھ دخول بھی پایا گیا ۔ اس لیے کہ فاسد شرطوں کے ساتھ نکاح فاسد نہیں ہوتا ۔

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ اس سے نکاح فاسد ہو جائے گا ۔ کیونکہ نکاح بشرط تحلیل نکاح موقت یعنی متعہ کی طرح ہے اور وہ پہلے شوہر کے لیے حلال نہ ہوگی کیونکہ یہ دوسرا نکاح فاسد تھا (اور حلت کے لیے نکاح صحیح کا ہونا ضروری ہے) ۔

امام محمد فرماتے ہیں کہ نکاح بشرط تحلیل درست تو ہوجائے گا مگر عورت پہلے خاوند کے لیے حلال نہ ہوگی ۔ کیونکہ شریعۃ نے جس چیز کو پہلے خاوند کے لیے التوا میں ڈال رکھا تھا شوہر ثانی نے اس میں عجلت اور جلد بازی سے کام لیا تو اس (جرم) کی سزا کے طور پر اسے حصول مقصود سے روک دیا جائے گا ۔ جیسا کہ کوئی شخص مورث کو

قتل کر دے (تو قاتل کو حق وراثت سے محروم کر دیا جاتا ہے)۔

مسئلہ : جب مرد آزاد عورت کو ایک یا دو طلاقیں دے اور عورت عدت گزار کر دوسرے سے نکاح کرلے۔ پھر طلاق لے کر پہلے خاوند کی طرف لوٹ آئے تو تین طلاقوں کا حق لے کر لوٹے گی۔ اور دوسرا شوہر تین سے کم طلاقوں کو بھی اسی طرح معدوم کر دے گا جیسا کہ وہ تین طلاقوں کو معدوم کر دیتا ہے (تو اب پہلا خاوند پھر تین طلاقوں کا مالک ہوگا) یہ صورت شیخینؒ کے نزدیک ہے۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ دوسرا شوہر تین سے کم طلاقوں کو معدوم نہیں کرتا کیونکہ نص قرآنی سے یہی ثابت ہے کہ دوسرا شوہر انتہاء حرمة کو معدوم کر دیتا ہے (جو تین طلاقوں سے پیدا ہوتی ہے) لہذا حرمة غلیظہ کے ثبوت سے پہلے اختتام و اعدام کے کیا معنی ؟

امام اعظمؒ اور امام ابو یوسفؒ کی دلیل آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے : لعن الله المحلل والمحلل له حضور ﷺ نے ایسے شخص کو محلل کا نام دیا ہے اور محلل وہی ہو سکتا ہے جو حلت کو ثابت کرے (تو دوسرا شوہر محلل ہے مطلقہ خواہ ایک طلاق سے ہو یا دو یا تین سے)۔

مسئلہ : جب خاوند نے بیوی کو تین طلاقیں دے دیں اور بیوی نے کہا میری عدت پوری ہو چکی ہے ، میں نے

دوسرے شوہر سے نکاح کر لیا تھا جس نے میرے ساتھ مجامعت کی ، پھر مجھے طلاق دے دی اور میری عدت بھی گزر چکی ہے ۔ تو اگر یہ مدت اتنی طویل ہو جس میں ان باتوں کا ہونا ممکن ہے تو مرد کے لیے اس کی تصدیق کرنا جائز ہے بشرطیکہ شوہر کے غالب گمان میں عورت کی صداقت کا پہلو راجح ہو عورت کی بات یا تو دنیوی معاملہ ہے یا امر دینی کیونکہ اس کے ساتھ حلت کا تعلق ہے اس لیے ان دونوں صورتوں میں خبر واحد مقبول ہو گی ۔ اور عورت کا یہ خبر دینا غیر مناسب نہیں جب کہ اتنی مدت بھی گزر چکی ہو جس میں ان تمام باتوں کا امکان موجود ہو ۔ اس سے کمتر مدت میں فقہاء کا اختلاف ہے جسے إن شاء الله باب العدة میں بیان کیا جائے گا ۔

# ایلاء کا بیان

مسئلہ : اگر مرد نے اپنی بیوی سے کہا : بخدا میں تیرے قریب نہیں جاؤں گا ۔ یا یوں کہا کہ بخدا میں چار ماہ تک تیرے قریب نہیں جاؤں گا تو یہ شخص ایلاء کرنے والا ہوگا ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو لوگ اپنی عورتوں سے ایلاء کرتے ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ وہ چار ماہ انتظار کریں ۔

مسئلہ : اگر مرد نے چار ماہ کے دوران مجامعت کر لی تو قسم میں حانث (یعنی قسم توڑنے والا) ہو جائے گا اور کفارہ ادا کرنا اس پر لازم ہوگا ۔ کیونکہ حانث ہونے سے کفارہ واجب ہو جاتا ہے نیز ایلاء ساقط ہو جائے گا حنث سے قسم ختم ہو گئی ۔

مسئلہ : اگر چار ماہ تک عورت سے مجامعت نہ کی تو عورت ایک طلاق کے ساتھ بائنہ ہو جائے گی ۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ عورت قاضی کے جدا کرنے سے جدا ہو گی کیونکہ مرد عورت کے حق جماع میں مانع ہے تو قاضی عورت کو نجات دلانے کے لئے مرد کے قائم مقام متصور ہوگا ، جس طرح کہ شوہر کے مجبوب اور نامرد ہونے کی صورت میں قاضی کو یہ حق حاصل ہوتا ہے ۔

امام شافعی رح کے جواب میں ہماری دلیل یہ ہے کہ مرد نے عورت کو اس کے حق جماع سے محروم کر کے اس پر ظلم کیا۔ تو شریعت نے اسے یہ سزا دی کہ مدت مقررہ (یعنی چار ماہ گزرنے کے بعد مرد سے نعمت نکاح زائل کر دی۔ یہی قول حضرت عثمان رض، حضرت علی رض عبداللہ بن عمر رض، عبداللہ ابن عباس رض، عبداللہ بن مسعود رض اور زید بن ثابت رض سے منقول ہے اور ان بزرگوں کی راہ نمائی ہمارے لیے کافی ہے۔

ہماری دوسری دلیل یہ ہے کہ ایلاء جاہلیت میں طلاق کا حکم رکھتا تھا مگر شریعۃ اسلامیہ نے اس کی حد ایک معین مدت کے گزرنے تک مقرر کردی۔

مسئلہ: اگر مرد نے چار ماہ کی قسم کھائی ہو تو (چار ماہ کے بعد) قسم پوری ہوگی۔ کیونکہ قسم اتنی ہی مدت کے ساتھ موقت تھی۔ اور اگر مرد نے ہمیشہ کے لیے قسم کھائی ہو تو قسم باقی رہے گی کیونکہ اب قسم مطلق ہے (یعنی اس کے ساتھ وقت معین کی کوئی قید نہیں) اور حنث (قسم کا توڑنا) بھی نہیں پایا گیا جس سے قسم ختم ہو جائے۔ البتہ یہ ضرور ہوگا کہ نکاح سے پہلے طلاق بار بار واقع نہ ہو گی (یعنی یہ نہیں ہوگا کہ ہر چار ماہ کے بعد ایک طلاق واقع ہوتی چلی جائے۔ کیونکہ نکاح تو پہلی طلاق ہی سے زائل ہو جائے گا جو چار ماہ کے بعد واقع ہوگی اور جدائی کے بعد اب عورت کو اس کے حق سے محروم رکھنا (زوج کی طرف سے) نہیں پایا گیا۔

مسئلہ : اگر مرد نے عورت کے بائنہ ہونے کے بعد رجوع کر لیا اور اس سے پھر نکاح کر لیا تو ایلاء بھی لوٹ آئے گا۔ پھر (چار ماہ کے اندر) اس سے مجامعت کر لی (تو قسم ٹوٹ جائے گی اور کفارہ لازم آجائیگا) ورنہ چار ماہ گزرنے کے بعد دوسری طلاق واقع ہو جائے گی۔ کیونکہ قسم اپنے مطلق ہونے کی وجہ سے باقی ہے اور دوبارہ نکاح کرنے سے عورت کا حق جماع بھی ثابت ہو چکا ہے۔ اس لیے مرد کا ظلم ثابت ہو جائے گا (کہ اس نے عورت کو حق ملنے سے محروم رکھا ہے۔) نیز اس ایلاء کی مدت نکاح کے وقت سے شمار کی جائے گی۔

مسئلہ : اگر مرد نے تیسری بار اس عورت سے نکاح کر لیا تو ایلاء پھر لوٹ آئے گا۔ اور مزید چار ماہ گزرنے پر تیسری طلاق واقع ہو جائے گی بشرطیکہ مرد نے عورت سے مجامعت نہ کی۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اب اگر دوسرے خاوند سے شادی کرنے کے بعد عورت پھر پہلے خاوند سے نکاح کر لے تو اس ایلاء کی وجہ سے کوئی طلاق واقع نہ ہوگی۔ کیونکہ ایلاء صرف پہلی ملک کے ساتھ مقید تھا (اور اب پہلی ملک ختم ہو کر از سر نو شروع ہوئی ہے) اور یہ اختلافی مسئلہ "مسئلۂ تنجیز" کی ایک فرع ہے جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے (اور یہ باب الایمان فی الطلاق میں مذکور ہوا ہے۔ ھدایہ مجتبائی ۲۶۹) البتہ قسم اب بھی باقی ہے کیونکہ وہ مطلق ہے اور ابھی تک حنث (قسم کا

توڑنا) بھی واقع نہیں ہوا۔ جب مرد اس عورت سے مباشرت کرے گا تو قسم کا کفارہ دے گا کیونکہ حنث پایا گیا۔

مسئلہ : اگر مرد چار ماہ سے کم مدت کی قسم کھائے تو مولی (ایلاء کرنے والا) شمار نہ ہوگا۔ کیونکہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا قول ہے کہ چار ماہ سے کم مدت میں ایلاء واقع نہیں ہوتا۔ کیونکہ مدت کے اکثر حصہ میں مرد کا عورت سے مجامعت سے رکنا کسی مانع کے بغیر ہے (لہذا ایلاء واقع نہ ہوگا) اور اسی طرح حکم طلاق بھی ثابت نہ ہوگا (مثلاً مرد نے ایک ماہ کی قسم کھائی تو باقی تین ماہ میں مجامعت سے کوئی امر مانع نہیں ہے اس لیے حکم طلاق کیسے ثابت ہو سکتا ہے)۔

مسئلہ : اگر مرد ان الفاظ کے ساتھ قسم کھائے : واللہ لا أقربك شهرين وشهرين بعد هذين الشهرين۔ بخدا میں دو ماہ اور دو ماہ کے بعد مزید دو ماہ تیرے قریب نہ آؤں گا) تو مرد ایلاء کرنے والا قرار پائے گا۔ کیونکہ اس نے اپنے کلام میں حرف جمع (یعنی واؤ) استعمال کیا ہے تو گویا کہ اس نے تمام مدت ایک ہی لفظ میں جمع کر کے کہہ دی (جیسا کہ چار ماہ کہہ دے)۔

مسئلہ : (اگر پہلے دن صرف اتنا کہے کہ دو ماہ تک تیرے قریب نہ آؤں گا) اور پھر ایک روز کا وقفہ کرے۔ اور کہے کہ بخدا پہلے دو ماہ کے بعد مزید دو ماہ بھی قربت نہ کروں گا۔ تو ایسے ایلاء کرنے والا نہ مانیں گے

کیونکہ قول ثانی تو نیا اعلان ہے - (پہلے قول کے ساتھ اس کا تعلق نہیں) کیونکہ پہلی قسم کے بعد اس کے لیے عورت سے دو ماہ کے لیے مجامعت منع ہو گئی تھی اور دوسری قسم سے چار ماہ کے لیے مجامعت منع ہو گئی ، سوائے ایک دن کے جس میں وہ خاموش رہا - تو مدت منع (یعنی چار ماہ) مکمل نہ ہو سکی -

مسئلہ : اگر مرد نے عورت سے کہا : "واللہ لا أقربك سنة إلا يوماً" (بخدا میں ایک سال تک تیرے نزدیک نہیں جاؤں گا سوائے ایک دن کے) تو ایلاء کرنے والا شمار نہ ہوگا بخلاف امام زفر" کے - وہ ایک دن کے استثناء کو سال کے آخر سے جا ملاتے ہیں اور اس کا قیاس اجارے کے مسئلے پر کرتے ہیں (جیسے کوئی کہے کہ میں نے یہ مکان ایک دن کم سال کے لیے کرایہ پر دیا تو اس دن کا تعلق سال کے اختتام سے ہوگا) اس لیے مدۃ ممنوعہ (یعنی چار ماہ) پوری ہو جائے گی (اور ایلاء واقع ہو جائے گا) -

ہماری دلیل یہ ہے کہ ایلاء کرنے والا وہ ہوتا ہے جو کسی چیز کو اپنے اوپر لازم کیے بغیر (یعنی کفارہ وغیرہ) چار ماہ تک عورت کے قریب نہ جا سکے اور اس صورت میں مرد کے لیے کسی شے کے لازم کئے (عورت سے مجامعت کرنا ممکن ہے کیونکہ مستثنیٰ کوئی مقرر نہیں ، بلکہ عام ہے (جس دن بھی وہ وطی کرے گا وہی دن مستثنی قرار دیا

آخر سال کی طرف اس لیے منسوب کیا جاتا ہے کہ معاہدۂ اجارہ صحیح ہو جائے۔ اگر اجارہ میں دن کو نکرہ (غیر معین) مانا جائے تو عقد اجارہ قطعاً صحیح نہ ہوگا۔ لیکن قسم کی یہ صورت نہیں (بلکہ دن غیر معین ہوتے ہوئے بھی قسم درست ہو سکتی ہے)۔

مسئلہ: اگر مرد نے مذکورہ صورت میں کسی دن عورت سے مجامعت کر لی اور باقی مدت چار ماہ یا اس سے زائد رہ گئی تو ایلاء کرنے والا ہو جائے گا کیونکہ اب استثناء ساقط ہو چکا ہے۔

مسئلہ: اگر مرد بصرہ میں تھا اور اس نے کہا: بخدا میں کوفہ میں ہرگز داخل نہ ہوں گا اور اس کی عورت بھی کوفہ میں تھی تو (اس قسم سے) وہ ایلاء کرنے والا ثابت نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کے لیے اپنے اوپر کوئی شے لازم کئے بغیر عورت کو کوفہ سے باہر لے جا کر اس سے مجامعت کرنا ممکن ہے۔

مسئلہ: مصنفؒ فرماتے ہیں: کہ مرد نے اگر حج یا روزہ یا صدقہ یا غلام آزاد کرنے یا طلاق دینے کی قسم کھائی تو وہ ایلاء کرنے والا شمار ہوگا (مثلاً اس نے بیوی سے کہا کہ اگر تجھ سے مجامعت کروں تو مجھ پر حج لازم ہوگا، یا ایک ماہ کے روزے کیونکہ مجامعت سے باز رہنا قسم کی وجہ سے ہے اور یہ شرط و جزاء کا بیان کرنا ہی قسم کہلاتا ہے اور جزاء کی یہ صورتیں مرد کے لیے قربت

یعنی جماع سے مانع ہیں ۔ کیونکہ ان کو پورا کرنے میں مشقت اور تکلیف ہے (کہ اسے یا تو حج کے اخراجات برداشت کرنا پڑیں گے ۔ یا روزے رکھنے ہوں گے) اور عتق کے ساتھ قسم کھانے کی صورت یہ ہے کہ عورت سے مجامعت کے ساتھ غلام کا آزاد کرنا معلق کرے ۔

اس مسئلے میں امام ابو یوسفؒ کا اختلاف ہے ۔ وہ فرماتے ہیں کہ مرد غلام کو بیچ کر عورت سے قربت کر سکتا ہے ۔ اس صورت میں اس کے ذمے کچھ لازم نہ ہوگا ۔ مگر طرفینؒ کہتے ہیں کہ فروختگی ایک امر موہوم ہے معلوم نہیں غلام بک سکے یا نہ بک سکے ۔ لہذا اس بارے میں وہ قربت سے مانع ہوگی (اور قربت سے مانع ہونا ہی ایلاء ہے کیونکہ ایلاء بھی جماع سے مانع ہوتا ہے) اور طلاق کے ساتھ قسم کھانے کی صورت یہ ہے کہ مرد اس کی طلاق کو یا اس کی سوت کی طلاق کو مجامعت کے ساتھ معلق کرے اور یہ دونوں باتیں قربت سے مانع ہیں (لہذا ایلاء ہو جائے گا) ۔

مسئلہ : اگر مرد ایسی عورت سے ایلاء کرے جسے رجعی طلاق دی گئی ہو تو مرد کو ایلاء کرنے والا شمار کیا جائے گا ۔ لیکن اگر مطلقہ بائنہ سے ایلاء کرے تو ایلاء ثابت نہ ہوگا ۔ کیونکہ پہلی صورت میں رشتۂ زوجیت قائم ہے اور دوسری میں نہیں ۔ اس لئے کہ نص قرآنی سے یہ ثابت ہے کہ ایلاء صرف بیویوں ہی سے ہو سکتا ہے لہذا اگر مدت

ایلاء کے گزرنے سے پہلے عدت ختم ہو گئی تو ایلاء ساقط ہو جانے کا کیونکہ ایلاء کا محل ہی نہ رہا۔

مسئلہ : اگر مرد نے کسی اجنبی عورت سے کہا : بخدا میں تجھ سے قربت نہیں کروں گا یا تو مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے - پھر وہ اس سے نکاح کر لے تو وہ نہ تو ایلاء کرنے والا شمار ہوگا نہ ظہار کرنے والا ہی - کیونکہ ایسا قول اپنے آغاز ہی میں باطل ہو گیا اور اجنبی عورت (ایلاء یا ظہار کا) محل ہی نہیں تھی - لہذا اس کے بعد ایسا قول پلٹ کر صحیح نہیں ہو سکتا (کہ نکاح کرنے کے بعد اسے صحیح قرار دیں اور ایلاء یا ظہار کا حکم لگا دیں -

البتہ جب مرد نے عورت سے مجامعت کر لی تو اسے کفارہ دینا پڑے گا - کیونکہ قسم کا توڑنا پایا گیا اور مرد کے حق میں قسم بہر حال منعقد ہو ہی چکی ہے -

مسئلہ : باندی کی مدت ایلاء دو ماہ ہے کیونکہ چار ماہ کی مدت تو بائن ہونے کے لیے مقرر کی گئی تھی ، لیکن اس کے باندی ہونے کی وجہ سے یہ مدت آدھی ہو گئی جس طرح کہ عدت کی مدت (نصف ہو جاتی ہے) -

مسئلہ : اگر ایلاء کرنے والا مرد اس قدر بیمار ہو کہ بیوی سے مجامعت کرنے کی قدرت ہی نہ رکھے یا عورت ہی بیمار ہو یا پیدائشی طور پر اس کے اعضاء جڑواں ہوں (جس سے مجامعت ممکن نہ ہو) یا اتنی کمسن ہو کہ اس سے مجامعت

نہ ہو سکے ۔ یا میاں بیوی دونوں کے درمیان اتنی مسافت ہو کہ مدت ایلاء کے ختم ہونے سے پہلے پہلے وہاں پہنچ نہ سکے ۔ (اور مرد رجوع بھی کرنا چاہتا ہو) تو رجوع کا طریقہ یہ ہے کہ مرد مدت ایلاء کے اندر اندر یہ کہہ دے کہ میں نے مدت ایلاء کے اندر اندر اپنی بیوی کی طرف رجوع کیا ۔ چنانچہ اگر مرد نے یہ الفاظ کہہ دیئے تو ایلاء ساقط ہو جائے گا ۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مجامعت کے بغیر رجوع نہیں ہو سکتا اور امام طحاویؒ کی رائے بھی یہی ہے ۔ کیونکہ اگر یہ (زبانی کہنا رجوع ہوتا تو حنث یعنی قسم توڑنا بھی ثابت ہو جاتا ہے (حالانکہ زبانی رجوع سے کفارہ واجب نہیں ہوتا) جب تک جماع نہ کرے ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ مرد نے جماع سے رکنے کا ذکر کر کے ہی عورت کو تکلیف و ایذاء دی تھی ۔ تو اب عورت کو راضی کرنا بھی اسی طرح ہوگا کہ اس کے ساتھ زبان سے وعدہ کرے ۔ نیز جب ظلم کا ازالہ ہو گیا تو اسے طلاق کی سزا نہیں دی جائے گی ۔ (یعنی مرد اگر بیمار ہو اور رجوع پر قادر نہ ہو تو اب زبانی رجوع کر سکتا ہے کیونکہ اس نے زبان ہی سے ایلاء کے الفاظ کہہ کر اسے پریشان کیا تھا اور اب زبان ہی سے اسے راضی کر لیا) ۔

**مسئلہ :** ہاں اگر مدت ایلاء میں (زبانی رجوع کے بعد) جماع پر قادر ہو جائے تو زبانی رجوع باطل ہو جائے گا

اور اس کا رجوع جماع ہی سے ہو سکے گا ۔ کیونکہ وہ اصل رجوع یعنی جماع پر قادر ہو چکا ہے ۔ پیشتر اس کے کہ وہ اس کے نائب یعنی زبانی اقرار سے اپنے مقصد کو حاصل کر لے ۔

مسئلہ : اگر خاوند نے اپنی بیوی سے کہا تو مجھ پر حرام ہے تو مرد سے اس کی نیت کے بارے میں پوچھا جائیگا (کہ ان الفاظ سے اس کا مقصد کیا تھا) اگر کہے کہ میں نے جھوٹ کا ارادہ کیا تھا تو یہ اس کے کہنے کے مطابق ہوگا کیونکہ اس نے کلام کے حقیقی معنی مراد لیے۔ فقہاء کا کہنا ہے کہ عدالت میں اس کی تصدیق نہ کی جائے گی کیونکہ یہ الفاظ ظاہر طور پر قسم پر دلالت کرتے ہیں ۔

مسئلہ : اگر مرد نے کہا کہ میں نے طلاق کی نیت کی تھی تو ایک بائن طلاق ہو جائے گی ۔ ہاں مگر تین کی نیت کرے (تو تین واقع ہونگی) ۔ اس کی تفصیل کنایات میں گزر چکی ہے ۔

مسئلہ : اگر خاوند نے کہا کہ ان الفاظ سے میں نے ظہار مراد لیا تھا تو ظہار ہی کا حکم لگایا جائے گا ۔ ظہار کے قائل شیخین[رح] ہیں ۔ مگر امام محمد[رح] فرماتے ہیں کہ ظہار نہیں ہوگا۔ کیونکہ ان الفاظ میں محرمات کے ساتھ کوئی تشبیہ نہیں ہے جب کہ تشبیہ کا ہونا ظہار میں رکن کی حیثیت رکھتا ہے ۔

شیخین[رح] کی دلیل یہ ہے کہ مرد نے مطلقاً حرام کہا اور

ظہار بھی ایک قسم کی حرمت ہوتی ہے اور مطلق میں مقید کا احتمال ہوتا ہے (لہذا مطلق حرام سے ظہار والی حرمت بھی مراد لی جا سکتی ہے) -

مسئلہ : اگر خاوند کہے کہ میں نے صرف تحریم مراد لی تھی یا میں نے اس کے ساتھ کسی چیز کا بھی ارادہ نہیں کیا تھا - تو مرد کا یہ قول قسم شمار ہوگا اور مرد ایلاء کرنے والا قرار پائے گا - کیونکہ حلال چیز کو حرام کرنا ہی ہمارے نزدیک اصل میں قسم ہوتا ہے - اور ہم إن شاء اللہ باب الایمان میں اس کا ذکر کرینگے - اور بعض مشائخ لفظ تحریم کو جب کہ اس کے ساتھ کوئی نیت نہ ہو ، طلاق شمار کرتے ہیں - کیونکہ عرف میں اسی طرح مراد لیا جاتا ہے - واللہ اعلم بالصواب -

# خُلع کا بیان

مسئلہ : جب میاں بیوی میں باہم جھگڑا ہو جائے اور دونوں کو یہ اندیشہ ہو کہ اب وہ اللہ تعالی کی مقرر کردہ حدود قائم نہ رکھ سکیں گے تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ عورت کچھ مال دے کر مرد سے گلو خلاصی کرا لے اور مرد اس مال کے بدلے اسے خلع دے دے۔ اللہ تعالی کے ارشاد کے مطابق فلا جناح علیہما فیما افتدت بہ ۔ کہ میاں بیوی دونوں پر کوئی گناہ نہیں اگر عورت مرد کو کچھ دے کر اپنی گلو خلاصی کرا لے ۔

مسئلہ : جب مرد نے ایسا کر لیا تو خلع سے ایک بائن طلاق واقع ہوگی اور عورت کے ذمے مال ادا کرنا واجب ہو جائے گا ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ خلع طلاق بائن ہے ۔

دوسری بات یہ ہے کہ خلع میں طلاق کا احتمال ہوتا ہے ۔ حتی کہ خلع لفظ سے کنایہ مراد لیا جا سکتا ہے اور کنایہ سے ہمیشہ بائن طلاق ہوتی ہے (ہاں کنایات طلاق میں نیت بھی ضروری ہے) مگر خلع میں مال کا ذکر کر دینے سے نیت کی ضرورت نہیں رہتی ۔

تیسری بات یہ ہے کہ عورت صرف اسی مقصد کے لیے اپنے ذمے مال واجب کرتی ہے کہ اس کی ذات اس کے قبضہ میں ہو جائے اور یہ جبھی ہو سکتا ہے۔ جب وہ بائن ہو جائے۔

مسئلہ : اگر نفرت و مخالفت مرد کی جانب سے ہو تو اسے عورت سے عوض میں مال لینا مکروہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدلنا چاہتے ہو، اگرچہ تم پہلی کو ڈھیر کے برابر (مال بھی دے چکے ہو) تو اس سے کچھ نہ لو۔ کیونکہ مرد نے اس عورت کو چھوڑ کر دوسری بیوی لانے کی وجہ سے اسے پریشان کر دیا ہے اب اس سے مال لے کر اس کی پریشانیوں میں مزید اضافہ نہ کرے۔

مسئلہ : اگر نفرت عورت کی جانب سے ہو تو بھی ہمارے نزدیک یہ مکروہ ہے کہ مرد اس مال سے زیادہ عورت سے وصول کرے جتنا اس نے عورت کو دیا ہے۔ الجامع الصغیر کی ایک روایت میں ہے کہ دیے ہوئے سے زیادہ لینا بھی جائز ہے کیونکہ مذکورہ بالا آیۃ مطلق بیان ہے (یعنی فلا جناح علیہما فیما افتدت بہ میں اضافہ وغیرہ کے نہ لینے کی کوئی شرط نہیں ہے) اور دوسری روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ آپ نے ثابت بن قیس بن شماس کی عورت کے متعلق فرمایا کہ اس میں کوئی زیادتی مناسب نہیں۔ کیونکہ نفرت و مخاصمت اسی کی طرف سے تھی (تاہم ایسا لینا فقط مباح ہے)۔

مسئلہ : اگر مرد نے مہر سے زیادہ لے لیا تو قانوناً جائز ہوگا۔ اسی طرح اگر نشوز بھی مرد کی طرف سے ہو تو بھی اضافے کو قانوناً جائز قرار دیں گے کیونکہ جو آیۃ ہم نے پیش کی ہے دو چیزوں کا تقاضا کرتی ہے : ایک تو حکماً جائز ہونا اور دوسرا مباح ہونا ۔ تو معاوضہ کی بناء پر اباحت والا عمل ترک کر دیا جائے گا اور باقی آیت پر عمل برقرار رہے گا۔ (یعنی فلا جناح فیما افتدت بہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زیادہ لینے میں کوئی گناہ نہیں مباح ہے ۔ مگر فلا تأخذوا منہ شیئاً سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نہ لیا جائے تو دیانۃً اباحت کو ترک کر دیں گے اور قضاء جواز باقی رکھیں گے) ۔

مسئلہ : اگر مرد نے مال کے عوض طلاق دی (مثلاً اپنی عورت سے کہا أنت طالق بألف درہم) اور عورت نے قبول کر لی تو طلاق واقع ہو جائے گی اور عورت کے ذمے مال لازم ہو جائے گا۔ کیونکہ شوہر کو فی الحال (یعنی اس وقت) معلق طلاق دینے کا مستقلاً اختیار ہے اور مذکورہ صورت میں اس نے طلاق کو عورت کی قبولیت سے معلق کیا ہے ۔ ادھر عورت چونکہ اپنے آپ پر اختیار رکھتی ہے تو اسے اپنے ذمے مال لازم کرنے کا بھی اختیار ہے اور ملک نکاح ایک ایسی چیز ہے جس سے عوض لینا مباح ہے اگرچہ وہ مال نہ ہو ۔ جیسے قصاص (کہ قصاص) اگرچہ مال نہیں مگر قصاص کے عوض مال یعنی دیت لی جا سکتی ہے ۔ (اسی

طرح اگر عورت نے مال کے عوض طلاق لے کر اپنی آزادی حاصل کر لی تو جائز ہوگا) ۔

مسئلہ : مذکورہ بالا مسئلے میں طلاق بائن ہوگی ۔ اس کے متعلق ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ۔ نیز صورت (خلع) مال کے عوض کاو خلاصی کرانا ہوتا ہے ۔ تو جب مرد ایک بدل (یعنی مال) کا مالک بن جاتا ہے تو دوسرے بدل یعنی نفس کی مالکہ عورت ہو جائے گی تاکہ دونوں میں مساواۃ ثابت ہو ۔

مسئلہ : امام قدوری[۲] فرماتے ہیں : اگر خلع میں عوض از قسم باطل ہو مسلمان آدمی شراب یا خنزیر یا مردار کے عوض خلع کرے تو خاوند کو کچھ نہ ملے گا اور طلاق بائن واقع ہو جائے گی ۔ لیکن اگر طلاق میں عوض باطل ہو طلاق رجعی واقع ہوگی ۔ (مثلاً مرد نے عورت سے کہا کہ میں ایک من شراب کے عوض تجھ سے خلع کرتا ہوں اور عورت نے قبول کر لیا تو طلاق بائن واقع ہو جائے گی اور مسلمان مرد کو کچھ نہ ملے گا ۔ لیکن اگر عورت سے کہا کہ میں ایک من شراب کے عوض تجھے طلاق دیتا ہوں اور عورت نے قبول کر لیا تو عوض باطل ہو جائے گا لیکن طلاق رجعی واقع ہو جائے گی) ۔ البتہ دونوں صورتوں میں طلاق کا واقع ہونا عورت کے قبول کرنے پر منحصر ہے (اگر عورت پیشکش قبول کر لے تو طلاق واقع ہوگی ورنہ نہیں) دونوں طلاقوں کی نوعیت میں اختلاف (کہ ایک صورت میں

بائن ہوتی ہے اور دوسری میں رجعی) اس لیے کہ جب
معاوضہ باطل ٹھہرا تو پہلی صورت میں عمل کرنے والا لفظ
خلع ہے اور یہ کنایہ ہے (کنایات سے واقع ہونے والی طلاق
بائن ہوتی ہے) اور دوسری صورت میں (طلاق کا) لفظ صریح
عامل ہے اور لفظ صریح سے طلاق رجعی واقع ہوتی ہے - نیز
عورت کے ذمے کوئی چیز واجب نہ ہوگی کہ وہ شوہر کو
ادا کرے - کیونکہ عورت نے کسی با قیمت مال کا نام نہیں
لیا تھا کہ اسے مرد کے حق میں دھوکا باز کہا جائے -

دوسری دلیل یہ ہے کہ عورت نے معاوضے کے لیے جس
چیز کا نام لیا ہے وہ اسلام کی وجہ سے قابل قبول نہیں ہو
سکتی اور مذکورہ چیز کے علاوہ کوئی دوسری چیز بھی
عورت کے ذمے لازم نہیں کی جا سکتی - کیونکہ عورت نے
کسی اور چیز کا ذمہ نہیں لیا - البتہ جب شوہر نے کسی
معین سر کے (کے مٹکے) کے عوض خلع کیا - اور بعد میں
ظاہر ہوا کہ وہ شراب ہے (تو اس صورت میں اسے اتنی مقدار
میں سر کہ دینا لازم ہوگا) کیونکہ عورت نے مال کا تعین
کیا تھا - لہذا اس طرح شوہر دھوکے میں آ گیا - البتہ جب
کوئی شخص اپنے غلام کو شراب کے عوض آزاد کرے یا
مکاتب بنائے تو صورت میں مالک غلام کی قیمت وصول
کرے گا (مسلمان ہونے کی بناء پر وہ شراب نہیں لے سکتا)
کیونکہ مولی کی ملکیت با قیمت چیز ہے وہ اس ملک کو
مفت میں زائل کرنے پر رضا مند نہیں ہوا - رہا عورت سے

تمتع کا حق رکھتا تو وہ طلاق سے خارج ہونے کی صورت میں با قیمت مال نہیں رہتا ۔ اس کی تفصیل ہم عنقریب بیان کریں گے ۔ بخلاف شراب کے عوض نکاح کرنے کے (کیونکہ وہاں مہر لازم آتا ہے) اور عورت سے تمتع کا حق رکھنا با قیمت شمار کیا جاتا ہے ۔

اس میں راز یہ ہے کہ عورت سے تمتع قابل احترام ہے اور شریعۃ اسلامیہ نے بغیر عوض کے اس کا مالک بننا روا نہیں رکھا تاکہ اس کے شرف و احترام کا اظہار ہو سکے ۔ رہا شوہر کے عورت سے تمتع کے حق کو زائل کرنا تو وہ بھی از خود قابل احترام ہے ۔ لہذا مال واجب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں جو چیز مہر بننے کی صلاحیت رکھتی ہے وہ خلع میں بطور معاوضہ بھی قبول کی جا سکتی ہے ۔ کیونکہ جو چیز با قیمت حق تمتع کا عوض بن سکتی ہے بدرجۂ اولی اس چیز کا عوض بھی بن سکتی ہے جو با قیمت نہ ہو (یعنی شوہر کے حق تمتع زائل کرنے کا عوض بھی بدرجۂ اولی بن سکتی ہے) ۔

مسئلہ : اگر بیوی نے شوہر سے کہا کہ جو مال میرے ہاتھ میں ہے اس کے عوض مجھ سے خلع کر لو ۔ مرد نے تسلیم کر لیا مگر عورت کے ہاتھ میں کچھ نہ تھا تو عورت کو اپنا مہر مرد کو واپس کرنا پڑے گا ۔ کیونکہ جب عورت نے مال کا نام لیا تو معلوم ہوا کہ شوہر عوض کے

بغیر اپنی ملک زائل کرنے پر رضامند نہ تھا اور عورت نے جس عوض کا نام لیا ہے نہ تو اس کے لازم کرنے کی کوئی صورت ہے اور نہ اس کی قیمت ہی لازم کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ وہ تو معلوم ہی نہیں اور عورت پر حق تمتع کا معاوضہ یعنی مہر مثل بھی لازم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ملک کے ازالے پر حق تمتع بالقیمت متصور نہیں ہوتا۔ صرف ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ مرد نے جتنا کچھ (مہر) ادا کیا تھا وہی عورت پر واجب کر دیا جائے تاکہ شوہر کے نقصان کا ازالہ ہو سکے۔

مسئلہ : اگر کسی عورت نے شوہر سے کہا کہ میرے ہاتھ میں جو درہم ہیں (من دراہم کا لفظ استعمال کرے یا من الدراھم کا) ان کے عوض مجھ سے خلع کر لے۔ شوہر نے خلع کر لیا لیکن عورت کے ہاتھ میں کچھ نہ تھا تو عورت کو تین درہم دینے پڑیں گے۔ کیونکہ عورت نے اپنے قول میں جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے اور جمع میں کم از کم تین فرد ہوتے ہیں۔ اور کلمۂ "من" اس کلام میں بیانیہ ہے، بعضیہ نہیں۔ کیونکہ "من" کے بغیر کلام میں خلل واقع ہوتا ہے (اور یہ قانون ہے کہ جس کلام میں "من" کے نکالنے سے خلل واقع ہو، وہاں "من" بیانیہ ہوتا ہے نہ کہ بعضیہ)۔

مسئلہ : اگر عورت ایسے غلام پر خلع کرے جو بھاگا ہوا ہو اور یہ شرط بھی لگا دے کہ اس غلام کی مجھ پر

کوئی ضمانت نہ ہوگی (تو عورت کی یہ شرط باطل ہوگی اور) وہ ضمانت سے بری نہ ہوگی ۔ نیز اگر غلام اس کے ہاتھ لگ گیا تو عورت کو وہی غلام ادا کرنا پڑے گا ورنہ معذور ہونے کی صورت میں اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی ۔ کیونکہ خلع باہمی معاوضے کا معاملہ ہے اور اس کا تقاضا یہی ہے کہ جو شے معاوضہ ٹھہرائی گئی ہے اسے سپرد کیا جائے اور عورت کے اپنے آپ کو غلام کی ضمانت سے بری کرنے کی شرط فاسد ہے لہذا باطل ہوگی ۔ لیکن خلع فاسد شرطوں سے باطل نہیں ہوتا اور نکاح میں بھی یہی صورت ہوتی ہے (کہ اگر مرد بھاگے ہوئے غلام کو مہر ٹھہرائے اور اپنے آپ کو اس کی ضمانت سے بری قرار دے تو بری نہ ہوگا ۔ نکاح منعقد ہو جائے گا لیکن اسے غلام یا اسکی قیمت ادا کرنا پڑے گی)۔

**مسئلہ :** اگر عورت نے شوہر سے کہا کہ مجھے ایک ہزار کے عوض تین طلاقیں دے دو ۔ لیکن مرد نے صرف ایک طلاق دی تو عورت پر ہزار کی ایک تہائی واجب ہوگی ۔ کیونکہ جب عورت نے ہزار کے عوض تین طلاقوں کا مطالبہ کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ہر طلاق ہزار کے ایک تہائی حصے کے عوض مانگی ۔ اور یہ ثابت ہے کیونکہ حرف "ب" معاوضے کے لیے آتا ہے اور عوض اپنے متبادل پر تقسیم ہو جاتا ہے (اسی طرح ہزار درہم اپنے معوض یعنی تین طلاقوں پر تقسیم ہو جائیں گے) اور یہ طلاق بائن ہوگی کیونکہ اس کے عوض میں مال واجب ہوا ہے ۔

مسئلہ : اگر عورت نے کہا کہ مجھے ایک ہزار پر تین طلاقیں دے دو ۔ مرد نے ایک طلاق دے دی (تو یہ طلاق رجعی تو واقع ہو جائے گی لیکن) امام اعظمؒ کے نزدیک عورت پر کچھ واجب نہ ہوگا اور مرد طلاق سے رجوع کرنے کا مالک ہوگا۔ صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ ایک بائن واقع ہو جائے گی اور عورت کو ہزار کا تہائی ادا کرنا پڑے گا۔ صاحبینؒ کی دلیل یہ ہے کہ حرف "علی" بھی معاوضہ کے معاملات میں حرف "ب" کی طرح ہوتا ہے۔ کیونکہ 'ب' اور 'علی' کو لوگ ایک ہی معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ چیز ایک درہم کے عوض اٹھالے یا ایک درہم پر اٹھالے تو دونوں کا مفہوم ایک ہے۔

امام اعظمؒ کی دلیل یہ ہے کہ حرف "علی" شرط کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ارشاد باری ہے : "یبایعنك علی أن لا یشرکن باللہ شیئاً"۔ یعنی یہ عورتیں آپ سے شرط اس پر بیعت کریں کہ اللہ تعالی کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی ۔ اس طرح جو شخص اپنی عورت سے کہے "أنت طالق علی أن تدخلی الدار"(یعنی تجھے طلاق ہے بشرطیکہ تو گھر میں داخل ہو) تو یہاں بھی "علی" کا استعمال شرط کے لیے ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "علی" کا حرف در حقیقت لزوم کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن استعارۃً اسے شرط کے لیے استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ شرط اپنی جزاء کے ساتھ لازم ہوتی ہے۔ جب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ کلمۂ "علی" شرط

کے لیے ہے تو مشروط اپنی شرط کے اجزاء پر تقسیم نہیں ہوا کرتا بخلاف "ب" کے ۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ وہ عوض کے لیے ہے اور جب مال واجب نہ ہوا تو شوہر کی طرف سے یہ ابتدائی طلاق ہوگی اور اسے رجوع کرنے کا اختیار ہوگا ۔

مسئلہ : اگر شوہر نے بیوی سے کہا کہ تو اپنے آپ کو بعوض ایک ہزار کے یا ہزار پر تین طلاقیں دے سکتی ہے ۔ مگر عورت نے اپنے آپ کو ایک طلاق دی تو کچھ بھی واقع نہ ہوگا ۔ کیونکہ شوہر اسے بائنہ کرنے پر اسی وقت رضامند ہو سکتا ہے جب کہ اسے پورے ایک ہزار وصول ہوں ۔ بخلاف اس کے جب عورت درخواست کرے کہ مجھے ایک ہزار کے عوض تین طلاقیں دے دے (اور مرد ایک دے تو یہ واقع ہو جائے گی) کیونکہ عورت جب ہزار درہم کے عوض بائنہ ہونے پر رضامند ہے تو ہزار کے بعض حصے یعنی ایک تہائی پر بائنہ ہونے میں بدرجہ اولی راضی ہوگی ۔

مسئلہ : اگر شوہر نے بیوی سے کہا کہ تجھے ہزار درہم پر طلاق ہے ۔ اور عورت نے یہ پیش کش قبول کرلی تو اس پر طلاق واقع ہو جائے گی اور اسے ہزار درہم ادا کرنے ہوں گے اور اس مسئلے کی صورت وہی ہے جیسا کہ اسے یوں کہے کہ تجھے بعوض ہزار درہم کے طلاق ہے ۔ "علی الف" یا "بالف" دونوں صورتوں میں عورت کا

قبول کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ ''بألف'' سے مراد یہ ہے کہ بعوض ایک ہزار کے جو میری طرف سے تجھ پر واجب ہوں گے۔ اور ''ہزار پر'' سے مراد یہ ہے کہ ایسے ہزار کی شرط پر جو کہ میری طرف سے تجھ پر لازم ہوں گے۔ اور (دوسرے فریق) کے قبول کئے بغیر عوض واجب نہیں ہو سکتا۔ اور جس چیز کے ساتھ شرط لگا دی جائے وہ اسی وقت لازم ہوتی ہے جب کہ شرط پائی جائے۔ نیز یہ طلاق بائن ہوگی۔ اس کی دلیل پہلے مذکور ہو چکی ہے (کیونکہ یہ طلاق معاوضہ کی وجہ سے واقع ہو رہی ہے اس لیے بائن ہوگی تاکہ مرد کو مال اور عورت کو اپنی ذات پر کامل اختیار حاصل ہو۔ نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ خلع سے طلاق بائن واقع ہوتی ہے)۔

مسئلہ: اگر شوہر نے بیوی سے کہا ''أنت طالق وعليك ألف'' یعنی تجھے طلاق ہے اور تجھ پر ہزار (درہم) ہیں۔ عورت نے پیش کش قبول کرلی۔ یا اپنے غلام سے کہا: ''أنت حر وعليك ألف'' غلام نے اس بات کو تسلیم کر لیا تو وہ آزاد ہو جائے گا۔ اور (پہلی صورت میں) عورت پر بھی طلاق واقع ہو جائے گی۔ امام اعظمؒ کے نزدیک غلام اور عورت پر کچھ بھی ادا کرنا واجب نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر دونوں قبول نہ بھی کریں (تو بھی طلاق و عتاق واقع ہو جائے گا اور انہیں کچھ نہ دینا پڑے گا)۔

صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ اگر وہ پیش کش قبول کرلیں

تو انہیں ہزار ہزار دینا پڑے گا اور اگر قبول نہ کریں تو نہ طلاق واقع ہوگی اور نہ عتاق ۔ صاحبین کی دلیل یہ ہے کہ یہ کلام ''وعلیك ألف'' معاوضے کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔ چنانچہ یہ کہنا کہ اس سامان کو اٹھا کر لے چل اور تیرے لیے ایک درہم ہے ۔ بمنزلہ اس قول کے ہوگا کہ یہ سامان بعوض ایک درہم کے اٹھا کر لے چل ۔

امام اعظم کی دلیل یہ ہے کہ "علیك ألف" مکمل جملہ ہے لہذا جب تک ہمارے پاس کوئی دلیل نہ ہو اسے ماقبل سے مربوط نہیں کر سکتے ۔ کیونکہ جملے کی اصلی خصوصیت یہی ہے کہ وہ مستقل ہو اور مذکورہ صورت میں ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل موجود نہیں (جس کی بناء پر اسے ماقبل سے مربوط مانا جائے) اور طلاق و عتاق کا وقوع مال کے بغیر بھی ممکن ہے ۔ البتہ بیع اور اجارے کی صورت اس سے قطعاً مختلف ہے کیونکہ یہ دونوں بغیر مال کے نہیں پائے جا سکتے (اور آپکی پیش کردہ مثال میں کہ یہ سامان اٹھا کر لے چل اور تجھے ایک درہم ملے گا ۔ تو یہ درہم کرائے کا ہے لہذا اس میں "ولك درهم" ما قبل سے مربوط ہوگا) ۔

مسئلہ : اگر شوہر نے اپنی بیوی سے کہا کہ تجھے ہزار درہم پر طلاق ہے اس شرط پر کہ تین دن تک مجھے اختیار حاصل ہو یا تجھے اختیار حاصل ہو ۔ عورت نے منظور کر لیا اگر شوہر نے اپنے لیے اختیار رکھا تو وہ باطل ہوگا

(اور عورت پر طلاق واقع ہو جائے گی) اور یہ خیار اگر عورت کے لیے ہو تو جائز ہے اگر عورت نے تین دن کے اندر اختیار واپس کر دیا تو طلاق باطل ہو جائے گی۔ لیکن اگر اس نے اختیار واپس نہ کیا تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ اور عورت پر ہزار درہم کی ادائیگی واجب ہوگی ۔ یہ صورتیں امام اعظمؒ کے نزدیک ہیں ۔

صاحبینؒ فرماتے ہیں دونوں صورتوں میں (جب اختیار مرد کے لیے ہو یا عورت کے لیے) اختیار (کی یہ شرط) باطل ہے ۔ طلاق واقع ہو جائے گی اور عورت کو ہزار درہم ادا کرنے ہوں گے ۔ کیونکہ اختیار تو معاملے کے منعقد ہونے کے بعد اسے رد کرنے کے لیے ہوتا ہے ۔ معاملے کے انعقاد میں خیار کا کوئی دخل نہیں ہوتا ۔ (جیسا کہ بیع بالخیار کا کا انعقاد جائز ہوتا ہے) اور اس صورت میں شوہر کا پیشکش کرنا اور عورت کا قبول کرنا دونوں تصرف ایسے نہیں ہیں کہ ٹوٹ سکیں ۔ کیونکہ شوہر کی طرف سے خلع کرنا یمین ہے (اس لیے کہ اس کے کلام میں شرط و جزاء موجود ہے) اور زوجہ کی طرف سے قبول کرنا شرط ہے (اور یہ قابل فسخ امور نہیں ہیں) ۔

امام اعظمؒ کی دلیل یہ ہے کہ خلع عورت کی طرف سے بمنزلہ بیع کے ہے حتی کہ وہ رجوع بھی کر سکتی ہے (یعنی اگر عورت مرد سے کہے کہ ایک ہزار کے عوض طلاق دے دو تو مرد کے قبول کرنے سے پہلے پہلے عورت

رجوع کر سکتی ہے) اور مجلس خلع کے بعد اس کا توقف نہیں ہوتا (یعنی اگر عورت خلع کا ایجاب کرے اور مرد اس مجلس میں نہ ہو بلکہ اسے دوسری مجلس میں پتا چلے تو اب مرد کو قبول کرنے کا حق نہ ہوگا اور خلع باطل ہو جائے گا) تو خلع میں خیار کی شرط لگانا درست ہوگا۔ رہا شوہر کی جانب تو خلع قسم ہے حتی کہ شوہر ایک دفعہ پیشکش کرنے کے بعد رجوع نہیں کر سکتا۔ اور مجلس کے بعد تک متوقف ہوتا ہے (یعنی اگر مرد خلع کی پیشکش کرے اور عورت اس محفل میں موجود نہ ہو۔ اسے دوسری مجلس میں علم ہو تو پھر بھی اس پیش کش کو قبول کر سکتی ہے) اور قسم میں خیار جائز نہیں ہے (یمین سے مراد تصرف لازم ہے جس سے رجوع نہ ہو سکے) جو صورت عورت کی طلاق میں ہے وہی غلام کے عتاق میں ہوگی (یعنی غلام کی طرف سے درخواست بمنزلہ بیع ہوگی اور مالک کی طرف سے یمین یعنی تصرف لازم ہوگا۔ مالک کے قبول سے پہلے غلام کو رجوع کا اختیار ہوگا مگر مالک کو رجوع کا اختیار حاصل نہ ہوگا)۔

مسئلہ: اگر کسی شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں نے ہزار درہم پر کل تجھے طلاق دے دی تھی لیکن تو نے قبول نہیں کیا تھا۔ بیوی نے کہا میں نے قبول کر لیا تھا۔ تو شوہر کی بات تسلیم کی جائے گی۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے دوسرے سے کہا کہ میں نے یہ غلام ہزار

درہم کے عوض کل تیرے پاس فروخت کر دیا تھا لیکن تو نے قبول نہیں کیا ۔ دوسرے نے کہا ۔ نہیں میں نے تو قبول کر لیا تھا ۔ تو خریدار کی بات مانی جائے گی ۔ ان دونوں صورتوں میں وجہ فرق یہ ہے کہ مال کے عوض میں طلاق دینا مرد کی طرف سے یمین (شرطیہ قسم) ہے تو قسم کا اقرار کرنا شرط کے پائے جانے کا اقرار نہیں ہوگا ۔ کیونکہ قسم تو وجود شرط کے بغیر صحیح ہو سکتی ہے لیکن بیع قبول کے بغیر مکمل نہیں ہوتی ۔ جب بائع نے بیع ہونے کا اقرار کیا تو ایسی چیز کا اقرار بھی کیا جس کے بغیر بیع مکمل نہیں ہوتی (یعنی قبول کا قول) تو اب مشتری کے قبول سے انکار کرنا اپنے اقرار سے انکار ہے ۔ (یہ تو تھا ھدایہ کی عبارت کا ترجمہ ۔ اس کی توضیح آسان الفاظ میں یہ ہے کہ طلاق کو ھزار درہم کے عوض قبول سے معلق کرنا یمین ہے اور عورت کا قبول کرنا شرط ہے ۔ شوھر کہتا ہے کہ تم نے یمین کو قبول نہیں کیا ، یعنی تو نے شرط پوری نہیں کی کہ خلع ہو جائے ۔ لیکن عورت کہتی ہے کہ میں نے قبول کر لیا تھا ۔ تو بات مرد کی مانی جائے گی کیونکہ یمین تو شرط کے بغیر بھی صحیح ہو جاتی ہے ۔ لیکن جب بائع نے مشتری سے کہا کہ کل بیع ہو چکی تھی یعنی ایجاب و قبول مکمل ہو چکا تھا لیکن بائع اب اقرار کردہ چیز یعنی قبول سے انکار کر کے بیع سے رجوع کرنا چاہتا ہے ۔ اس لیے بائع کی بات تسلیم نہیں کی جائے گی) ۔

مسئله : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ زوج و زوجہ کا باہم ایک دوسرے کو بری قرار دینا بھی خلع کی حیثیت رکھتا ہے ۔ کیونکہ مبارات اور خلع دونوں میں ہر ایک زوج و زوجہ کے نکاح سے سے قائم شدہ ازدواجی حقوق کو زائل کر دیتا ہے ۔ یہ صورت امام اعظمؒ کے نزدیک ہے ۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ مبارات اور خلع دونوں سے نکاح کا ہر حق زائل نہیں ہوتا ، بلکہ جس قدر حقوق دونوں متعین کریں ۔ امام ابو یوسفؒ خلع کے مسئلے میں امام محمدؒ کے ساتھ ہیں مگر مبارات میں امام ابو حنیفہؒ سے اتفاق رکھتے ہیں ۔

امام محمدؒ کی دلیل یہ ہے کہ خلع و مبارات میں سے ہر ایک معاوضہ ہے اور سب معاوضات میں لفظ مشروط کا اعتبار کیا جاتا ہے دوسرے امور کا نہیں ۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ مبارات کا اشتقاق براءۃ سے ہؤا ہے اور یہ باب مفاعلہ ہے ۔ جس کے معنی ہیں جانبین کا ایک دوسرے سے بری ہونا ۔ (تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ شوہر بیوی کے حقوق سے بری ہو جائے اور بیوی شوہر کے حقوق سے) لیکن براءۃ کا کلمہ مطلق تھا ۔ ہم نے اسے حقوق نکاح کے ساتھ اس لیے مقید کر دیا کہ براءۃ سے زوج و زوجہ کی غرض ہی حقوق نکاح سے بری ہونا ہے ۔ رہا خلع تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ بالکل علیحدگی اور جدائی اختیار کی جائے یہ بات نکاح کے ٹوٹنے سے پوری ہو جاتی

ہے اس لیے دوسرے احکام کے ختم کرنے کی ضرورت نہ رہی - (دوسرے احکام سے مراد مہر اور نان و نفقہ وغیرہ ہیں) -

امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ 'خلع کے لفظ ہی سے جدائی کا اظہار ہوتا ہے - ہم روزمرہ میں استعمال کرتے ہیں - خلع النعل اور خلع العمل - یعنی اس نے جوتا اتار دیا اور وہ کام سے الگ ہو گیا اور یہ مبارات کی طرح مطلق ہے تو نکاح اور اس کے احکام و حقوق میں ان کے مطلق ہونے پر ہی عمل کیا جائے گا - (یعنی نکاح کے ہر حکم اور حق سے علیحدگی اور بریت ہو جائے گی) -

مسئلہ : اگر کسی شخص نے اپنی صغیرہ بیٹی کا خلع اسی کے مال کے عوض لیا (تو خلع تو صحیح ہو جائے گا) مگر مال صغیرہ پر لازم نہ ہوگا (بلکہ باپ کو اپنے پاس سے ادا کرنا ہوگا) کیونکہ اس صورت میں صغیرہ کے لئے کوئی شفقت ثابت نہیں ہوتی (حالانکہ باپ کی ولایت شفقت کے لیے تھی) کیونکہ عورت کے نکاح میں نہ ہونے کی صورت میں اس سے حق تمتع باقیمت نہیں ہوتا - حالانکہ معاوضہ (یعنی مال) با قیمت ہوتا ہے (تو ایک با قیمت شے اس کا عوض کیسے بن سکتی ہے جو بے قیمت ہے) بخلاف نکاح کے (یعنی اگر باپ صغیرہ کا نکاح کر دے تو جائز ہے) کیونکہ ملک میں داخل ہونے کے وقت عورت سے حق تمتع با قیمت قرار پاتا ہے - اسی لیے اگر مریضہ عورت نے مرض میں خلع لیا

اور عدت میں مر گئی تو اس کے خلع کی رقم ترکے کی تہائی سے ادا کی جائے گی ۔ اگر مریض مرد نے مہر مثل پر نکاح کیا اور اسی مرض میں وفات پا گیا تو مہر مثل کا اعتبار تمام ترکہ میں کیا جائے گا اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ باپ کا خلع لینا جائز نہیں تو نہ صغیرہ کا حق مہر ساقط ہو گا نہ شوہر اس کے مال کا مستحق ہوگا ۔ باپ کے خلع لینے کی صورت میں ایک روایت کی بناء پر طلاق واقع ہو جاتی ہے اور دوسری روایت کی بناء پر طلاق واقع نہیں ہوتی ۔ لیکن پہلی روایت زیادہ صحیح ہے کیونکہ شوہر کا طلاق دینا باپ کے قبول کرنے پر مشروط تھا ۔ تو اسے ایسے ہی دوسرے مشروط امور پر قیاس کیا جائے گا (یعنی جس طرح ہر مشروط شرط کے پائے جانے پر واقع ہو جاتا ہے اسی طرح یہ مشروط بھی باپ کے قبول کرنے پر بصورت طلاق واقع ہوجائے گا) ۔

مسئلہ : اگر شوہر نے ہزار درہم کے عوض میں اس شرط پر خلع کیا کہ ہزار کی ادائیگی کی ضمانت باپ لے لے تو خلع ہو جائے گا اور باپ کو ہزار درہم ادا کرنا ہوں گے کیونکہ جب معاوضہ کی ضمانت ایک اجنبی شخص بھی لے سکتا ہے تو باپ بدرجۂ اولی ضامن بن سکتا ہے ۔ صغیرہ کا مہر ساقط نہیں ہوگا کیونکہ وہ باپ کی ولایت میں داخل نہیں ہے ۔

مسئلہ : اگر شوہر نے ہزار کے معاوضہ کو صغیرہ پر شرط ٹھیرایا تو خلع کا جواز صغیرہ کے قبول کرنے پر

منحصر ہوگا بشرطیکہ صغیرہ قبول کرنے کی سوجھ بوجھ رکھتی ہو - پھر اگر اس نے قبول کر لیا تو طلاق واقع ہو جائے گی کیونکہ شرط پائی گئی اور مال واجب نہیں ہوگا کیونکہ صغیرہ اس قابل نہیں کہ اس پر تاوان لازم کیا جائے - اگر باپ نے صغیرہ کی طرف سے عوض خلع قبول کر لیا تو اس میں دو روایتیں ہیں (ایک کے مطابق خلع صحیح ہے اور دوسری کے مطابق نہیں) -

**مسئلہ :** اسی طرح اگر شوہر صغیرہ سے اس کے مہر پر خلع کرے اور اس کا باپ مہر کی ضمانت نہ لے تو عورت کے قبول کرنے پر موقوف ہو گا - پس اگر اس نے قبول کر لیا تو طلاق واقع ہو جائے گی اور مہر ساقط نہ ہوگا (کیونکہ اس پر تاوان عدم اھلیۃ کی بناء پر لازم نہیں کیا جا سکتا) اگر باپ کرے تو اس میں (وہی) دو روایتیں ہیں - اگر صغیرہ کے باپ نے مہر کی ضمانت لے لی اور وہ (مہر) ہزار درہم ہے تو عورت پر طلاق واقع ہو جائے گی - کیونکہ باپ کی طرف سے قبولیت پائی گئی - اور یہی شرط تھی - اور باپ کے ذمے پانچ سو درہم لازم ہوں گے اور یہ استحسان ہے - اور قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ ہزار واجب الاداء ہوں (کیونکہ اس نے ہزار کی ضمانت لی تھی) -

اس مسئلہ کی اصل بالغ عورت کی صورت میں یوں ہوگی کہ جب اس نے مدخولہ ہونے سے پہلے ہزار درہم پر خلع لیا - اور اس کا مہر بھی ایک ہزار ہے تو قیاس کا تقاضا یہ

ہے کہ نصف پانچ سو کے علاوہ دیگر پانچ سو اس کے ذمے ہوں ۔ مگر استحسان کی وجہ یہ ہے کہ اس پر کچھ زائد بھی واجب نہ ہو ۔ کیونکہ ایسے خلع سے عادۃً یہی مراد ہوتا ہے کہ جو عورت کے لیے مرد کے ذمے واجب ہے وہ مرد کو حاصل ہو جائے (یعنی جو نصف (۵۰۰) عورت کے ذمے واجب تھا گویا اسی کے بدلے خلع کیا گیا)

# ظہار کے بیان میں

مسئلہ : اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے کہ تو مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے تو وہ عورت اس پر حرام ہوگی - اس سے مجامعت کرنا ، چھونا اور اس کا بوسہ لینا جائز نہیں ہے جب تک کہ ظہار کا کفارہ ادا نہ کرے - کیونکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ "جو لوگ اپنی عورتوں سے ظہار کرتے ہیں ، پھر اسی کام کی طرف رجوع کرتے ہیں جس کو اپنے منہ سے کہہ چکے ہیں تو ان پر لازم ہے کہ باہمی ملاپ سے پہلے ایک غلام آزاد کریں -"

دور جاہلیت میں ظہار کو طلاق شمار کیا جاتا تھا - شریعۃ اسلامیہ نے اس کی اصلیت کو تو برقرار رکھا - مگر اس کے حکم کو وقتی حرمت میں بدل دیا کہ یہ حرمت "ادائیگی کفارہ" تک قائم رہے گی اور اس سے نکاح زائل نہ ہوگا کیونکہ ظہار کرنا اس لحاظ سے جرم ہے کہ اس کا قول جھوٹ اور فحش ہے - اس لیے مناسب ہے کہ مرد کو اس کی سزا دی جائے اور اس عورت کو اس کے لیے حرام قرار دے دیا جائے - ہاں اگر کفارہ ادا کر دے تو حرمت رفع ہو سکتی ہے -

جب عورت سے مجامعت حرام قرار دے دی گئی تو وطی کے محرکات (مس اور بوسہ وغیرہ) بھی حرام ہوں گے

تاکہ کہیں وطی کا ارتکاب نہ کر بیٹھے جیسا کہ احرام کی حالت میں ممنوع ہوتا ہے۔

مگر حائضہ اور روزہ دار عورت کا یہ حکم نہیں ہے (بلکہ وہاں مس اور تقبیل وغیرہ جائز ہیں) کیونکہ حیض اور روزہ دونوں کا وقوع بکثرت ہوتا ہے۔ لہذا اگر محرکات کو حرام کر دیا جائے تو اس سے دقت پیدا ہوتی ہے۔ مگر ظہار اور احرام کی یہ صورت نہیں ہے (کیونکہ ان کا وقوع شاذ و نادر ہی ہوتا ہے)۔

مسئلہ : اگر مرد نے کفارہ دینے سے پہلے ہی مجامعت کرلی (تو گنہگار ہوگا۔ لہذا) اللہ تعالی کے حضور میں اپنے گناہوں کی معافی مانگے اور پہلے کفارہ کے علاوہ اس پر کچھ واجب نہ ہوگا۔ مگر کفارہ دینے تک اس سے دوبارہ ایسا فعل نہ کرے۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے سلمہ بن صخر سے — جنہوں نے ادائیگی کفارہ سے پہلے ہی مجامعت کر لی تھی۔ فرمایا کہ اس (گناہ) کی اللہ تعالی سے معافی مانگو اور کفارہ ادا کرنے سے پہلے دوبارہ ایسا کام نہ کرو۔ اگر استغفار کے علاوہ بھی کوئی چیز واجب ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ضرور بیان فرما دیتے۔

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ شوہر کا ''أنت علی کظهر أمی'' (یعنی تو مجھ پر میری ماں کی پشت کی طرح ہے) کہنا بہر صورت ظہار ہوگا۔ کیونکہ یہ الفاظ صراحۃً ظہار کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

مسئلہ : اگر ان الفاظ سے نیت طلاق کرے تو درست نہ ہوگی کیونکہ ان الفاظ کا طلاق ہونا منسوخ ہو چکا ہے تو مرد کو طلاق مراد لینے کا اختیار نہ ہوگا۔

مسئلہ : اگر مرد بیوی سے کہے کہ تو مجھ پر میری ماں کے پیٹ یا ران یا فرج کی طرح ہے تو مرد کو ظہار کرنے والا شمار کیا جائے گا ۔ کیونکہ ظہار کی حقیقت یہی ہے کہ حلال چیز کو حرام سے تشبیہ دی جائے اور یہ تشبیہ ان اعضاء کی صورت میں ثابت ہو جائے گی جن کی طرف شہوت سے دیکھنا جائز نہیں ۔

اسی طرح اگر مرد عورت کو ان عورتوں کے ساتھ تشبیہ دے جن کی طرف دیکھنا ہمیشہ کے لیے اس کے لیے جائز نہیں ۔ مثلاً بہن یا پھوپھی یا رضاعی ماں وغیرہ ۔ (تو بھی ظہار کرنے والا شمار ہوگا) کیونکہ دائمی حرمت کے لحاظ سے یہ بھی ماں کی طرح ہیں ۔

مسئلہ : اگر مرد نے اپنی بیوی سے کہا کہ تیرا سر یا تیرا چہرہ یا تیری گردن یا تیرا نصف یا تیرا تہائی مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی مانند ہے تو ظہار ہوگا ۔ کیونکہ سر ، چہرہ ، گردن اور فرج بول کر تمام بدن مراد لیا جا سکتا اور نصف وغیرہ جزء شائع ہیں ، پہلے حکم اس جزء میں ثابت ہوگا پھر تمام بدن میں ۔ جیسا کہ ہم طلاق میں بیان کر چکے ہیں ۔

مسئلہ : اگر شوہر بیوی سے کہے کہ تو مجھ پر میری ماں کی مثل یا اس کی مانند ہے تو اس کی نیت کو دیکھا جائے گا ۔ تاکہ (اس کے مطابق) حکم لگایا جا سکے ۔ اگر مرد کہے کہ میں نے اپنی بات سے مراد عزت و احترام لیا ہے تو اس کا کہنا تسلیم کیا جائے گا ۔ کیونکہ عزت وکرامت میں تشبیہ دینا ہمارے روز مرہ کے کلام میں مروج ہے ۔ اگر مرد نے کہا کہ میں نے ظہار کی نیت کی تھی تو اس کو ظہار ہی مانا جائے گا ۔ کیونکہ مذکورہ کلام میں عورت کو ماں کے پورے بدن سے تشبیہ دی گئی ہے اور اس میں تشبیہ عضو بھی شامل ہے لیکن مذکورہ کلام میں وہ چونکہ صریح نہیں لہذا نیت کی ضرورت پیش آئی ۔

مسئلہ : اگر مرد نے کہا کہ میں نے تو اپنے قول سے طلاق مراد لی تھی تو اب ایک طلاق بائن واقع ہو جائے گی کیونکہ اس نے بیوی کو حرمت میں ماں سے تشبیہ دی ہے ۔ گویا اس نے یوں کہا : ''أنت علی حرام'' اور طلاق کی نیت کی (تو ایسے قول سے ہمیشہ طلاق بائنہ واقع ہوتی ہے جیسا کہ ہم طلاق کے بیان میں ذکر کر چکے ہیں) ۔

مسئلہ : اگر مرد کی کوئی نیت نہ ہو تو شیخین[رح] کے نزدیک کچھ واقع نہ ہوگا کیونکہ اس کلام سے احترام وتعظیم بھی مراد ہو سکتا ہے ۔ امام محمد[رح] فرماتے ہیں کہ ظہار ہوگا کیونکہ جب ایک ایک عضو سے تشبیہ دینا ظہار شمار ہوتا ہے تو پورے بدن سے تشبیہ دینا بدرجۂ اولی ظہار ہوگا ۔

(امام مالکؒ ، احمدؒ اور شافعیؒ بھی اسی کے قائل ہیں ۔)

اگر مرد نے مذکورہ کلام سے صرف یہی مراد لیا ہو کہ عورت مجھ پر حرام ہو جائے تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یہ ایلاء شمار ہوگا تاکہ ظہار اور ایلاء کی حرمت میں سے کم درجہ کی حرمت ثابت ہو ۔ اما محمدؒ کے نزدیک ظہار ہوگا کیونکہ کاف تشبیہ ظہار کے لیے خاص ہے ۔

مسئلہ : اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے تو مجھ پر میری ماں کی طرح حرام ہے اور ظہار یا طلاق کی نیت کرے تو اس کا نتیجہ اس کی نیت کے مطابق ہوگا ۔ کیونکہ مذکورہ کلام میں دونوں احتمال ہیں ۔ ظہار کا اس لیے کہ تشبیہ پائی گئی اور طلاق کے لیے اس نے حرمت کا لفظ استعمال کیا ہے اور تشبیہ اسی حرمت کی تاکید کرتی ہے ۔

اگر مرد کی کوئی نیت نہ ہو تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ایلاء ہوگا اور امام محمدؒ کے نزدیک ظہار اور یہ دونوں صورتیں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ۔

مسئلہ : اگر کسی نے اپنی بیوی سے کہا کہ تو میری ماں کی پیٹھ کی طرح مجھ پر حرام ہے اور اس کلام سے طلاق یا ایلاء کی نیت کی تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ظہار ہی ہوگا ۔ مگر صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ مرد کی نیت کے مطابق ہوگا ۔ کیونکہ تحریم میں جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ان تمام چیزوں کا احتمال موجود ہے ۔ امام محمدؒ

ایک صورت میں امام ابو یوسفؒ سے اختلاف کرتے ہیں کہ جب مرد نے طلاق کی نیت کی تو طلاق ہی ہوگی ، ظہار نہ ہوگا اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک دونوں ہو سکتے ہیں۔ شمس الائمہ سرخسی نے مبسوط میں اس کی تفصیل بیان کی ہے (آپ نے مبسوط میں امام ابو یوسفؒ کے قول کو ضعیف قرار دیا ہے کہ جب طلاق بائنہ واقع ہو گئی تو ظہار کیسے ممکن ہے) ۔

امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ مرد کا کلام ظہار کے لیے صریح ہے لہذا کسی دوسری چیز کا احتمال نہ ہوگا۔ نیز یہ کلام محکم ہے لہذا یہ حرمت ظہار کی طرف ہی راجع ہوگی ۔

مسئلہ : امام محمدؒ الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں کہ ظہار صرف بیوی ہی سے ہو سکتا ہے ۔ اگر اپنی باندی سے ظہار کرے تو نہ ہوگا کیونکہ اللہ تعالی کے ارشاد میں ''من نسائهم'' کا لفظ آیا ہے ۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ لونڈی کی حلت اس کے مملوکہ ہونے کی وجہ سے ہے لہذا اسے منکوحہ کا درجہ نہیں دیا جا سکتا ۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ ظہار طلاق ہی سے لیا گیا ہے (کیونکہ دور جاہلیت میں اسے طلاق تصور کیا جاتا تھا ۔ اور مملوکہ میں طلاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

مسئلہ : اگر کسی نے عورت سے اس کی اجازت کے

بغیر نکاح کر لیا ۔ پھر اس سے ظہار کر دیا اور بعد میں عورت نے نکاح کی اجازت دے دی تو ظہار باطل ہوگا ۔ کیونکہ جب مرد نے اسے حرمت میں تشبیہ دی تھی اس وقت وہ سچا تھا (اس لیے کہ عورت جب تک اجازت نہ دے اس پر حلال نہیں ہو سکتی) تو اس کا ظہار کرنا قول فحش یا جھوٹ نہ ہوگا (اور یہ ظہار موقوف بھی نہ رہے گا) کیونکہ یہ شوہر کے حقوق میں سے کوئی حق نہیں ہے کہ موقوف رہے ۔ بخلاف اس صورت کے کہ خریدار ایسے غلام کو آزاد کر دے جو اس نے کسی غاصب سے خریدا ہے ۔ (ایسے غلام کی آزادی موقوف ہوگی ۔ اگر اصل مالک اجازت دے تو غلام آزاد ہو جائے گا ورنہ نہیں) کیونکہ آزاد کرنا (من جملہ) حقوق ملکیت سے ہے ۔ (الحاصل بیع موقوف میں غلام کا آزاد کرنا حق ملک ہے اس لیے موقوف رہے گا مگر نکاح موقوف میں ظہار کرنا مرد کا کوئی حق نہیں ہے ۔ لہذا موقوف نہیں رہے گا اور باطل ہو جائے گا) ۔

**مسئلہ :** اگر کسی شخص نے اپنی بیویوں سے کہا کہ تم سب میرے لیے میری ماں کی پشت کی طرح ہو تو سب ہی سے ظہار ہو جائے گا ۔ کیونکہ اس نے ظہار کی نسبت ان سب کی طرف کی ہے ۔ جیسا کہ اگر طلاق کی نسبت سب کی طرف کر دے (تو سب کو طلاق ہو جائیگی) اور وہ ہر ایک کے لیے الگ الگ کفارہ ادا کرے گا کیونکہ حرمت ظہار ہر ایک لیے ثابت ہے ۔ لہذا ان حرمتوں کے

رفع کرنے کے لیے کفارے بھی اسی تعداد میں ہوں گے۔
البتہ ایلاء کی صورت ظہار سے مختلف ہے۔ اگر تمام عورتوں
سے ایلاء کرے تو ایک کفارہ ہی لازم ہوگا۔ کیونکہ ایلاء
میں کفارے کا وجوب اللہ تعالی کے نام کی عظمت کے پیش
نظر ہوتا ہے اور سب سے ایک ایلاء کرنے میں اللہ تعالی کا
نام متعدد دفعہ مذکور نہیں ہوتا ہے۔

# کفارے کا بیان

مسئلہ : امام قدوری فرماتے ہیں کہ ظہار کا کفارہ ادا کرنے کے لیے ایک غلام آزاد کرنا پڑے گا۔ اگر غلام میسر نہ ہو تو دو ماہ کے لگاتار روزے رکھنا ہوں گے۔ اگر روزے رکھنے کی بھی استطاعت نہ ہو تو ساٹھ مساکین کو کھانا کھلانا چاہیے کیونکہ نص قرآنی میں اسی طرح مذکور ہے اور نص میں بیان کردہ ترتیب ہی ملحوظ رکھی جائے گی۔

مسئلہ : امام قدوری فرماتے ہیں کہ کفارے کی یہ تمام صورتیں عورت کو مس کرنے سے پہلے پوری ہونی چاہئیں۔ غلام کو آزاد کرنے اور روزے رکھنے کے متعلق تو نص ہی میں مذکور ہے کہ ''من قبل أن یتماسا''۔ اسی طرح کفارے کا کھانا کھلانا بھی وطی سے پہلے ہی ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ کفارہ کی ادائیگی کے بعد ہی حرمت کا ازالہ ہوگا۔ لہذا طعام لا محالہ وطی سے پہلے ہونا ضروری ہے تاکہ (بعد میں) وطی جائز ہو جائے۔

مسئلہ : امام قدوری فرماتے ہیں کہ غلام مسلم ہو یا کافر، مرد ہو یا عورت، چھوٹا ہو یا بڑا (ان میں سے) جو بھی آزاد کر دے کفارہ ادا ہو جائے گا۔ کیونکہ رقبۃ کا لفظ مطلق استعمال ہوا ہے اور وہ ان تمام اصناف پر بولا جا

سکتا ہے ۔ اور رقبۃ سے مراد وہ انسان ہے جو ہر طرح سے
مملوک اور غلام ہو ۔ امام شافعیؒ کافر غلام کی صورت میں
ہم سے یہ اختلاف فرماتے ہیں کہ کفارہ اللہ تعالی کا حق ہے
تو اس حق کو دشمن الٰہی پر صرف کرنا جائز نہیں جیسا
کہ زکاۃ (کافر کو نہیں دی جا سکتی) ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ نص قرآنی میں مطلق غلام کا
آزاد کرنا ہے اور کافر کا غلام کی صورت میں بھی یہ حق ثابت
ہے غلام آزاد کرنے سے مالک کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ
غلام آزاد ہو کر فراغت قلب سے طاعت الٰہی کے فریضے
کو سر انجام دے سکے ۔ مگر غلام کا کفر و تعصب اختیار
کر لینا اس کا اپنا غلط انتخاب ہے (اس میں آزاد کرنے
والے K کیا گناہ ہے) ۔

مسئلہ : کفارہ ظہار میں اندھا ، یا کٹے ہوئے ہاتھوں
یا کٹے ہوئے پاؤں والا غلام نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس
قسم کے غلام میں منفعت کی جنس یعنی بینائی یا قوت گرفت
یا قوت رفتار ہی معدوم ہے اور یہ نقص اسے کفارہ ادا
کرنے سے مانع ہے ۔

اگر اس کی منفعت میں تھوڑا سا خلل اور نقصان ہو
تو اس کا دینا منع نہیں ۔ مثلاً کانا (یا بھینگا ہو) یا جس کا
ایک ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں کٹا ہوا ہو اس
کا آزاد کرنا کافی ہوگا ۔ کیونکہ جنس منفعت بالکل معدوم
نہیں ہوئی بلکہ اس میں فقط خلل واقع ہوا ہے ۔ لیکن اگر

ہاتھ اور پاؤں ایک ہی طرف کے کٹے ہوئے ہوں تو ایسا غلام کفارہ میں دینا جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ یہاں تو جنس منفعت بالکل معدوم ہے اور وہ چلنے ہی سے عاری ہے۔

بہرہ غلام کفارہ میں دینا جائز ہے قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ بہرہ غلام جائز نہ ہو۔ نوادر میں بھی یہی مذکور ہے کیونکہ جنس منفعت زائل ہو چکی ہے۔ مگر ہم استحسان کے طور پر ایسے غلام کا آزاد کرنا جائز سمجھتے ہیں کیونکہ اصل منفعت باقی ہے۔ جب چلا کر بات کی جائے تو وہ سن لیتا ہے۔ البتہ اگر غلام کی ایسی حالت ہو کہ اسے کچھ بھی سنائی نہ دے۔ مثلاً پیدائشی بہرہ ہو اور ساتھ ساتھ گونگا بھی تو اس قسم کے غلام کا آزاد کرنا کفارہ میں درست نہ ہوگا۔

مسئلہ: جس غلام کے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے کٹے ہوئے ہوں اس کا آزاد کرنا بھی جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ انسان میں انگوٹھوں ہی سے قوت گرفت پائی جاتی ہے، تو ان کے معدوم ہونے سے جنس منفعت زائل ہو جائے گی۔

مسئلہ: ایسا پاگل غلام بھی کفارے میں دینا جائز نہیں جس میں عقل کا شائبہ تک نہ ہو۔ کیونکہ ہر انسان عقل سے کام لے کر اپنے اعضاء سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اور دیوانگی کی حالت میں منفعت معدوم ہوتی ہے۔

مسئله : جس غلام پر کبھی دیوانگی طاری ہو جاتی ہو اور کبھی اسے افاقہ ہو جاتا ہو اس کا آزاد کر دینا کفارے میں جائز ہوگا ۔ کیونکہ اس کی منفعت میں خلل کا ہونا اس امر سے مانع نہیں ہے (یعنی مالک اسے حالت افاقہ میں آزاد کرے) ۔

مسئله : مدبر اور ام ولد کا کفارے میں آزاد کرنا صحیح نہیں ۔ کیونکہ یہ تو ایک لحاظ سے (پہلے ہی) آزادی کے مستحق ہو چکے ہیں اور ان کا مملوک ہونا مکمل نہیں بلکہ ناقص ہے ۔ اسی طرح جو مکاتب غلام کچھ قیمت ادا کر چکا ہو اسے آزاد کرنا بھی کافی نہ ہوگا ۔ کیونکہ اس کا آزاد کرنا تو مال کے معاوضے میں ہو جانے گا (حالیکہ کفارہ میں بغیر معاوضہ کے غلام آزاد کرنے کا حکم ہے) ۔

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مکاتب کا آزاد کرنا جائز ہوگا کیونکہ اس کا مملوک ہونا ہر لحاظ سے موجود ہے ۔ اس لیے کہ کتابت کے تحریری معاہدے کو منسوخ کیا جا سکتا ہے بخلاف ام ولد اور مدبر کے (کیونکہ ان میں مملوکیۃ ناقص ہوتی ہے نیز ان کا استحقاق منسوخ نہیں ہو سکتا) ۔

مسئله : اگر مظاہر نے ایسے مکاتب غلام کو آزاد کر دیا جس نے ابھی تک کچھ بھی ادا نہیں کیا ، تو جائز ہوگا ۔ امام شافعیؒ اس مسئلہ میں اختلاف کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ معاهدے کے تحریر میں آنے سے وہ حریت کا

مستحق ہو چکا ہے اس لیے یہ مدبر شمار ہوگا اور (کفارے میں آزادی حاصل نہ کر سکے گا)۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ مکاتب میں ہر طرح سے غلامی اور ملکیت موجود ہے۔ جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں (کہ تحریری معاہدہ منسوخ بھی ہو سکتا ہے)۔ ہماری دوسری دلیل آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب تک مکاتب کے ذمے ایک درہم بھی باقی ہے وہ غلام ہی ہے اور تحریری معاہدہ کوئی ایسی چیز نہیں جو آزاد کرنے (یا رق) کے منافی ہو۔ کیونکہ تحریر سے تو فقط ممانعت زائل ہوتی ہے۔ یعنی وہ اپنی مرضی سے کما سکتا ہے۔ جس طرح ''ماذون فی التجارۃ" (وہ غلام جسے خرید و فروخت کا اختیار دیا جائے) دونوں میں فرق یہ ہے کہ ماذون فی التجارۃ کو مالک جس وقت چاہے معزول کر سکتا ہے۔ کیونکہ وہ اذن بلا عوض ہوتا ہے اور کتابت معاوضے کے بدلے ہوتی ہے۔ لہذا وہ غلام کی جانب سے لازم ہوگی اور اگر کتابت آزاد کرنے کے منافی ہوتی ہے تو بھی کفارہ میں آزاد کر دینے سے کتابت کا معاہدہ فسخ ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا احتمال موجود ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ مکاتب کی کمائی اور اولاد محفوظ و سالم رہے گی۔ (یعنی معاہدۂ کتابت کے دوران اس نے جو کچھ کمایا وہ اسی کے پاس رہے گا اور اس اثناء میں اس کی جو اولاد پیدا ہو گی وہ بھی اسی کے ساتھ آزاد ہو جائے گی۔ بشرطیکہ وہ غیر کی باندی سے نہ ہو)

کیونکہ اس کی ذات میں آزادی ، کتابت کی جہت سے پیدا ہوئی ہے یا اس لیے کہ کتابت ضرورت کی بناء پر فسخ ہوئی ہے ۔ لہذا اس کی اولاد اور کمائی کے حق میں اس کا اثر ظاہر نہ ہوگا ۔ (آسان الفاظ میں اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ جب غلام کی کتابت آزاد کر دینے کی بناء پر منسوخ ہوگئی تو ہم کہیں گے کہ مالک نے گویا مطلق غلام آزاد کیا ۔ اور یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ مطلق غلام آزاد کیا جائے تو تمام مال اور ساری اولاد مالک کی ملکیت میں آ جاتی ہے ۔ اس سوال کا جواب یہ دیا گیا کہ اس مسئلے میں غلام کی دو جہتیں ہیں: ایک تو مولٰی کی طرف سے آزاد ہونے کی جہت اور دوسری جہت غلام کی ذات میں آزادی کا پیدا ہونا ۔ کیونکہ معاہدہ لکھا جا چکا ہے ۔ اب ان دونوں جہتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ مالک کی جہت سے تو مطلق غلام آزاد ہوا ۔ مگر محل عبد یعنی غلام کی جہت کتابت کے پیش نظر غلام گویا مکاتب ہو کر آزاد ہؤا ۔ لہذا اس کی کمائی اور اولاد پر مالک کا حق نہیں ہوگا ۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ضرورت کی بناء پر ہم نے کتابت کو فسخ کر دیا اور غلام کو آزادی دے دی ۔ مگر یہ فسخ صرف غلام کی آزادی پر ہی اثر انداز ہوگا اس کے مال و متاع اور اولاد پر نہ ہوگا کیونکہ جو چیز ضرورت کے تحت جائز کی جائے وہ ضرورت سے آگے تجاوز نہیں کر سکتی) ۔

مسئلہ : اگر مظاہر نے اپنے (غلام) باپ یا بیٹے کو اس قیمت سے خریدا کہ میں کفارے میں انہیں آزاد کر دوں گا ۔ تو جائز ہوگا ۔ امام شافعیؒ جواز کے قائل نہیں ہیں ۔ اگر کفارہ قسم میں بھی اس قسم کا غلام آزاد کیا جائے تو ہمارے اور امام شافعیؒ کے درمیان اسی طرح اختلاف ہے ۔ اِن شاء اللہ ہم اس مسئلے کی تفصیل کتاب الایمان میں بیان کریں گے ۔

مسئلہ : اگر ظہار کرنے والے نے کسی ایسے غلام کا نصف (اپنی طرف) سے آزاد کر دیا جو دو مالکوں کے درمیان مشترک تھا ۔ آزاد کرنے والا امیر آدمی ہے ۔ اس نے باقی نصف کی قیمت اپنے ذمے لے لی (اور دوسرا نصف بھی آزاد کر دیا) تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جائز نہ ہوگا ۔ مگر صاحبینؒ کے نزدیک صحیح ہوگا ۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ مظاہر نے جب اپنے شریک کے نصف حصے کی قیمت کا ذمہ لے لیا تو گویا وہ پورے غلام کا مالک ہو گیا اور اس نے کفارے میں مکمل غلام آزاد کیا جب کہ پورا اس کی ملکیت میں تھا ۔ لیکن مظاہر اگر دولتمند نہ ہو تو جائز نہیں ۔ کیونکہ اس صورت میں غلام کو اپنے نصف کی قیمت کما کر دوسرے مالک کو دینا پڑے گی ۔ تو یہ آزادی (مفت نہ ہوئی بلکہ) عوض دینے سے ہوئی ۔

امام ابوحنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ دوسرے شریک کا حصہ اس کی ملکیت میں ناقص رہا اور یہ حصہ بعد میں نہایت

لینے پر آزاد ہوا اور اس قسم کا نقص کفارے کی ادائیگی سے مانع ہے (یعنی جب مالک نے اپنا آدھا حصہ آزاد کیا تو آزادی نامکمل ہے ۔ کیونکہ دوسرے حصے کا مالک دوسرا شریک ہے ۔ البتہ بعد میں مالک کے ضمانت لینے پر دوسرا نصف آزاد ہؤا تو یہ آزادی کچھ نہ کچھ نقص کے ساتھ ہوئی ۔ لہذا اس قدر نقص کے ہوتے ہوئے بھی کفارہ ادا نہ ہو سکے گا) ۔

مسئلہ : اگر کسی نے اپنے غلام کا نصف کفارے کے طور پر آزاد کر دیا اور بعد میں باقی نصف بھی آزاد کر دیا تو جائز ہوگا ۔ کیونکہ اس نے غلام کو دو قولوں سے آزاد کیا ہے اور ایسا نقصان کفارے کے جواز میں مانع نہیں ہوتا کیونکہ اس کی ملکیت میں جو نقصان پیدا ہوا وہ کفارہ میں آزاد کرنے کی جہت ہی سے ہے (یعنی مذکورہ بالا مسئلے کی طرح یہاں بھی نقصان موجود ہے کہ جب آزاد کیا تو آزادی ناقص ہوئی لیکن دونوں صورتوں میں نقصان کی جہت مختلف ہے ۔ اس صورت میں نقصان کفارے ہی کی جہت سے ہے ۔ اس لیے یہ نقصان اداء واجب سے مانع نہ ہوگا ۔ لیکن پہلی مذکورہ صورت میں نقصان دوسری جہت سے تھا ۔ کیونکہ دوسرے نصف کا مالک دوسرا شریک تھا اور اس صورت میں دوسرے نصف کا مالک بھی وہ خود ہے ۔ لہذا دونوں صورتوں میں وجہ فرق ظاہر ہے) جیسا کہ ایک آدمی نے قربانی کی بکری کو لٹایا اور چھری

بکری کی آنکھ میں لگ گئی (تو اب یہ نقصان قربانی سے سے مانع نہ ہوگا ۔ کیونکہ یہ عیب قربانی کی جہت ہی سے پیدا ہوا ہے ۔ اسی طرح زیر بحث صورتوں میں نقصان کفارے کی جہت ہی سے پیدا ہوا تھا لہذا یہ نقصان بھی اداء کفارہ سے مانع نہ ہوگا) بخلاف گذشتہ صورت کے ۔ کیونکہ اس صورت میں نقصان شریک کی ملک میں پیدا ہوا تھا ۔ یہ صورت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ہے (کہ اعتاق میں الگ الگ اجزاء مراد ہو سکتے ہیں) ۔

صاحبینؒ کے اصول کے مطابق آزادی کا تجزیہ نہیں ہو سکتا ۔ تو ان کے نزدیک نصف آزاد کرنا ہی پورا آزاد کرنا ہوگا ۔ نہ کہ دوبارہ کلام کرنے سے آزاد ہوگا ۔

مسئلہ : اگر مظاہر نے کفارے میں نصف غلام آزاد کر کے اپنی اس عورت سے مجامعت کر لی جس سے اس نے ظہار کر رکھا تھا ، اور نصف باقی بعد میں آزاد کیا تو امام اعظمؒ کے نزدیک جائز نہ ہوگا ۔ کیونکہ ان کے نزدیک اعتاق تقسیم ہو سکتا ہے (لہذا نصف آزاد کرنے کو پورا آزاد کرنا شمار نہیں کیا جائے گا) اور اعتاق کی شرط یہ ہے کہ مجامعت سے پہلے ہو ۔ مگر اس صورت میں نصف کا اعتاق بعد میں ہو رہا ہے (لہذا شرط نہ پائی گئی) ۔

صاحبینؒ کے نزدیک نصف کا آزاد کرنا کل کا آزاد کرنا ہے کل کا آزاد کرنا مجامعت سے پہلے ہو ہی چکا ہے۔ (اس لیے ان کے نزدیک جائز ہوگا) ۔

**مسئلہ:** اگر مظاہر کے پاس آزاد کرنے کے لیے کوئی غلام نہ ہو تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ دو مہینوں کے متواتر روزے رکھے۔ ان دو ماہ رمضان میں نہ تو ماہ رمضان آئے اور نہ یوم فطر، نہ یوم نحر اور نہ ایام تشریق ہی شامل ہوں (کیونکہ ان ایام میں روزہ جائز نہیں)۔

روزے لگا تار رکھنے کا ثبوت نص قرآنی سے ملتا ہے۔ ماہ رمضان کے نہ ہونے کی شرط اس لیے لگائی گئی کہ اگر رمضان کے روزے کفارے کے ہو جائیں تو حق شرعی میں نقصان لازم آتا ہے۔ کیونکہ جو روزے اللہ تعالی نے اس ماہ میں فرض کیے تھے ان کا ابطال ہو گیا۔ پانچ مذکورہ بالا ایام میں روزہ رکھنے کی ممانعت کی گئی ہے تو ان دنوں کا روزہ کفارۂ ظہار کا قائم مقام نہ ہو سکے گا کیونکہ وہ کامل واجب ہے (اور ممنوعہ اوقات میں اگر کوئی واجب ادا کیا جائے تو وہ ناقص رہتا ہے)۔

**مسئلہ:** اگر مظاہر نے دو ماہ کے دوران رات کے وقت عمداً یا دن کو بھول کر اسی عورت سے مجامعت کر لی تو امام اعظمؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک وہ نئے سرے سے روزے شروع کرے۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ نئے سرے سے شروع نہ کرے (بلکہ جتنے باقی ہیں انہیں مکمل کر دے) کیونکہ مجامعت تواتر اور پے در پے ہونے میں مانع نہیں ہے، اس لیے کہ ایسی مجامعت سے تو روزہ بھی فاسد نہیں ہوتا اور

اصل شرط تو یہی تھی کہ روزے پے درپے ہوں اور اس میں کوئی فرق نہیں آیا ۔

نیز روزوں کا مجامعت پر مقدم کرنا اگر شرط تھا تو جو صورت ہم نے اختیار کی ہے اس میں کئی روزے وطی پر مقدم ہیں اور تمہاری اختیار کردہ صورت کے مطابق تو تمام روزے مجامعت کے بعد ہوں گے ۔ طرفین کی دلیل یہ ہے کہ کفارے کے روزوں کی دو شرطیں ہیں : ایک تو یہ کہ وطی سے پہلے ہوں اور دوسرے یہ کہ وطی سے خالی بھی ہوں) مگر روزوں کے دوران مجامعت کرنے سے یہ دوسری شرط معدوم ہو جاتی ہے ۔ لہذا وہ نئے سرے سے روزوں کا آغاز کرے ۔

**مسئلہ** : اگر مظاہر نے دو ماہ کے دوران کسی عذر کی وجہ سے یا بلا عذر روزہ رکھا تو پھر نئے سرے سے شروع کرے کیونکہ پے درپے ہونے والی شرط موجود نہ رہی حالانکہ اسے عادةً متواتر رکھنے کی استطاعت تھی ۔ (کیونکہ اگر عورت کو کبھی متواتر روزے رکھنے ہوں ۔ مثلاً اس نے رمضان کا روزہ عمداً توڑ دیا اور کفارے کے روزے کے درمیان حائضہ ہو گئی تو پھر اسے نئے سرے سے روزے نہ رکھنے ہوں گے کیونکہ وہ عادةً معذور ہے ۔)

**مسئلہ** : اگر غلام اپنی بیوی سے ظہار کرے تو وہ کفارے کی ادائیگی میں فقط روزے ہی رکھے گا ۔ کیونکہ

اسے حق ملکیت ہی حاصل نہیں لہذا اس میں مال سے کفارہ ادا کرنے کی اہلیت ہی نہ پائی جائے گی ۔

اگر مالک اس کی طرف سے غلام آزاد کر دے یا کھانا کھلا دے تو جائز نہ ہوگا ۔ کیونکہ وہ ملکیت کی اہلیت سے محروم ہے اس لیے مولی کے مالک بنانے سے بھی اس میں وہ اہلیت پیدا نہ ہوگی ۔

مسئلہ : اگر مظاہر میں روزے رکھنے کی استطاعت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے ۔ باری تعالی کا ارشاد ہے: ”فمن لم یستطع فاطعام ستین مسکیناً“ کہ جس میں روزے رکھنے کی استطاعت نہ ہو تو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے ۔ اور ہر مسکین کو گندم کا نصف صاع یا جو یا کھجور دے یا اس کی قیمت ادا کر دے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اوس بن الصامت اور سہل بن صخر کے متعلق یہی فیصلہ صادر فرمایا تھا کہ ہر مسکین کو گندم کا نصف صاع دے دو ۔

(دوسری دلیل یہ ہے) کہ مقصود تو ہر مسکین کی ایک دن کی حاجت پوری کرنا ہے لہذا اسے صدقۂ فطر پر قیاس کیا جائے گا ۔ امام قدوریؒ کا یہ قول کہ ”یا اس کی قیمت دے دو“ تو یہ ہمارا مذہب ہے جس کی تفصیل ہم کتاب الزکاۃ میں بیان کر چکے ہیں ۔

مسئلہ : اگر مظاہر نے کفارے میں ہر مسکین کو

چوتھائی صاع گندم اور نصف صاع کھجور یا جو دیئے تو جائز ہوگا۔ کیونکہ ان کی جنس (پیٹ بھرنے اور بھوک کو رفع کرنے کے لحاظ سے) ایک ہے۔ اور ان سے مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔

مسئلہ: اگر مظاہر نے کسی دوسرے شخص سے کہا کہ تم میری طرف سے کفارے کے سلسلے میں مسکین کو کھانا کھلا دو۔ اور اس نے کھلا دیا تو جائز ہوگا کیونکہ یہ بات قرض لینے کے معنی میں ہے مگر قرض میں قبضے کی شرط ہوتی ہے (اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں) ۔ کہ فقیر نے پہلے اس کے لیے (بطور نائب) حاصل کیا پھر خود قبضہ کر لیا تو پہلے اپنی ملک میں لے کر فقیر کو مالک بنانا ثابت ہو گیا (لہذا اس کا کفارہ ادا ہو گیا) ۔

مسئلہ: اگر مظاہر نے فقراء کو صبح و شام دو وقت کا کھانا کھلا دیا تو جائز ہے، خواہ انہوں نے کم کھایا ہو یا زیادہ۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس طرح کھانا کھلا دینا کافی نہیں جب تک کہ انہیں مالک نہ بنائے (یعنی یوں کہے کہ کھانا میں نے تمہاری ملک میں دے دیا، یہاں کھالو یا ساتھ لے جاؤ) جیسا کہ صدقۂ فطر اور زکاۃ میں کیا جاتا ہے (یعنی وہاں تملیک شرط ہے) کیونکہ مالک بنانے سے فقیر کی حاجت خوب اچھی طرح رفع ہو جاتی ہے اور صرف کھانے کی اجازت دے دینا اس کا قائم مقام نہ ہوگا۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ نصِ قرآنی میں صرف کھانا کھلانے کا ذکر ہے اور اس کے حقیقی معنی یہی ہیں کہ انہیں کھانے پر قادر کر دیا جائے۔ اور یہ مقصد جیسا مالک بنانے سے حاصل ہوتا ہے کھانے کی اجازت دینے سے بھی پورا ہو جاتا ہے۔ رہا زکاۃ کا معاملہ تو اس میں دینا شرط ہے اور صدقۂ فطر میں ادا کرنا واجب ہے۔ دینا اور ادا کرنا حقیقت میں مالک بنانے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

مسئلہ : مظاہر نے شام کے وقت جن مساکین کو کھانا کھلایا ان میں اگر کوئی ایسا بچہ ہو جس کا دودھ چھڑایا گیا ہو تو کافی نہ ہوگا کیونکہ وہ پورا کھانا نہیں کھا سکتا۔ اور جو کی روٹی کے ساتھ سالن بھی ضرور ہو تاکہ وہ پیٹ بھر کر کھا سکیں۔ مگر گندم کی روٹی کی صورت میں سالن دینا شرط نہیں ہے۔

مسئلہ : اگر مظاہر ایک ہی مسکین کو ساٹھ دن تک کھانا دیتا رہے تو جائز ہے اور اگر ایک ہی روز اسے ساٹھ دن کا دے دے تو صرف اسی دن کا ادا ہوگا (۵۹ دنوں کا اسے پھر دینا ہوگا) کیونکہ اس سے مقصد تو یہ ہے کہ محتاج کی حاجت پوری ہو جائے اور حاجت ہر روز از سر نو پیدا ہوتی رہتی ہے تو اسی مسکین کو دوسرے دن دینا دوسرے مسکین کے مشابہ ہوگا یہ حکم کھانے کو بطور مباح کھلانے میں بلا اختلاف جائز ہے۔ مگر ایک مسکین

کو ایک ہی دن ساٹھ بار بلا کر دینا بعض کے نزدیک جائز نہیں اور بعض کے نزدیک جائز ہے کیونکہ کسی کو کسی چیز کا مالک بنانے کی ضرورت تو ایک ہی دن میں بار بار پیدا ہو سکتی ہے بخلاف اس کے اگر ایک مسکین کو یکبارگی دے دیا (تو بالاتفاق جائز نہیں) کیونکہ متفرق کر کے دینا قرآنی نص سے ثابت ہے (اللہ تعالی نے فرمایا ہے کہ ساٹھ مساکین کو کھلاؤ۔ جس سے متفرق کر کے دینا ثابت ہو رہا ہے)۔

مسئلہ : مساکین ابھی کھا رہے ہوں کہ مظاہر اپنی بیوی سے مجامعت کر لے تو اسے از سر نو کھانا کھلانے کی ضرورت نہیں کیونکہ اللہ سبحانہ نے نص قرآنی میں اس شرط کا ذکر نہیں فرمایا کہ کھانا کھلانا مجامعت سے پہلے ہو البتہ طعام دینے کے پہلے وطی ممنوع ہے کیونکہ ممکن ہے کہ طعام دینے کے دوران وہ غلام کو آزاد کرنے یا ساٹھ روزے رکھنے پر قادر ہو جائے تو مجامعت کر لینے کی صورت میں وہ مجامعت کے بعد ہوں گے (حالانکہ اعتاق اور صیام کے متعلق نص میں صراحت سے بیان ہوا ہے کہ دونوں مجامعت سے پہلے ہوں) اور جو بات کسی دوسری چیز کی وجہ سے ممنوع ہو وہ بذاتہ مشروع ہو سکتی ہے (یعنی طعام کے دوران مجامعت اس لیے منع کی گئی کہ کہیں سے اعتاق یا صیام پر قدرت حاصل نہ ہو جائے۔ ورنہ بذاتہ طعام کے دوران وطی کی ممانعت مذکور نہیں ہے)۔

**مسئلہ :** اگر مظاہر نے دو ظہاروں کے کفارے میں ساٹھ مسکینوں کو گندم کا ایک ایک صاع دیا، تو امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک صرف ایک ظہار کا کفارہ ادا ہوگا امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ دونوں کا ادا ہو جائے گا۔

اگر مظاہر کفارۂ افطار اور کفارۂ ظہار کو اکٹھا کر کے ادا کرے تو بالاتفاق جائز ہے۔

امام محمدؒ کی دلیل یہ ہے کہ مظاہر نے جو طعام ادا کیا ہے وہ دونوں ظہاروں کے لیے کافی ہے اور جن لوگوں کو اس نے دیا ہے وہی اس کے جائز مستحق ہیں لہذا دونوں سے ادا ہو جائے گا جیسا کہ اس صورت میں ادا ہو جاتا ہے جب کہ اسباب مختلف ہوں (یعنی ایک ظہار کا کفارہ ہو اور دوسرا روزہ توڑنے کا) یا جب کہ متفرق کر کے دے (جس کے جواز کے آپ بھی قائل ہیں)۔

شیخینؒ کی دلیل یہ ہے کہ ایک ہی جنس میں نیت لغو ہوتی ہے (کیونکہ نیت مختلف اجناس میں تمیز کے لیے ہوتی ہے اور یہاں جنس ایک ہی ہے) اور دو جنسوں میں نیت قابل اعتبار ہوتی ہے۔ (مذکورہ صورت میں) جب نیت کا لغو ہونا ثابت ہو گیا تو ادا شدہ چیز صرف ایک کفارہ کی ادائیگی ہوگی کیونکہ نصف صاع کفارہ کی کم از کم مقدار ہے جس سے کم کرنا جائز نہیں مگر اس سے زیادہ دینا ممنوع نہیں۔ تو اس سے ایک کفارہ کی ادائیگی ہو جائے گی۔

گویا اس کی نیت ایک ہی کفارہ کی تھی بخلاف اس صورت کے جب کہ متفرق اوقات میں دے کیونکہ دوسری بار دینا گویا کسی اور مسکین کو دینا ہے۔

مسئلہ: اگر کسی پر ظہار کے دو کفارے واجب تھے چنانچہ اس نے دو غلام آزاد کر دیے لیکن ہر کفارے کے غلام کا تعین نہ کیا (کہ یہ پہلے کفارے کے لیے ہے اور یہ دوسرے کفارے کے لیے) تو دونوں کفارے ادا ہو جائیں گے۔ اسی طرح اگر بلا تعیین چار ماہ کے روزے رکھ لے یا ایک سو بیس (۱۲۰) مساکین کو کھانا کھلا دے تو بھی جائز ہوگا کیونکہ جنس متحد ہے اس لیے معین نیت کی چنداں ضرورت نہیں۔

مسئلہ: اگر مظاہر نے دونوں ظہاروں کے کفارے میں ایک غلام آزاد کر دیا یا دو ماہ کے روزے رکھ لیے تو وہ جس ظہار کا کفارہ چاہے ادا کر سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ ظہار اور قتل دونوں کے کفارے میں ایک غلام آزاد کرے تو کسی ایک کا بھی کفارہ ادا نہ ہوگا۔

امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں (کفارہ) جائز نہ ہوگا اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ دونوں صورتوں میں غلام کو کسی ایک کفارے کے لیے متعین کیا جا سکتا ہے کیونکہ سب کفاروں کا مقصود ایک ہی ہوتا ہے لہذا وہ ایک ہی جنس شمار ہوں گے۔

امام زفرؒ کی دلیل یہ ہے کہ گویا اس نے ہر دو ظہار کے لیے نصف غلام آزاد کیا اور جب وہ دونوں کے لیے آزاد کرچکا تو اب اسے یہ اختیار حاصل نہ ہوگا کہ پورے غلام کو ایک ظہار کے لیے کفارہ مقرر کرے کیونکہ مال اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ جنس متحد میں تعیین کی نیت کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا لہذا وہ لغو ہو جائے گی۔ لیکن مختلف اجناس میں نیت مفید ہوتی ہے (یہ سوال کہ مذکورہ صورت میں اختلاف جنس نہیں کیونکہ قتل اور ظہار کے کفارے کی جنس متحد ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ) اگر دو چیزوں کے سبب مختلف ہوں تو ان پر مختلف اجناس کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔ جنس متحد کی مثال یہ دی جا سکتی ہے کہ ایک شخص نے دو روزوں کی قضاء کے سلسلے میں ایک دن کا روزہ رکھا تو ایک روزے کی قضاء پوری ہوجائے گی اور مختلف جنس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص پر دو روزے واجب ہیں، ایک قضاء کا اور دوسرا نذر کا، تو اس صورت میں معین کر کے تمییز کرنا ضروری ہے۔ واللہ اعلم۔

# لعان کا بیان

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ جب کسی شوہر نے اپنی بیوی پر تہمت زنا لگائی میاں بیوی دونوں اہل شہادت میں سے ہوں ۔ اور عورت بھی ایسی کہ اگر کوئی اجنبی اس پر تہمت لگائے تو تہمت لگانے والے پر حد جاری ہو سکے ۔ یا مرد عورت کے بچے کے نسب کی نفی کر دے (کہے کہ جو بچہ اس نے جنا ہے میرا نہیں ہے) اور زوجہ حد قذف کے لیے دعوی کر دے (کہ خاوند نے بلاوجہ مجھ پر بدکاری کا الزام لگایا ہے) تو شوہر لعان کرنا واجب ہوگا ۔ درحقیقت لعان ان گواہیوں کا نام ہے جن کی تاکید میں قسمیں کھائی جائیں اور اس میں ساتھ لعنت بھی مذکور ہوتی ہے (مرد چار بار یوں کہے کہ میں اللہ تعالی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس عورت نے بدکاری کا ارتکاب کیا ہے اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر میں جھوٹ کہہ رہا ہوں تو مجھ پر اللہ تعالی کی لعنت ہو اور اسی طرح عورت جواباً کہے) یہ شہادتیں مرد کے حق میں حد قذف کے قائم مقام ہیں اور عورت کے حق حد زنا کے ۔ (اس سلسلے میں قرآن کریم کی یہ آیت اصل کی حیثیت رکھتی ہے : والذین یرمون أزواجهم ولم یکن لهم شهداء إلا أنفسهم فشهادة أحدهم أربع شهادات

بالله أنه لمن الصادقين و الخامسة أن لعنة الله عليه إن كان من الكاذبين - یعنی جو لوگ اپنی بیویوں پر زنا کی تہمت لگائیں اور ان کے ماسوا ان کا کوئی گواہ نہ ہو تو ایسے مدعیوں میں سے ہر ایک کا ثبوت یہ ہے کہ وہ چار بار اللہ تعالی کی قسم کھا کر بیان کرے کہ وہ اپنے دعوے میں سچا ہے اور پانچویں بار یوں کہے کہ اگر وہ جوٹ بولے تو اس پر اللہ کی لعنت ہو - دوسری آیت میں ہے : ویدرء عنها العذاب أن تشهد أربع شهادات بالله انه لمن الكاذبين والخامسة أن غضب الله عليها إن كان من الصادقين - یعنی مرد کے قسم کھانے کے بعد عورت سے سزا ٹل سکتی ہے - اگر وہ چار بار اللہ تعالی کی قسم کھا کر بیان کر دے کہ یہ شخص سر تا سر جھوٹا ہے اور پانچویں پر یوں کہے کہ اگر یہ شخص اپنے دعوے میں سچا ہو تو مجھ پر خدا کا غضب نازل ہو) کیونکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے : "ولم يكن لهم شهداء إلا أنفسهم" اور یہ استثناء اپنی (متحد) جنس ھی سے ہے (یعنی وہ گواہ تسلیم ہوں گے) اس کے بعد اللہ تعالی فرماتے ہیں : فشهادة أحدهم أربع شهادات بالله" اس نص سے گواھی اور قسم کا صریح ثبوت ملتا ہے - لہذا ھماری رائے میں لعان کا رکن یہ ہے کہ شہادت قسم سے مؤکد ہو - پھر شوھر کی طرف سے رکن کو "قول لعنت" شامل کرنا اگر وہ جھوٹا ہو یعنی مرد کا چار بار قسم کھا کر شہادت دینا اور پانچویں بار جھوٹ کی صورت میں لعنت کو بھی شامل کرنا تہمت کی

سزا کے قائم مقام ہوگا (کیونکہ اگر مرد صرف تہمت لگائے اور گواہ نہ پیش کر سکے یا خود بھی مذکورہ شہادت نہ دے تو اس پر حد قذف یعنی اسی (۸۰) کوڑے لگانے کا فیصلہ کیا جائے گا) عورت کی طرف شہادات کے ساتھ غضب کا قول عورت کے حق میں زنا کی سزا کے قائم مقام ہوگا (کیونکہ اگر مرد کے دعوے کے جواب میں عورت شہادات سے انکار کرے تو اس پر زنا کی سزا واجب ہوگی)۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو ہم (مسئلے کا تجزیہ کرتے ہوئے) کہتے ہیں کہ شوہر و زن دونوں کا اہل شہادت سے ہونا ضروری ہے کیونکہ لعان میں رکن شہادت ہی ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ عورت بھی ایسی ہو جس پر تہمت لگانے والے کے خلاف حد قذف جاری ہو سکے کیونکہ یہ لعان شوہر کے حق میں حد قذف کے قائم مقام ہے لہذا زوجہ کا محصنہ ہونا ضروری ہے۔

اور بچے کے نسب کی نفی کرنے سے بھی لعان واجب ہوگا کیونکہ جب مرد زوجہ کے بچے سے انکار کرتا ہے تو گویا وہ ظاہر طور پر اس زنا کی تہمت لگا رہا ہے (کہ یہ بچہ میرا نہیں بلکہ زنا کا ہے) اور یہاں یہ احتمال درست نہیں کہ نفی ولد سے شاید مرد کی مراد یہ ہو کہ کسی دوسرے مرد نے اس سے غلط فہمی میں مجامعت کی جس سے یہ بچہ پیدا ہوا اسی طرح جیسے کوئی اجنبی شخص کسی بچے کے متعلق کہے کہ یہ اپنے معروف باپ کا نہیں تو اس قول کو بھی قذف

شمار کیا جاتا ہے اور یہاں اس قسم کے احتمال کا اعتبار نہیں کیا جاتا اور یہ ثابت ہے کہ نسب میں اصل یہ ہے کہ فراش صحیح ہو اور جو بچہ فراش فاسد سے پیدا ہؤا اسے فراش صحیح کی طرف ہی منسوب کیا جائے گا (کہ یہ باپ ہی کا ہے) تو فراش صحیح سے کسی بچے کی نفی قذف اس وقت تک قذف نہیں شمار ہو گی جب تک یہ ظاہر نہ ہو کہ یہ بچہ فراش فاسد سے پیدا ہؤا ہے (صرف احتمال ہی نہیں بلکہ یقین حاصل کرنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے) ۔

لعان کرنے کے لیے زوجہ کا مطالبہ شرط ہے ، کیونکہ لعان کرانا عورت کا حق ہے تو دوسرے حقوق کی طرح اس میں اس کا مطالبہ اور دعوی ضروری ہے ۔

مسئلہ : اگر عورت کے مطالبہ کرنے پر شوہر لعان سے انکار کر دے تو حاکم وقت اسے قید کر سکے گا یہاں تک کہ یا تو وہ لعان کرے یا یہ کہے کہ میں اپنے دعوے میں جھوٹا تھا تا کہ اس پر حد جاری ہو کیونکہ لعان کرنا شوہر پر واجب اور ضروری ہے اور مرد کو اس حق کے پورا کرنے پر قدرت بھی ہے لہذا اسے قید کیا جائے گا حتی کہ وہ حق کو پورا کرے یا اپنے آپ کو جھٹلائے تا کہ جس سبب کی بناء پر یہ حق واجب ہوا تھا وہ رفع ہو جائے (یعنی مرد عورت کی تصدیق کر دے کہ اس نے زنا نہیں کیا لہذا اب لعان نہ ہو گا) ۔

مسئلہ : اگر شوہر نے لعان کیا تو عورت پر بھی لعان

کرنا واجب ہوگا کیونکہ مذکورہ بالا نص قرآنی سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ البتہ لعان کی ابتداء مرد ہی کرے گا کیونکہ وہی مدعی ہے (اور مدعی پہلے دعوی پیش کرتا ہے۔)

اگر (مرد لعان کرے لیکن) عورت انکار کر دے تو حاکم اسے قید کر دے گا یہاں تک کہ یا تو لعان کرے یا مرد کے دعوے کی تصدیق کرے۔ کیونکہ لعان کرنا عورت پر حق واجب ہے اور یہ اس کی ادائیگی پر بھی قادر ہے (لہذا عدم ادائیگی کی بناء پر) عورت کو قید کر لیا جائے گا۔

مسئلہ : اگر شوہر غلام یا کافر ہو یا اس پر حد قذف جاری ہو چکی ہو اور وہ اپنی بیوی پر تہمت لگائے تو اس پر حد قذف جاری کی جائے گی کیونکہ شوہر میں ایک ایسا سبب پایا جاتا ہے جو لعان سے مانع ہے تو اس کی اصل سزا (یعنی حد قذف) کا اس کو مورد گردانیں گے جس کا ثبوت نص قرآنی سے ملتا ہے کہ جو لوگ عصمتہ عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں اور ان کا کوئی گواہ نہ ہو تو ان کو اسی (۸۰) کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو۔ اور لعان دراصل اسی سزا کا قائم مقام ہے۔

مسئلہ : اگر شوہر اہل شہادت سے ہو مگر بیوی باندی ہو یا کافرہ یا اس پر حد قذف جاری ہو چکی ہو یا ان

عورتوں سے ہو جن پر تہمت لگانے والے کو سزا نہیں دی جاتی ۔ مثلاً صغیرہ ، مجنونہ یا زانیہ ہو (تو اس صورت میں اگر مرد بیوی پر تہمت لگائے) تو مرد پر نہ حد واجب ہوگی اور نہ لعان کیونکہ عورت نہ تو شہادت کی اہلیت رکھتی ہے نہ محصنہ ہی ہے ۔ اب چونکہ لعان کا مانع ہونا خود عورت کی وجہ سے ہے لہذا مرد سے حد ساقط ہو جائے گی ۔ جیسا کہ عورت ہی شوہر کے دعوے کی تصدیق کر دے) تو نہ لعان کرنا پڑے گا اور نہ حد واجب ہوگی) اس مسئلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اصل کی حیثیت رکھتا ہے : چار اشخاص ایسے ہیں کہ ان کے اور ان کی بیویوں کے درمیان لعان نہیں ہو سکتا ۔ یہودیہ اور نصرانیہ جن کے خاوند مسلمان ہوں ، باندی جو آزاد مرد سے شادی شدہ ہو اور آزاد عورت جس نے غلام سے نکاح کر رکھا ہو ۔

اگر میاں بیوی دونوں پر پہلے ہی حد قذف جاری ہو چکی ہو تو اس صورت میں مرد پر حد لازم آئے گی ۔ کیونکہ امتناع لعان اس کی طرف سے ہوا ہے ۔ جبکہ وہ اس کا اہل نہیں) ۔

مسئلہ : لعان کی صورت یہ ہے کہ قاضی (میاں اور بیوی دونوں کو عدالت میں طلب کرے اور) شوہر سے شروع کرے ۔ شوہر چار بار قسم کھائے اور ہر بار یہ لفظ کہے : میں اللہ تعالی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے

اس عورت پر زنا کا جو الزام لگایا ہے اس میں میں سچا ہوں اور پانچویں بار کہے کہ اگر میں عورت پر زنا کے اس الزام میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر اللہ تعالی کی لعنت ہو ۔ ، مرد پانچوں بار عورت کی طرف اشارہ کر کے شہادتیں پیش کرے ۔

خاوند کے بعد بیوی بھی اسی طرح چار مرتبہ شہادت دے گی اور ہر بار یہ کہے گی کہ میں اللہ تعالی کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ مرد نے مجھ پر جو الزام عائد کیا ہے وہ اس میں سراسر جھوٹا ہے۔، اور پانچویں بار یہ الفاظ کہے گی کہ اگر مرد اپنے الزام لگانے میں سچا ہو تو مجھ پر اللہ تعالی کا قہر و غضب نازل ہو ۔،

اس مسئلے میں مذکورہ بالا تحریر کردہ آیت اصل کی حیثیت رکھتی ہے ۔

امام حسنؒ نے امام اعظم ابوحنیفہؒ سے روایت کیا کہ شوہر لعان کی شہادتوں میں مخاطب کے صیغے استعمال کرے مثلاً فیما رمیتك به من الزنا ۔ کیونکہ مخاطب کے صیغوں سے جیسا کہ امام قدوریؒ نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے قطعاً کوئی احتمال نہیں رہتا اگر غائب کے صیغے استعمال کئے جائیں اور ان کے ساتھ ہی عورت کی طرف اشارہ بھی پایا جائے تو تمام احتمالات زائل ہو جائیں گے ۔

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ لعان کرنے سے

میاں بیوی میں تفریق پیدا نہ ہو گی بلکہ لعان کے بعد قاضی دونوں کو جدا کر دے گا ۔ امام زفرؒ کہتے ہیں : دونوں کے باہم لعان کرنے سے فرقت پیدا ہو جائے گی کیونکہ حدیث سے (لعان کی صورت میں) دائمی حرمت ثابت ہے ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ لعان سے جو حرمت ثابت ہوتی ہے وہ امساك بالمعروف کے مقصد کے فوت ہونے کی وجہ سے ہے (یعنی زن و شوہر میں اتحاد و موافقت نہیں رہی) لہٰذا شوہر پر لازم ہے کہ اس عورت کو احسان کے ساتھ رخصت کرے لیکن جب شوہر اس سے انکار کرے تو (تفریق کرانے میں) قاضی اس کا قائم مقام ہو جائے گا تا کہ ظلم اور نا انصافی کا ازالہ کیا جا سکے ۔

ہماری دوسری دلیل لعان کرانے والے صحابی کا قول ہے جو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کہا تھا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں نے اس بارے میں جھوٹ کہا تھا ۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ پھر اسے رکھ لو ۔ اس نے عرض کیا : یا رسول اللہ اگر میں اس کو اپنے پاس رکھوں تو اس پر تین طلاق ۔ اس نے یہ الفاظ لعان کے بعد کہے (تو معلوم ہوا کہ لعان کے بعد طلاق دینا ضروری ہے ۔)

**مسئلہ :** دونوں کے درمیان جدائی طلاق بائن ہو گی یہ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کا قول ہے کیونکہ قاضی کی تفریق

شوہر کی طرف منسوب ہو جائے گی جیسا کہ عنین کی صورت میں کیا جاتا ہے۔

مسئلہ: اگر لعان کرنے والا مرد لعان کے بعد کہہ دے کہ میں نے غلط الزام لگایا تھا، تو طرفینؒ کے نزدیک وہ اسی عورت سے دوبارہ نکاح کر سکتا ہے۔

ابویوسفؒ فرماتے ہیں کہ لعان سے دائمی حرمت پیدا ہوتی ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آپس میں لعان کرنے والے کبھی جمع نہ ہوں گے اور یہ حدیث حرمت دائمی پر حکم قطعی ہے۔

طرفینؒ کی دلیل یہ ہے کہ مرد نے خود ہی اپنے دعوے کی تکذیب کر دی ہے، گویا اس نے اپنے قول سے رجوع کر لیا ہے اور جس گواہی سے کوئی گواہ پھر جائے اس کا کوئی حکم نہیں رہتا۔ آپ کی بات ہمیں بھی تسلیم ہے کہ وہ جب تک لعان کریں جمع نہیں ہو سکتے۔ مگر اپنے قول کی تکذیب کرنے سے نہ تو باہمی لعان رہا اور نہ اس کا حکم ہی ہے لہٰذا دونوں جمع ہو سکتے ہیں۔

مسئلہ: اگر مرد نے بیوی پر یہ الزام لگایا کہ یہ بچہ اس سے نہیں تو لعان کرنے کے بعد قاضی بچے کا نسب اس مرد سے ہٹا کر بچے کو اس کی ماں کے سپرد کر دے گا۔ اور اس میں لعان کی صورت یہ ہوگی کہ قاضی شوہر کو یہ کہنے کا حکم دے گا کہ میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ

میں نے نفی والد کا جو الزام عورت پر لگایا ہے اس میں میں سچا ہوں ۔

عورت بھی جواب میں اسی طرح کہے گی (کہ مرد نے بچے کی نفی کرتے ہوئے جو الزام مجھ پر لگایا ہے میں اس سے بری ہوں) ۔

**مسئلہ** : اگر مرد نے اپنی بیوی پر زنا کا الزام بھی لگایا اور ساتھ ہی بچے کی نفی بھی کی تو مرد لعان میں دونوں الزامات کا ذکر کرے گا ۔ اور قاضی مرد سے بچے کی نفی کرکے بچے کو اس کی ماں کے سپرد کر دے گا ۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ھلال بن امیہ کی بیوی کے بچے کی نفی کرکے بچے کو اس کی ماں کے سپرد کر دیا تھا ۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ لعان کا مقصد بھی یہی ہے کہ بچے کے نسب کو مرد کی طرف منسوب ہونے سے ہٹایا جائے تاکہ شوھر کا مقصد پورا ہو جائے ۔ لہذا نسب کی نفی کے لیے قاضی کا اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ دونوں میں لعان کی وجہ سے تفریق کی جاتی ہے (اس میں نفی ولد بھی ہو جائے گی) ۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ قاضی دونوں میں تفریق کرے گا اور ساتھ ہی یہ بھی کہے گا کہ میں بچے کو ماں کے سپرد کرتا ہوں اور باپ کے نسب سے اس کی نفی کرتا ہوں ۔ کیونکہ نفی والد اور تفریق دو الگ الگ چیزیں ہیں لہذا ہر ایک کا ذکر علیحدہ علیحدہ کرنا پڑے گا ۔

مسئلہ : مذکورہ صورت میں شوہر اگر اپنے دعوے سے رجوع کر لے اور کہے کہ میرے عائد کردہ الزامات بے بنیاد تھے تو قاضی اس پر حد قذف جاری کرے گا کیونکہ شوہر نے اپنے دعوے کی تکذیب کرکے حد قذف کو خود اپنے اوپر واجب کیا ہے - البتہ وہ (شوہر) اس عورت سے دوبارہ نکاح کر سکتا ہے یہ جواز طرفین؁ کے نزدیک ہے - کیونکہ جب مرد کو حد قذف لگائی گئی تو وہ لعان کا اہل نہ رہا - لہٰذا اس سے متعلق حکم بھی (اور وہ تحریم ہے) زائل ہوگیا - اور مرد اس سے دوبارہ نکاح کر سکتا ہے -

مسئلہ : اگر کسی شخص نے اجنبی عورت پر الزام لگایا اور اس پر حد قذف جاری کر دی گئی تو بعد میں جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں وہ اس سے نکاح کر سکتا ہے - اسی طرح اگر کسی عورت نے زنا کیا اور اسے زنا کی سزا دی گئی تو اس کے ساتھ بھی نکاح جائز ہے - کیونکہ عورت کی طرف سے لعان کی اہلیت مفقود ہے - (اس مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ مرد و عورت نے نکاح کے بعد ، دخول سے پہلے لعان کیا اور دونوں میں تفریق ہو گئی - بعد ازاں عورت نے زنا کا ارتکاب کیا اور اس پر زنا کی حد لگائی گئی (اور وہ سو کوڑے ہیں - کیونکہ دخول سے پہلے تفریق ہو گئی تھی اس لیے وہ عورت غیر محصنہ قرار ہوگی اور اس سے اس مرد کا نکاح جائز ہے)-

مسئلہ : اگر مرد نے اپنی نابالغہ یا مجنونہ بیوی پر

تہمت لگائی تو ان کے درمیان لعان نہ ہوگا۔ کیونکہ اگر صغیرہ یا مجنونہ پر کوئی اجنبی شخص بھی تہمت لگائے تو حد قذف واجب نہیں ہوتی۔ اس طرح شوہر بھی لعان نہیں کر سکتا کیونکہ لعان حد قذف کا قائم مقام ہوتا ہے (یعنی جب حد قذف واجب نہیں تو اس کا قائم مقام کیسے ممکن ہوگا)۔

اسی طرح شوہر بھی اگر نابالغ یا مجنون ہو (تو میاں بیوی میں لعان نہ ہوگا) کیونکہ شوہر میں اہلیت شہادت مفقود ہے۔

مسئلہ : اگر گونگے شوہر نے اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائی تو دونوں کے درمیان لعان نہ ہوگا کیونکہ لعان کا تحقق (اشارے سے نہیں بلکہ) صریح الفاظ سے ہوتا ہے جیسا کہ حد قذف میں صراحت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس مسئلے میں امام شافعیؒ ہم سے، اختلاف کرتے ہیں اور ہماری دلیل یہ ہے کہ گونگے کے اشارات شبہ سے خالی نہیں اور شبہ سے حدود ساقط ہو جایا کرتی ہیں۔

مسئلہ : اگر شوہر نے اپنی بیوی سے کہا کہ تیرا حمل مجھ سے نہیں ہے تو دونوں میں لعان نہیں ہوگا۔ یہ امام اعظمؒ اور امام زفرؒ کا مسلک ہے کیونکہ حمل کے موجود ہونے کا کوئی یقین نہیں۔ لہذا مرد قاذف شمار نہ ہوگا۔

صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ حمل کی نفی کرنے سے بھی

لعان واجب ہوگا بشرطیکہ قذف کے وقت سے چھ ماہ سے کم مدت میں بچہ پیدا ہو۔ مبسوط میں جو قول مذکور ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ قذف کے وقت ہمیں حمل ہونے کا یقین ہو تو تہمت لگانا متحقق ہوگا۔

امام اعظمؒ اور امام زفرؒ کی دلیل یہ ہے کہ تہمت لگانا اگر اسی وقت قذف نہ ہو تو یہ معلق بالشرط کی طرح ہو جائے گا۔ اور وہ ایسا ہوگا جیسے مرد کہے کہ اگر تجھے حمل ہو تو وہ مجھ سے نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ قذف کو شرط سے معلق کرنا درست نہیں ہوتا (لہذا مذکورہ صورت میں لعان نہ ہوگا)۔

مسئلہ : اگر مرد نے بیوی سے کہا کہ تونے زنا کا ارتکاب کیا ہے اور یہ حمل زنا ہی سے ہے تو دونوں لعان کریں گے۔ کیونکہ اب قذف موجود ہے اس لیے کہ مرد نے زنا کا صریحاً ذکر کیا ہے البتہ قاضی کو اس حمل کے نسب کی مرد سے نفی نہ کرنا چاہئے۔

امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ قاضی کو حمل کے نسب کی نفی کر دینا چاہیے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہلال کے بچے کی اس سے نفی کر دی تھی۔ ہلال نے عورت پر حاملہ ہونے کی حالت میں الزام لگایا تھا۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ حمل پر کسی قسم کا حکم اس کی پیدائش کے بعد ہی لگایا جا سکتا ہے کیونکہ پیدائش

سے پہلے تو شبہ باقی رہتا ہے (کہ شاید حمل نہ ہو اور کسی بیماری کی وجہ سے اجتماع خون ہو گیا ہو) اور آپ کی پیش کردہ روایت ہمارے خلاف دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حمل کے موجود ہونے کا علم بذریعہ وحی ہو گیا ہوگا۔

مسئلہ : اگر مرد بچہ پیدا ہوتے ہی نسب کی نفی کر دے یا ایسی حالت میں نسب کا انکار کرے جس میں مبارک باد قبول کی جاتی ہے یا پیدائش کی چیزیں خریدی جاتی ہیں تو اس کا نسب کی نفی کرنا صحیح ہوگا اور اس وجہ سے لعان کرے گا۔ اگر ان صورتوں کے علاوہ بعد میں نفی اور لعان کرے تو امام اعظمؒ کے نزدیک نسب ثابت ہو جائے گا۔

صاحبینؒ کہتے ہیں کہ مدت نفاس تک نفی کی جا سکتی ہے کیونکہ کم مدت میں نفی صحیح ہو سکتی ہے اور طویل مدت میں صحیح نہ ہوگی تو ہم نے قلیل اور کثیر مدت کے درمیان مدت نفاس کو حد فاصل قرار دیا۔ کیونکہ نفاس ولادت کے اثرات میں سے ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ مدت مقرر کرنے سے حاصل کیا ہے؟ کیونکہ مدت تو غور و فکر اور سوچ بچار کے لیے ہوتی ہے (کہ مرد تحقیق کر لے) مگر سوچ بچار کے لحاظ سے لوگوں میں تفاوت ہوتا ہے۔ (بعض کم مدت میں

ایک چیز کی حقیقت کو پا لیتے ہیں اور بعض عرصہ دراز تک بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے) تو ہم نے ایسی بات کا اعتبار کیا جو بچے سے انکار نہ کرنے پر دلالت کرتی ہے مثلاً اس نے مبارک باد، قبول کرلی۔ یا مبارک دیئے جانے کے وقت خاموش رہا۔ یا ولادت کے وقت جو اشیاء خرید کر لائی جاتی ہیں لے آیا۔ یا وہ وقت گزر گیا اور اس نے نفی نہ کی۔

اگر شوھرگھر میں موجود نہ ہو اور اسے ولادت کا علم نہ ہو۔ بعد میں کسی وقت سفر سے واپس آیا تو امام اعظمؒ کے قانون اور صاحبینؒ کے اصول کے مطابق مدت کا اعتبار ہوگا (امام اعظمؒ کے نزدیک، مبارک باد، قبول کر لینا۔ یا مبارک کے وقت خاموش رہنا وغیرہ عدم نفی کی علامت ہوگا اور صاحبینؒ کے نزدیک مدت نفاس قابل اعتبار ہوگی)۔

مسئلہ: امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ اگر بیوی یک بارگی دو بچے جنے اور خاوند پہلے کے نسب کی نفی کر دے اور دوسرے کے نسب کا اقرار کرے تو دونوں بچوں کا نسب ثابت ہوگا۔ کیونکہ یہ جڑواں بچے ہیں جن کی پیدائش ایک ہی نطفے سے ہوئی اور خاوند پر حد قذف جاری ہوگی کیونکہ اس نے دوسرے بچے کے متعلق صحت نسب کا دعوی کرکے اپنے پہلے قول کی تکذیب کر دی۔

مسئلہ: اگر خاوند پہلے بچے کے نسب کا تو اعتراف کرے لیکن دوسرے کی نفی کر دے تو بھی دونوں کا

نسب ثابت ہوگا ۔ اس کی دلیل ابھی مذکور ہوئی ہے (کہ یہ جڑواں بچے ایک ہی نطفہ سے ہیں) اور شوہر کو لعان کرنا ہوگا کیونکہ وہ دوسرے بچے کی نفی کرنے سے تہمت لگا رہا ہے اور اپنے قول سے اس نے رجوع بھی نہیں کیا ۔ اور زوجہ کے پاک دامن ہونے کا اقرار اس نے تہمت لگانے سے پہلے کیا ہے گویا اس نے یوں کہا کہ میری عورت پاک دامن ہے ۔ پھر کہا : یہ زانیہ ہے (تو اس صورت میں اس پر لعان واجب ہوگا) لہذا پہلے بچے کے اعتراف کے بعد دوسرے کی نفی کرنا بھی وہی حکم رکھتا ہے (کہ اس پر لعان واجب ہو) ۔

## باب العنین وغیرہ

مسئلہ : اگر کسی عورت کا شوہر نامرد ہو (اور عورت قاضی کی عدالت میں دعوی کرے) تو قاضی اسے ایک سال کی مہلت دے گا ۔ اگر شوہر نے ایک سال کے اندر مجامعت کرلی تو بہتر ورنہ قاضی ان دونوں کے درمیان تفریق کر دے گا بشرطیکہ عورت تفریق کا مطالبہ کرے ۔ حضرت عمر ، حضرت علی اور حضرت ابن مسعودؓ سے اسی طرح منقول ہے ۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ عورت کے لیے مجامعت کا استحقاق ثابت ہے اور اس بات کا احتمال ہے کہ اس حق سے شوہر کا انکار کرنا کسی عارضی مرض کی بناء پر یا کسی حقیقی آفت کی وجہ سے ہو ۔ لہذا اتنی مدت کا تعین ضروری ہے جس میں یہ سبب جانا جا سکے ۔ اور ہم نے اس مدت کا اندازہ ایک سال مقرر کیا ہے کیونکہ سال میں چاروں موسم آ جاتے ہیں ۔ لیکن جب مقررہ مدت گزر گئی اور مرد نے عورت سے مجامعت نہ کی ۔ تو معلوم ہؤا کہ یہ معذوری کسی حقیقی آفت کی وجہ سے ہے لہذا "إمساك بالمعروف" کا مقصد فوت ہو گیا اور احسان مندی کے طریقے سے چھوڑ دینا واجب ہو گیا ۔ لیکن اگر خاوند اس بارے میں انکار سے کام لے تو

قاضی اس کا قائم مقام ہوگا اور وہ دونوں میں تفریق کر دے گا - مگر عورت کا مطالبہ کرنا ضروری ہے کیونکہ تفریق کرانا فقط عورت ہی کا حق ہے -

مسئلہ : قاضی کی وارد کردہ فرقت طلاق بائن ہوگی - کیونکہ قاضی کا فعل شوہر کے فعل کی طرف منسوب ہوگا گویا کہ خاوند نے خود طلاق دی -

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ قاضی کی تفریق فسخ نکاح کے حکم میں ہوگی مگر ہمارے نزدیک نکاح (اتمام عقد کے بعد) قابل فسخ نہیں رہتا -

نیز قاضی کی تفریق اس لیے بھی طلاق بائن شمار ہوگی کیونکہ تفریق سے مقصد یہ ہے کہ عورت سے ظلم و زیادتی کو دور کیا جائے - اور یہ مقصد طلاق بائن سے پورا ہو سکتا ہے - کیونکہ عورت اگر بائنہ نہ ہو تو شوہر کے رجوع کر لینے سے وہ پھر معلق رہے گی -

مسئلہ : اگر عنین آدمی عورت سے خلوت کرچکا ہو تو عورت کو پورا مہر ملے گا کیونکہ عنین کی خلوت "خلوت صحیحہ" ہوتی ہے اور عورت پر (تفریق کے بعد) عدت واجب ہوگی - جیسا کہ ہم باب المہر میں بیان کر چکے ہیں - یہ سب کچھ اسی صورت میں ہے جب کہ زوج اقرار کرے کہ اس تک میری رسائی نہیں ہوئی -

مسئلہ : اگر قربت کے بارے میں مرد اور عورت کا

اختلاف ہو جائے (مرد کہے اس نے مجامعت کر لی ہے اور عورت اس سے انکار کرے) تو عورت اگر ثیبہ ہو تو مرد کی بات اس سے قسم لے کر تسلیم کر لی جائے گی کیونکہ وہ فرقت کے حق کے ثابت کرنے سے انکار کرتا ہے اور اس میں اصل یہ ہے کہ عضو سالم ہو (لہذا اگر مرد قسم کھا کر کہہ دے کہ میں تندرست ہوں اور میں نے مجامعت کی ہے تو اس کی بات مانی جائے گی) ۔

اگر شوہر نے قسم کھا لی تو عورت کا حق باطل ہو جائے گا ۔ اور اگر قسم کھانے سے انکار کیا تو ایک سال کی مہلت دی جائے گی ۔

مسئلہ : اگر عورت باکرہ ہو تو عورتیں اس کا ملاحظہ کریں گی ، اور اگر وہ اس کے باکرہ ہونے کی تصدیق کر دیں تو مرد کو ایک سال کی مہلت دی جائے گی تاکہ اس کا جھوٹ ظاہر ہو جائے ۔

اگر ملاحظہ کرنے والی عورتیں کہیں کہ یہ ثیبہ ہے تو خاوند سے قسم لی جائے گی ۔ اگر وہ قسم کھا لے تو عورت کا دعوی باطل ہوگا ۔ اور اگر قسم سے انکار کرے تو اسے ایک سال کی مہلت دی جائے ۔

مسئلہ : اگر زوج مقطوع الذکر ہو تو اسی وقت تفریق کر دی جائے گی بشرطیکہ عورت مطالبہ کرے کیونکہ اس صورت میں مہلت دینے کا کوئی فائدہ نہیں ۔

مسئلہ : خصی مرد کو بھی نامرد کی طرح مہلت دی جائے گی کیونکہ اس سے بھی مجامعت کی امید کی جا سکتی ہے نیز جب خصی کو ایک سال کی مہلت دی گئی اور اس نے (عدالت میں آ کر) کہہ دیا کہ میں نے مجامعت کرلی ہے مگر بیوی انکار کرے تو عورتیں اس کو ملاحظہ کریں گی، اگر وہ کہہ دیں باکرہ ہے تو عورت کو اختیار حاصل ہوگا (اور فرقت چاہے تو قاضی تفریق کر دے گا) کیونکہ بکارت کی وجہ سے عورتوں کی شہادت پوری ہو گئی۔

لیکن اگر عورتیں یہ کہہ دیں کہ یہ تو ثیبہ ہے تو خاوند کو قسم دلائی جائے گی اگر قسم سے انکار کر دے تو عورت کو (فرقت کا) اختیار ہوگا کیونکہ شوہر کے قسم سے انکار نے عورت کے دعوے کی تائید کر دی۔

اور اگر مرد قسم کھا لے تو عورت کو اختیار نہیں ہوگا اگرچہ وہ پہلے ہی سے ثیبہ ہو۔ مرد سے قسم لے کر اس کا قول قبول کیا جائے گا۔ اس کا تذکرہ ہم ابھی کر چکے ہیں۔

مسئلہ : اگر عورت (عدالت میں ایک دفعہ) خاوند کو اختیار کر لے تو اس کے بعد اسے خیار حاصل نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ اپنے حق کو باطل کرنے پر خود ہی راضی ہو چکی ہے۔

مسئلہ : صحیح قول کے مطابق مہلت میں قمری سال کا اعتبار کیا جائے گا ایام حیض اور رمضان کا مہینہ بھی سال ہی

میں شمار کیا جائیے گا ۔ کیونکہ یہ دونوں چیزیں سال ہی میں پائی جاتی ہیں ۔ مگر عورت یا مرد کا مرض سال کی مہلت میں شمار نہ ہوگا ۔ کیونکہ سال کا عرصہ تو کبھی مرض سے خالی بھی ہوتا ہے (کہ سال بھر آدمی بیمار ہی نہ ہو) ۔

مسئلہ : اگر بیوی میں کوئی عیب ہو تو خاوند کو فسخ نکاح کا اختیار نہ ہوگا (خواہ طلاق دے دے یا نکاح برقرار رکھے) امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ پانچ عیوب کی بناء پر نکاح فسخ کیا جا سکتا ہے اور یہ جذام، برص ، جنون رتق اور قرن ہیں ۔ کیونکہ مذکورہ امراض طبعی اور حسی نفرت کی وجہ سے تمتع میں حائل ہوتے ہیں اور طبیعت کی تائید تو شریعۃ اسلامیہ سے بھی ہوتی ہے کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ تو مجزوم سے اس طرح بھاگ جس طرح شیر سے بھاگتا ہے ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ موت کی وجہ سے ، جبکہ حصول تمتع قطعاً ناممکن ہو جاتا ہے ، نکاح فسخ نہیں ہوتا تو ان عیوب کی وجہ سے بدرجۂ اولٰی فسخ نہ ہوگا کیونکہ ان عیوب کے ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ کچھ تمتع تو کیا ہی جا سکتا ہے (اگرچہ ناقص ہی سہی) اور تمتع کرنا نکاح کا ثمرہ ہے اور نکاح کا اصل حق یہ ہے کہ خاوند کو تمتع پر قابو ہو اور یہ چیز موجود ہے ۔

مسئلہ : اگر مرد جنون یا برص یا جذام میں مبتلا ہو

تو امام اعظمؒ اور امام یوسفؒ کے نزدیک عورت کو خیار حاصل نہ ہوگا۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اسے اختیار ہوگا کہ وہ اپنے آپ سے ضرر کو دور رکھ سکے۔ جس طرح مجبوب اور عنین کی صورت میں ہوتا ہے۔ بخلاف شوہر کے کیونکہ وہ اپنے آپ سے ضرر دور کرنے پر (ہر وقت) قادر ہوتا ہے کہ جب چاہے طلاق دے سکتا ہے۔

شیخینؒ کی دلیل یہ ہے کہ زوجہ کو اختیار نہ دینا ہی اصل ہے۔ کیونکہ اختیار دینے سے شوہر کا حق باطل ہو جاتا ہے اور مجبوب و عنین کی صورت میں زوجہ کو اس لیے اختیار دیا جاتا ہے کہ مجبوب اور عنین ہونے کی صورت میں وہ مقصد (یعنی وطی پر قادر ہونا) ہر لحاظ سے معدوم ہے جس کے لیے نکاح مشروع کیا گیا ہے۔ مگر یہ عیوب وطی پر قادر ہونے میں خلل انداز نہیں ہیں۔ لہذا دونوں میں فرق ظاہر ہو گیا۔ واللہ أعلم بالصواب۔

# عدت کا بیان

مسئلہ : اگر شوہر اپنی بیوی کو طلاق بائن یا طلاق رجعی دے دے یا ان میں بغیر طلاق کے فرقت واقع ہو جائے (مثلاً غلام شوہر کو عورت خرید لے یا معاذ اللہ شوہر مرتد ہو جائے) اور عورت آزاد ہو ، اور ان عورتوں سے ہو جن کو حیض آتا ہے تو اس کی عدت تین حیض ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : طلاق یافتہ عورتیں اپنے نفوس کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں ۔

اگر جدائی بغیر طلاق کے کے واقع ہو تو وہ بھی طلاق کے حکم میں ہوگی کیونکہ عدت کے ضروری قرار دینے کا مقصد یہ ہے کہ نکاح پر وارد فرقت کی وجہ سے براءۃ رحم ہو جائے (یعنی یہ پتا چل جائے کہ عورت حاملہ ہے یا غیر حاملہ ۔ ورنہ حاملہ ہونے کی صورت میں بچے کے نسب میں التباس پیدا ہو جاتا ہے) ۔

اور بغیر طلاق فرقت میں بھی ہے (کہ براءۃ رحم کی جائے ۔

ہمارے نزدیک قروء سے مراد حیض ہیں اور امام شافعیؒ کے نزدیک قروء سے مراد طہر ہیں ۔ لفظ قروء دونوں

معنوں میں حقیقی طور پر استعمال ہوتا ہے کیونکہ قروء کا لفظ اضداد سے ہے۔ ابن سکیت لغوی کا بھی یہی قول ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ دونوں معنوں کو یکبارگی شامل نہ ہوگا کیونکہ یہ مشترک ہے (اور بیک وقت دونوں معنی مراد نہیں لیے جا سکتے) قروء سے مراد حیض لینا زیادہ مناسب اور راجح ہے۔ اس کی پہلی دلیل یہ ہے کہ قروء کا لفظ جمع ہے (اور جمع میں کم از کم تین افراد ہوتے ہیں) لہذا اگر طہر کے معنوں میں استعمال ہوگا تو جمع نہیں رہے گا کیونکہ اس طہر کا کچھ حصہ پہلے گزر چکا ہوتا ہے جس میں طلاق واقع ہوتی ہے (لہذا کامل تین طہر نہیں بن سکتے حالانکہ جمع کے کم از کم تین کامل افراد ہوتے ہیں)۔

ہماری دوسری دلیل یہ ہے کہ عدت کا مقصد براءۃ رحم ہوتا ہے اور یہ براءۃ حیض ہی سے معلوم ہو سکتی ہے۔ لہذا قروء بمعنی حیض زیادہ مناسب ہوگا۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عدة الأمة حيضتان (یعنی باندی کی عدت دو حیض ہوتی ہے) تو یہ حدیث لفظ قروء کی تشریح قرار پائے گی۔ (کہ جب لونڈی کی عدت کی تعیین حیض سے کی گئی تو حُرہ کی عدت کا تعین بھی حیض ہی سے ہونا چاہیئے)۔

مسئلہ: اگر مطلقہ عورت کم سنی یا بڑھاپے کی وجہ سے ذوات الحیض سے نہ ہو تو اس کی عدت تین ماہ ہوگی۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: واللائی یئسن من المحیض

من نساءکم الآیۃ یعنی جو عورتیں حیض سے نا امید ہو چکی ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی عدت تین ماہ مقرر فرمائی ۔

اسی طرح اس عورت کی عدت بھی تین ماہ ہے جو عمر کے لحاظ سے حد بلوغ کو پہنچ جائے مگر اسے حیض نہ آئے۔ کیونکہ آیت کے آخر میں اسی صورت کا حکم مذکور ہے کہ جن عورتوں کو ابھی تک حیض نہیں آیا ان کی عدت بھی تین ماہ ہوگی ۔

مسئلہ : اگر مطلقہ عورت حاملہ ہو تو اس کی عدت وضع حمل ہوگی ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : وأولات الأحمال أجلهن أن یضعن حملهن ۔ یعنی حاملہ عورتوں کی عدت ختم ہوگی جب وضع حمل ہو جائے۔

مسئلہ : اگر مطلقہ عورت باندی ہو تو اس کی عدت دو حیض ہوگی ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ باندی کی مغلظہ طلاق دو طلاقیں ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہیں ۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ غلامی نعمتوں کو نصف کر دیتی ہے مگر ایک حیض کا نصف نہیں ہو سکتا (کہ اس کی عدت ڈیڑھ حیض مقرر کی جائے) وہ نصف پورا ہو کر اس کی عدت دو حیض ہوں گے ۔ اسی طرف حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اشارہ فرمایا تھا کہ اگر ممکن ہوتا تو میں اس کی عدت ڈیڑھ حیض مقرر کرتا ۔

مسئلہ : اگر مطلقہ باندی ایسی عورتوں سے ہو جنہیں

حیض نہیں آتا تو اس کی عدت ڈیڑھ ماہ ہوگی کیونکہ مہینے کا جزء ہو سکتا ہے۔ لہذا غلامی کے پیش نظر مہینے کی تنصیف ہو جائے گی۔

مسئلہ : اگر حرّہ عورت کا خاوند فوت ہو جائے تو اس کی عدت چار ماہ اور دس دن ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : والذین یتوفون منکم ویذرون أزواجاً یتربصن بأنفسهن أربعة أشهر وعشرا۔ یعنی تم میں جو شخص بیویاں چھوڑ کر فوت ہو جاتے ہیں ان کی بیویوں کی عدت چار ماہ دس دن ہوگی۔

اگر باندی کا خاوند فوت ہو جائے تو اس کی عدت دو ماہ پانچ دن ہوگی۔ کیونکہ غلامی تنصیف کرنے والی ہے۔

اگر کسی عورت کا خاوند اس کے حاملہ ہونے کی صورت میں فوت ہوا تو اس کی عدت وضع حمل کے ساتھ ختم ہوگی۔ کیونکہ اللہ تعالی کا ارشاد "وأولات الأحمال أجلهن أن یضعن حملهن" مطلق ہے۔ (جس میں مطلقہ یا بیوہ کی کوئی قید نہیں) اور عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ جو شخص چاہے میں اس سے مباہلہ کر سکتا ہوں کہ سورۂ نساء اس آیت کے بعد نازل ہوئی جو سورۂ بقرہ میں ہے (تو سورۂ بقرہ کی آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ جو لوگ اپنی عورتوں کو غیر حاملہ چھوڑ کر مریں ان کی عورتوں کی عدت چار ماہ دس دن ہوگی۔ سورۂ نساء کی آیت حاملہ عورتوں کے بارے میں ہے)'

میں بھی جنا کہ اس کا مردہ شوہر ابھی چار پائی (یا تختے) پر پڑا ہو تو بھی یقیناً اس کی عدت پایۂ اختتام تک پہنچ گئی اور اس کے لیے جائز ہے کہ دوسرے شوہر سے نکاح کرلے۔

مسئلہ : جب شوہر نے مرض موت میں عورت کو طلاق دی مگر یہ عورت شوہر کی وارث بنی تو اس کی عدت دونوں مدتوں میں سے طویل مدت ہوگی (مسئلے کی صورت یہ ہے کہ شوہر نے حالت مرض میں عورت کو طلاق دی اور اسی مرض سے اس کی وفات ہوگئی۔ ابھی عورت کی عدت طلاق گزری نہیں تھی کہ شوہر کی وفات ہو گئی۔ تو یہ عورت مرد کے مال میں وارث ہوگی اب مسئلہ یہ ہے کہ عورت عدت طلاق پوری کرے یا عدت وفات) یہ صورت امام اعظمؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک ہے (کہ دونوں میں سے دراز مدت کی تکمیل کرے)۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اس کی عدت تین حیض ہوگی اور یہ اختلاف اس صورت میں ہے جب کہ طلاق بائنہ ہو یا تین ہوں۔ لیکن اگر اسے رجعی طلاق دی گئی ہو تو بالاتفاق وہ عدت وفات پوری کرے گی۔

امام ابو یوسفؒ کی دلیل یہ ہے کہ طلاق کی وجہ سے نکاح موت سے پہلے ہی منقطع ہو چکا ہے اور اس میں تین حیض کی عدت لازم آتی ہے۔ عدت وفات تو اس صورت میں ضروری ہوتی جب کہ نکاح کا انقطاع موت کے سبب ہوتا۔

اس سے عدت میں تغیر نہ ہوگا۔ بخلاف طلاق رجعی کے کیونکہ رجعی کی صورت میں نکاح ہر لحاظ سے باقی رہتا ہے۔

طرفینؒ کی دلیل یہ ہے کہ جب وراثت میں حق نکاح کی بقاء تصور کی جاتی ہے تو یہی بقاء حق عدت میں بھی متصور ہو سکتی ہے اور احتیاط بھی اسی میں ہے لہذا دونوں کو جمع کر دیا جائے گا (کہ جس طرح نکاح بسلسلۂ میراث باقی ہے اسی طرح بحق عدت بھی باقی ہوگا)۔

اگر عورت کا شوہر مرتد ہونے کی بناء پر قتل کر دیا گیا اور وہ اس کی وارث بنی تو اس کی عدت میں بھی اختلاف ہے۔ بعض مشائخ کا قول ہے کہ ایسی عورت کی عدت بالاتفاق حیض سے ہوگی کیونکہ اس صورت میں نکاح کو موت کے وقت تک بسلسلۂ میراث باقی نہیں ٹھہرائیں گے کیونکہ مسلمہ عورت کسی کافر کی وارث نہیں ہو سکتی (بلکہ شوہر کے مرتد ہوتے ہی نکاح ختم ہو جائے گا اور چونکہ وہ واجب القتل ہے لہذا اس کی طرف سے جدائی ،رقبل الموت کے مریض کی طلاق کی طرح ہوگی اور عورت وارث ہو گی)۔

مسئلہ : اگر طلاق رجعی کی صورت میں عدت کے اندر اندر باندی کو آزاد کر دیا گیا تو اس کی عدت آزاد عورتوں جیسی ہو جائے گی کیونکہ نکاح ہر لحاظ سے باقی تھا۔

مسئلہ : اگر باندی طلاق بائن کی عدت گزار رہی ہو یا عدت وفات اور اسے آزاد کر دیا جائے تو اب اس کی

عدت حرہ عورتوں کی عدت کی طرف منتقل نہ ہوگی کیونکہ پہلا نکاح طلاق بائن یا وفات شوہر کی وجہ سے زائل ہو چکا ہوتا ہے۔

مسئلہ : اگر مطلقہ عورت آئسہ تھی۔ اس نے مہینوں کا حساب کر کے عدت گزار دی۔ لیکن بعد میں خون جاری ہو گیا تو اس کی پہلی عدت ٹوٹ گئی اور اسے نئے سرے سے اپنی عدت حیض کے لحاظ سے پوری کرنا ہوگی۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ عورت نے خون معمول کے مطابق دیکھا کیونکہ خون کے دوبارہ آنے سے اس کا آئسہ ہونا ختم ہو گیا۔ یہی صحیح ہے تو معلوم ہو گیا کہ مہینوں کی عدت قائم مقام نہیں ہو سکتی۔ (یعنی عدت میں اصل یہی ہے کہ حیضوں سے مکمل کی جائے۔ لیکن اگر صغر یا کبر کی وجہ سے حیض نہ آئے تو مہینوں کا حساب لگایا جاتا ہے اوریہی تین ماہ تین حیضوں کے قائم مقام ہو جاتے ہیں۔ پس اگر ایک عورت نے گمان کیا کہ وہ حیض سے مایوس ہو چکی ہے اور وہ مہینوں کے حساب سے عدت گزارنے لگی اور بعد میں اسے حیض کا خون حیض کے مطابق جاری ہو گیا تو یہ آئسہ نہیں رہیگی۔ لہذا مہینے حیض کے قائم مقام نہ ہو سکیں گے) کیونکہ قائم مقام ہونے کی شرط یہ ہے کہ اصل یعنی حیض سے مایوسی ثابت ہو جائے اور یہ ثبوت اس وقت متحقق ہو سکتا ہے جب کہ مرتے دم تک حیض نہ آئے۔ جیسا کہ شیخ فانی کے لیے روزے کا

فدیہ ہے (کہ فدیہ اسی صورت میں کار آمد ہوگا جبکہ بوڑھا موت تک روزہ رکھنے پر قادر نہ ہو سکے) ۔

مسئلہ : اگر کسی مطلقہ کو عدت کے دوران دو بار حیض آیا ۔ لیکن پھر مایوسی ہو گئی تو وہ مہینوں کے حساب سے اپنی عدت گزارے تاکہ بدل اور مبدل منہ میں جمع لازم نہ آئے ۔

مسئلہ : جس عورت سے نکاح فاسد کیا گیا (اور اس سے مجامعت بھی کر لی گئی) یا کسی عورت سے شبہ میں مجامعت کرلی گئی (تو ان دونوں پر عدت لازم ہوگی) اور ان کی عدت فرقت حیض سے ہوگی ۔ کیونکہ اس عدت کا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ عورت کا رحم حمل سے خالی ہے اور یہ عدت کسی حق نکاح کے پورا کرنے کے لیے نہیں ہوتی اور اس کی شناخت کے لیے حیض ہی مخصوص ہے (لہذا عدت بذریعہ حیض ہی ہوگی) ۔

مسئلہ : اگر ام ولد کا مولی وفات پا گیا ۔ یا اس نے اسے آزاد کر دیا تو ام ولد کی عدت تین حیض ہوگی ۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی عدت صرف ایک حیض ہوگی ۔ کیونکہ یہ عدت ملک یمین کے زائل ہونے سے واجب ہوئی ہے اس لیے استبراء کے مشابہ ہوگی ۔ (اگر کوئی شخص موطوءہ باندی فروخت کرے تو مشتری کے ذمے استبراء

کرسکتا ہے اسی طرح ملک یمین کے زائل ہونے سے بھی ایک حیض کو عدت بنایا جا سکتا ہے) ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ ام ولد کی عدت اس لیے واجب ہوئی ہے کہ وہ فراش نہیں رہی اس لیے عدت نکاح کے مشابہ ہوگئی ۔ نیز اس حکم میں ہمارے مقتدا و امام حضرت عمرؓ ہیں ۔ ان کا ارشاد ہے کہ ام ولد کی عدت تین حیض ہیں ۔

مسئلہ : اگر ام ولد ان عورتوں سے ہو جن کو حیض نہیں آتا تو اس کی عدت تین ماہ ہوگی ۔ جیسے نکاح میں ہوتا ہے یعنی جس طرح زوال نکاح میں ایسی عورت کی عدت تین ماہ ہوتی ہے) ۔

مسئلہ : اگر نابالغ لڑکا اپنی بیوی چھوڑ کر مرگیا جو حاملہ تھی ، تو طرفینؒ کے نزدیک اس کی عدت وضع حمل سے پوری ہوگی ۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اس کی عدت چار ماہ دس دن ہوگی ۔ امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے (امام احمدؒ کا بھی یہی مسلک ہے) کیونکہ اس حمل کا نسب صغیر سے ثابت نہیں ۔ تو یہ ایسا ہوگیا جیسے صغیر کے مرنے کے بعد حمل ہوا ہو ۔

طرفینؒ کی دلیل یہ ہے کہ ارشاد باری تعالی : "وأولات الأحمال أجلهن أن يضعن حملهن" مطلق ہے ۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل ہی سے ختم ہو جاتی ہے خواہ یہ مدت قلیل ہو یا کثیر

یہ اس لیے نہیں ہوتی کہ رحم کا حمل سے خالی ہونا معلوم کیا جائے۔ کیونکہ مہینوں کے لحاظ سے عدت وفات اس عورت کے لیے مشروع ہے جس کو حیض آیا کرتا ہے۔ بلکہ یہ عدت تو حق نکاح کی ادائیگی کے لیے ہے اور حق نکاح کی ادائیگی تو صغیر کی صورت میں بھی موجود ہے۔ اگرچہ حمل اس کے نطفہ سے نہ ہو۔ البتہ اس حمل کی صورت اس سے قطعاً مختلف ہے جو وفات کے بعد حادث ہو۔ کیونکہ اس سے پہلے مہینوں کے ساتھ عدت واجب ہو چکی ہے لہذا بعد میں حمل کے حدوث سے تبدیل نہ ہوگی۔

اور زیر بحث مسئلے میں عدت شروع ہی سے حمل کی مدت کے ساتھ واجب ہوئی ہے (کیونکہ جب صغیر کی وفات ہوئی تو یہ حاملہ تھی) تو اس کا اختتام وضع حمل ہی سے ہوگا پس دونوں مسئلوں میں فرق ظاہر ہو گیا۔ اس اصول کے پیش نظر آپ کا بالغ کی زوجہ والا اعتراض بھی وارد نہ ہوگا کہ جب بالغ خاوند وفات پا جائے اور حمل بعد میں ظاہر ہو۔ کیونکہ حمل کا نسب اس بالغ سے ثابت ہوگا تو گویا وہ حمل موت کے وقت ہی موجود تھا۔

مسئلہ: دونوں صورتوں میں (یعنی خواہ صغیر کی موت کے وقت حمل ہو یا بعد میں ظاہر ہو) بچے کا نسب ثابت نہ ہوگا۔ کیونکہ صغیر میں تو ابھی نطفے کا وجود ہی نہیں۔ لہذا حمل اس کی طرف سے متصور نہ ہوگا اور نکاح

کو مجامعت کے قائم مقام وہاں کیا جاتا ہے جہاں مجامعت متصور ہو سکے ۔

مسئلہ : اگر کسی مرد نے اپنی عورت کو حالت حیض میں طلاق دے دی تو اس حیض کو جس میں طلاق واقع ہوئی عدت میں شمار نہیں کیا جائے گا ۔ کیونکہ عدت تین مکمل حیضوں سے پوری ہوتی ہے لہذا اس میں کمی نہ کی جائے گی (اور تین مزید حیض پورے کیے جائیں گے کیونکہ جس حیض میں طلاق واقع ہوئی ہے وہ نامکمل ہے ۔

مسئلہ : اگر معتدہ عورت کے ساتھ (جائز سمجھتے ہوئے) شبہ میں مجامعت کی گئی تو اس عورت پر دوسری عدت واجب ہوگی اور دونوں عدتیں ساتھ ساتھ شمار ہوں گی اور صورت یہ ہوگی کہ اس کے بعد عورت کو جو حیض آئے گا وہ دونوں عدتوں میں شمار ہوگا ۔ اور جب پہلی عدت تکمیل پذیر ہو گئی اور مکمل نہ ہوئی تو عورت پر دوسری کی تکمیل بھی واجب ہوگی ۔ یہ صورت احناف کے نزدیک ہے ۔ (اس مسئلے کی وضاحت اس مثال سے ہو جائے گی کہ ایک عورت طلاق بائن کی عدت گزار رہی ہے ۔ ایک حیض کے اختتام کے بعد اس سے شبہ میں وطی کر لی گئی تو اب تین حیض کی دوسری عدت بھی واجب ہو گئی ۔ اب جو حیض آئے گا وہ پہلی عدت کا دوسرا حیض ہوگا اور دوسری عدت کا پہلا ۔ اس کے بعد جو آئے وہ پہلی عدت کا تیسرا ہوگا جس سے پہلی عدت اختتام پذیر ہو گئی مگر دوسری عدت کا

دوسرا حیض ہوگا۔ اس کے بعد اسے ایک اور حیض کا انتظار کرنا پڑے گا۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ دونوں عدتیں ایک دوسرے میں داخل نہ ہونگی۔ کیونکہ عدت سے مقصود عبادت یا احکام خداوندی کی تکمیل ہے اور وہ یہ کہ عورت اپنے آپ کو نکاح ثانی کرنے اور باہر نکلنے سے روکے رکھے تو دو عبادتیں یکبارگی ادا نہیں ہوتیں۔ جیسے کہ ایک ہی دن میں دو روزے نہیں رکھے جا سکتے۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ عدت سے مقصود ہی یہ معلوم کرنا ہے کہ رحم حمل سے خالی ہے اور اس کا علم ایک ہی عدت سے حاصل ہو جاتا ہے۔ لہذا دوسری عدت کو بھی اس کے ساتھ ہی شمار کر لیا جائے گا اور اس مسئلے میں عبادت کا پہلو عدت کے مقصد کے تابع ہوگا کیا آپ کو یہ تسلیم نہیں کہ عورت کے علم اور اپنے آپ کو روکے بغیر بھی عدت گذر جاتی ہے۔ (مثلاً مرد نے اسے سفر میں طلاق دے دی اور عدت بھی دوران سفر ہی گزر گئی تو اس صورت میں عورت کو نہ طلاق کا علم ہؤا نہ عدت کا۔ اسی طرح عورت اگر عدت میں گھر سے نکلے اور دوسرے سے نکاح کر لے تو نکاح فاسد ہوگا مگر عدت باطل نہ ہوگی۔ اگر یہ عدت صرف عبادت ہی عبادت ہوتی تو عورت کے علم و اختیار کا ضرور دخل ہوتا)۔

مسئلہ: اگر وفات کی عدت پورا کرنے والی عورت سے

شبہ میں مجامعت ہو جائے تو وہ مہینوں کے حساب سے اپنی عدت پوری کرے گی اور اس دوران میں جو حیض آئے اس کو دوسری عدت میں شمار کرے گی تا کہ حتی الامکان دونوں عدتوں کا یکبارگی شمار ہو سکے ۔

مسئلہ : طلاق کی صورت میں عدت کی ابتداء طلاق کے بعد شروع ہوگی اور وفات کی صورت میں شوہر کے فوت ہوتے ہی ۔ اگر عورت کو طلاق یا خاوند کی وفات کا علم نہ ہو سکے حتیٰ کہ عدت کی مدت گزر جائے تو اس سے عدت ختم ہو جائے گی کیونکہ عدت کے واجب ہونے کا سبب طلاق یا وفات ہے لہذا اس کی ابتداء بھی سبب کے موجود ہونے کے وقت سے شمار ہوگی ۔

سمرقند و بخارا کے احناف مشائخ کا فتوی اس بارے میں یہ ہے کہ عدت کی ابتداء اقرار کے وقت سے ہوگی تا کہ باہمی قرارداد کا الزام دور ہو سکے (مثلاً کوئی شخص اپنی عورت سے کہے کہ میں نے چار ماہ سے تمہیں طلاق دے دی تو مرد کی بات کو تسلیم کر لیا جائے گا ۔ لیکن اگر طلاق کے چند روز بعد ہی عورت مرد سے کہے کہ آپ مجھے طلاق تو دے ہی چکے ہیں اگر انقضاء عدت کا بھی اقرار کر لیں تو میرے لیے سہولت ہو جائے گی تو مشائخ نے باہمی مشورت کے اس الزام کو دور کرنے کے لیے مذکورہ اصول پیش کیا) ۔

مسئلہ : نکاح فاسد میں عدت کا آغاز تفریق کے بعد سے

ہوگا یا اس وقت سے جب سے مجامعت کرنے والے نے ترک مجامعت کا عزم کیا ہو۔ امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ عدت سب سے آخری مجامعت کے بعد شروع ہوگی کیونکہ مجامعت ہی عدت کے واجب ہونے کا سبب ہے۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ عقد فاسد میں جتنی بار بھی مجامعت کی گئی وہ سب بمنزلہ ایک مجامعت کے ہوں گی کیونکہ سب کی نسبت ایک ہی عقد فاسد کی طرف ہے۔ لہذا ان تمام مجامعتوں کے عوض فقط ایک ہی مہر دیا جاتا ہے تو جب تک کہ باہمی جدائی نہ ہو یا ترک مجامعت کا عزم نہ ہو تب تک عدت کا واجب ہونا ثابت نہ ہوگا کیونکہ ابھی مجامعت کے پائے جانے کا احتمال باقی ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ وطی شبہ پر قابو پانے کو بھی حقیقی مجامعت کے قائم مقام مانا جائے گا کیونکہ مجامعت ایک مخفی امر ہے اور ضرورت یہ در پیش ہے کہ مجامعت کرنے والے کے علاوہ دوسرے مرد کے حق میں حکم معلوم ہو سکے (یعنی یہ معلوم کرنا پڑتا ہے کہ نکاح فاسد کے بعد جو شخص اس عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے وہ نکاح کس وقت کر سکتا ہے کیونکہ عورت جب تک پہلے مرد کے قابو میں ہے امکان مجامعت موجود ہے لہذا تفریق یا ترک وطی کے عزم سے پہلے پہلے عدت کے حکم کا آغاز ممکن نہیں کیونکہ وطی کے متعلق یہ معلوم کرنا کہ یہ آخری ہوگی یقینی نہیں ہے)۔

مسئلہ : اگر معتدہ عورت نے کہا کہ میری عدت گزر چکی ہے اور شوہر نے اس بات کو جھٹلایا تو عورت اگر قسم کھا کر اپنے قول کی تصدیق کر دے تو اس کی بات تسلیم کی جائے گی کیونکہ اس (عدت کے بارے) میں وہ امینہ تصور کی جاتی ہے ۔ مگر چونکہ اس پر کذب بیانی کا الزام لگایا گیا ہے اس لیے مودع (جس کے پاس امانت رکھوی گئی ہو اس) کی طرح اسے قسم کھانا پڑے گی (مودع اگر قسم کھا کر کہہ دے کہ میں امانت واپس کر چکا ہوں تو اس کا قول قابل قبول ہوتا ہے) ۔

مسئلہ : اگر کسی نے عورت کو طلاق بائن دے دی ۔ پھر عدت میں اس سے نکاح کر لیا ۔ مگر دخول سے پہلے ہی اسے پھر طلاق دے دی تو مرد کو پورا مہر ادا کرنا ہوگا اور عورت پر مستقل عدت ہوگی ۔ یہ صورت امام اعظمؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ہے ۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ مرد پر نصف مہر واجب ہوگا اور عورت پر پہلی عدت کی تکمیل ہی ضروری ہوگی کیونکہ طلاق اسے قبل الدخول دی گئی ہے لہذا نہ تو مرد پر پورا مہر واجب ہوگا اور نہ ہی عورت کو عدت کی از سر نو ابتداء کرنا ہوگی ۔ رہا پہلی عدت کا پورا کرنا تو وہ پہلی طلاق کی وجہ سے واجب ہے کیونکہ دوسرے نکاح کا حال ظاہر نہیں ہوا ۔ مگر جب دوسرا نکاح طلاق سے زائل ہو گیا تو طلاق اول کا حکم ظاہر ہو جائے گا ۔ جیسا کہ کوئی شخص

اگر ام ولد خرید کر آزاد کر دے۔ (یعنی اگر کسی نے منکوحہ لونڈی کو جس سے اس کی اولاد پیدا ہوئی تھی قیمةً خرید کر آزاد کر دیا تو خرید کی وجہ سے اس کا نکاح زائل ہو کر دو حیض کی عدت واجب ہوئی۔ پھر آزاد کرنے سے تین حیض کی عدت واجب ہے کیونکہ مملوکہ ہونے سے اس کے حق میں عدت ظاہر نہ تھی اور زوال ملک کے بعد حکم عدت ظاہر ہو گیا)۔

امام اعظمؒ اور امام ابو یوسفؒ کی دلیل یہ ہے کہ عورت در اصل پہلی مجامعت ہی کی وجہ سے اپنے شوہر کے قبضہ میں ہے اور پہلی مجامعت کا اثر یعنی عدت ابھی باقی ہے۔ لہذا جب مرد نے اس سے نیا نکاح کیا اور عورت ابھی شوہر کے قبضہ ہی میں ہے تو یہ پہلا قبضہ دوسرے نکاح کے واجب قبضے کا قائم مقام ہو گیا۔ جیسا کہ کسی شخص نے دوسرے کے غلام کو چھین کر اپنے قبضے میں کر لیا۔ پھر اسی کو مالک سے خرید لیا۔ جب کہ وہ پہلے ہی سے اس کے قبضہ میں موجود ہے تو پہلا قبضہ ہی قبضۂ خرید کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔ پس اس مثال سے ظاہر ہو گیا کہ نکاح دوم کے بعد جو طلاق واقع ہوئی ہے وہ طلاق بعد الدخول ہے۔ یعنی پورا مہر اور عدت واجب ہوگی۔

امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ عورت پر عدت لازم ہی نہیں کیونکہ پہلی عدت تو نکاح ثانی سے ساقط ہو گئی۔ لہذا دوبارہ نہ ہوگی اور طلاق کی صورت میں دوسری مرتبہ عدت واجب

ہی نہیں (کہ طلاق قبل الدخول ہے) اس کا جواب بھی وہی ہے جو ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں ۔

مسئلہ : اگر ذمی مرد ذمیہ عورت کو طلاق دے دے تو ذمیہ پر عدت لازم نہیں ۔ اسی طرح اگر حربیہ عورت مسلمان ہو کر ہمارے پاس پہنچ جائے (تو اس پر عدت واجب نہ ہوگی اگر وہ نکاح کرے تو جائز ہے ۔ البتہ حاملہ ہونے کی صورت میں نکاح جائز نہیں ۔ یہ تمام صورتیں امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ہیں ۔

صاحبینؒ کہتے ہیں کہ حربیہ پر بھی عدت واجب ہے ۔ اور ذمیہ پر بھی ۔ ذمیہ پر وجوب عدت کی دلیل یہ ہے کہ ذمیہ کے بارے میں جو اختلاف ہے یہ اسی طرح کا ہے جو ذمیوں کا دائمی حرام عورتوں سے نکاح کرنے کے بارے میں ہے اور ہم اس کو کتاب النکاح میں اہل شرک کے نکاح کے باب میں بیان کر چکے ہیں ۔

اور امام ابو حنیفہؒ کا قول اس صورت میں ہے جب ذمیوں کا یہ اعتقاد ہو کہ مطلقہ پر عدت واجب نہیں ہوتی ۔

اور جو عورت مشرف بہ اسلام ہو کر دارالاسلام میں آئے ۔ صاحبینؒ اس کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اگر فرقت کسی دوسرے سبب سے وقوع پزیر ہوتی تو عدت واجب ہوتی ۔ اسی طرح دارالکفر کو چھوڑ کر دارالاسلام میں آنے سے بھی جو فرقت واقع ہوئی ہے اس سے عدت بھی واجب ہوگی ۔ بخلاف اس کے اگر شوہر مشرف بہ اسلام ہو کر

دارالاسلام میں چلا آئے اور عورت کو دارالحرب میں چھوڑ آئے تو اس پر عدت نہ ہوگی کیونکہ اس تک حکم شریعت نہیں پہنچا۔

امام ابو حنیفہؒ کی دلیل باری تعالی کا یہ ارشاد ہے: «لاجناح علیکم أن تنکحوهن» ۔ یعنی جو عورتیں دارالحرب سے مشرف بہ اسلام ہو کر تمہارے پاس آ جائیں تمہیں ان کے ساتھ نکاح کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ بنی آدم یعنی انسانوں کے حق کو مد نظر رکھتے ہوئے ہی عدت واجب کی جاتی ہے (یعنی پہلے شوہر کے حق کو ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ اگر عورت بچہ جنے تو اس کا نسب ثابت رہے) مگر حربی کا کوئی حق نہیں کیونکہ وہ تو جمادات کی مانند ہے حتی کہ وہ ملکیت میں آ سکتا ہے۔ البتہ حربیہ حاملہ ہو (تو پھر وضع حمل سے پہلے اس سے نکاح جائز نہ ہوگا) کیونکہ اس کے پیٹ میں ایسا بچہ ہے جس کا نسب ثابت ہے۔

امام حسنؒ نے ابو حنیفہؒ سے ایک روایت یہ بھی کی ہے کہ حاملہ سے نکاح تو جائز ہوگا مگر اس سے مجامعت نہ کرے۔ جیسا کہ زنا کی وجہ سے حاملہ کے ساتھ نکاح تو جائز ہے مگر مجامعت جائز نہیں۔ لیکن پہلا قول ہی زیادہ صحیح ہے (کہ وضع حمل سے قبل نکاح جائز نہ ہوگا)۔

# فصل

امام قدوری فرماتے ہیں کہ جو عورت اپنے شوہر سے (ایک طلاق بائنہ یا تین طلاق یا خلع وغیرہ سے) جدا ہو جائے یا جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے اور وہ عورت بالغہ ہو اور مسلمان ہو تو اس پر سوگ کرنا واجب ہے۔ جہاں تک اس عورت کا تعلق ہے جس کا خاوند فوت ہو جائے تو اس کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "کسی عورت کے لیے جو اللہ تعالی اور آخرت پر ایمان رکھتی ہو جائز نہیں کہ وہ کسی مرنے والے پر تین دن سے زیادہ سوگ منائے۔" البتہ اپنے خاوند کی وفات پر چار ماہ دس دن تک جائز ہے۔ رہا ایسی عورت پر سوگ کا واجب ہونا جو شوہر سے جدا ہو گئی ہو تو یہ فقط ہمارے نزدیک ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ ایسی عورت پر سوگ لازم نہیں کیونکہ سوگ تو ایسے خاوند کی وفات پر منایا جاتا ہے جس نے مرتے دم تک عورت کی ذمہ داریوں کے ساتھ نباہ کیا ہو۔ مگر جس شوہر نے اسے جدا کر دیا اس نے تو عورت کی پریشانیوں میں اضافہ کر دیا لہذا اس کے جدا ہونے پر اظہار تأسف کی کیا ضرورت ہے؟

ہماری دلیل حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے جس میں

آپؐ نے عدت گزار عورت کو حنّاء کے استعمال سے منع فرمایا اور کہا کہ حناء خوشبو ہوتی ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ نعمت نکاح کے زائل ہونے پر اظہار تاسف کرنے کے لیے سوگ واجب ہے۔ کیونکہ نکاح عورت کے لیے عصمت و حفاظت کا ذریعہ اور اس کی تمام ضروریات کا کفیل تھا۔ اور یہ جدائی شوہر کی موت کی جدائی سے زیادہ اضطراب انگیز ہے۔ چنانچہ جدائی سے پہلے وہ اپنے مردہ شوہر کو غسل دے سکتی ہے مگر جدا ہونے کے بعد جائز نہیں۔

حداد یا احداد (لغۃ میں دونوں صحیح ہیں۔) یہ ہے کہ عورت خوشبو، زینت، سرمہ اور خوشبو دار یا غیر خوشبو دار تیل کا استعمال ترک کر دے۔ ہاں کسی مجبوری کی بناء پر ان کا استعمال روا ہو سکتا ہے۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا کہ کسی درد یا تکلیف کی وجہ سے استعمال کی اجازت ہے۔

سوگ منانے کے دو مقصد ہیں۔ ایک یہ کہ نکاح کے زائل ہونے پر اظہار تأسف کیا جائے اور دوسرا یہ ہے کہ متذکرہ بالا زیب و زینت کی چیزیں عورت کی طرف رغبت دلاتی ہیں۔ حالانکہ اس عورت کو نکاح کی ممانعت ہے لہذا وہ ان اشیاء کے استعمال سے بھی گریز کرے کہ کہیں یہی چیزیں حرام (یعنی عدت کے دوران نکاح) میں پڑنے کا باعث نہ بن جائیں۔ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ

نے عدت گزار عورت کو سرمہ استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی تھی -

تیل کوئی بھی ہو ، اس میں کوئی نہ کوئی خوشبو ضرور ہوتی ہے - اور اس میں بالوں کی زینت بھی ہوتی ہے - اس لیے احرام باندھنے والے شخص کو تیل لگانے سے منع کیا گیا ہے -

امام قدوری کے قول "إلا من عذر" سے مراد ہے کہ ان اشیاء کا استعمال بطور دوا جائز ہے ، زینت کے لیے جائز نہیں - مثلاً اگر عورت روزانہ تیل کے استعمال کی عادی ہو ، اسے اندیشہ ہو کہ تیل ترک کرنے سے سر میں درد ہوجائے گا - اگر اسے اس بات کا ظاہری طور پر علم ہوسکے تو اس کے لیے تیل کا استعمال مباح ہوگا - کیونکہ جس امر کے واقع ہونے کا غالب گمان ہو وہ واقع ہونے والے کی طرح ہے - اگر ریشمی کپڑے کا استعمال بھی اس کے لیے ناگزیر ہو تو عذر کی بناء پر استعمال کرنے میں حرج نہ ہوگا -

مسئلہ : عدت گزار عورت حناء کا رنگ بھی استعمال نہ کرے - اس سلسلے میں ایک حدیث پہلے بیان کی جاچکی ہے - نیز معتدہ عورت کسم اور زعفران سے رنگا ہوا کپڑا نہ پہنے کیونکہ اس سے خوشبو نکل کر ادھر ادھر پھیلتی ہے -

مسئلہ : امام قدوری فرماتے ہیں کہ کافرہ پر سوگ منانا واجب نہیں کیونکہ وہ حقوق شرع کی پابند نہیں - اسی طرح نابالغہ عورت کے لیے بھی سوگ منانا ضروری

نہیں ۔ کیونکہ شرعی حقوق کے ساتھ ابھی تک اسے مخاطب نہیں کیا گیا ۔

مسئلہ : عدت گزار باندی پر سوگ کرنا واجب ہے کیونکہ وہ اللہ تعالی کے ان احکام کی پابند ہے جن میں اس کے مالک کا حق باطل نہیں ہوتا ۔ البتہ اسے گھر سے نکلنے سے نہیں روکا جا سکتا کیونکہ اس سے مولی کا حق باطل ہوتا ہے ۔ (اگر وہ گھر سے باہر نہ جائے تو مولی کے کام کاج کیسے سر انجام دے سکے گی کیونکہ مالک ایک بندۂ محتاج ہے جسے باندی سے خدمت لینے کی حاجت درپیش ہے لہذا اس کی حاجت کو شرع پر مقدم کیا گیا ۔

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ امّ ولد اور نکاح فاسد کی عدت میں سوگ منانا ضروری نہیں ۔ کیونکہ ان کے حق میں نعمت نکاح کا ازالہ نہیں ہوا کہ اظہار تأسف کریں ۔ اور مباح ہونا اصل کی حیثیت رکھتا ہے (کیونکہ زیب و زینت دراصل مباح ہے اسے کسی عارضے کی بناء پر ہی ترک کیا جا سکتا ہے) ۔

مسئلہ : جو عورت عدت کے ایام گزار رہی ہو اس کی طرف منگنی کا پیغام بھیجنا مناسب نہیں ۔ ہاں اشارے اور کنائے سے کام لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ۔ باری تعالی کا ارشاد ہے "لا جناح عليكم فيما عرضتم به من خطبة النساء أو أكننتم في أنفسكم ، علم الله أنكم ستذكرونهن ولكن لا تواعدوهن سراً إلا أن تقولوا قولاً معروفا" ۔ یعنی اگر تم

معتدہ عورتوں کی منگنی کے لیے اشارے سے کام لو تو کوئی مضائقہ نہیں یا اسے اپنے دل میں چھپاؤ۔ اللہ تعالی جانتے ہیں کہ تم عنقریب ہی ان سے منگنی کرنا چاہو گے۔ لیکن تم ان کے ساتھ کوئی پوشیدہ معاہدہ نہ کرو۔ ہاں بھلائی کی بات کر سکتے ہو۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ "سر" سے مراد نکاح ہے۔

ابن عباس رض فرماتے ہیں کہ تعریض یہ ہے کہ مرد معتدہ کے پاس جا کر (نکاح کی بات چیت چھیڑے اور) کہے کہ میرا ارادہ ہے کہ میں شادی کراوں۔

قول معروف کی توضیح کرتے ہوئے سعید بن جبیر رض فرماتے ہیں: مثلاً وہ اس قسم کے الفاظ ادا کرے: "إنی فیك لراغب" "وإنی أرید أن أن تجتمع"۔ یعنی مجھے تجھ سے رغبت ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تو (میرے ساتھ) یک جا ہو جائے۔

مسئلہ: جس عورت کو طلاق رجعی دی گئی ہو یا بائن قطعی اسے رات یا دن کے وقت اپنے گھر سے نکلنا جائز نہیں۔ اور جس کا شوہر مر گیا ہو وہ دن کے وقت اور کچھ رات گئے نکل سکتی ہے، لیکن وہ اپنے گھر کے علاوہ کہیں رات بسر نہ کرے۔ مطلقہ کے بارے میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ انہیں گھروں سے مت نکالو اور نہ وہ خود نکلیں۔ مگر اس صورت میں کہ فاحشہ مبینہ (کھلی بے حیائی) کا ارتکاب کریں۔ بعض فقہاء نے کہا کہ یہاں فاحشۃ مبینۃ سے

مراد ہی گھر سے نکلنا ہے اور بعض نے کہا کہ اس سے مراد زنا ہے (کہ اگر زنا کا ثبوت ہو جائے تو ان پر) حد لگانے کے لیے نکالا جائے گا۔

جس عورت کا شوہر مر چکا ہو اسے گھر سے نکلنے کی اجازت اس لیے دی جاتی ہے کہ اس کے پاس ضروریات کی کفالت کے لیے اخراجات نہیں ہوتے ۔ لہٰذا طلب معاش کے سلسلے میں اسے مجبوراً گھر سے باہر جانا پڑتا ہے اور کبھی کبھی رات کے آنے تک اسے گھر سے باہر رہنا پڑتا ہے مگر مطلقہ کی یہ صورت نہیں ہوتی کیونکہ اس کے اخراجات اس کے شوہر کے مال سے پورے کیے جاتے ہیں ۔ ہاں اگر عورت نے اپنی عدت کے نفقے کے عوض شوہر سے خلع لیا ہو تو (بعض علماء کے نزدیک وہ دن کے وقت نکل سکتی ہے ۔ مگر بعض حضرات ممانعت خروج کے قائل ہیں کیونکہ اس نے اپنا حق خود ساقط کیا ہے اس کی وجہ سے عدم خروج کا وہ حق جو اس پر واجب ہے) ساقط نہ ہوگا۔

مسئلہ : عدت گزار عورت پر واجب ہے کہ اسی گھر میں اپنی عدت پوری کرے جو جدائی یا شوہر کی وفات کے وقت اس کی سکونت کا گھر کہلاتا ہو ۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ان عورتوں کو ان کے گھروں سے مت نکالو ۔ اور جس بیت کی نسبت عورت کی طرف کی گئی ہے وہ وہی گھر ہوتا ہے جس میں عورت سکونت پذیر ہو ۔ لہٰذا اگر وہ اپنے میکے والوں سے ملنے گئی ہوئی ہو اور اس کا خاوند اسے

طلاق دے دے تو عورت پر واجب ہے کہ وہ اپنے گھر لوٹ آئے اور اسی گھر میں عدت گزارے۔

آنحضرت ﷺ نے اس عورت کو فرمایا جس کا خاوند شہید ہوچکا تھا کہ اپنے ہی گھر میں قیام کر حتی کہ (قرآن کے مطابق) تمہاری عدت مکمل ہوجائے۔

مسئلہ : اگر متوفی شوہر کے گھر میں سے عورت کا حصہ اس کی رہائش کے لیے ناکافی ہو اور دوسرے وارث اپنے حصوں میں اسے رہنے نہ دیتے ہوں تو عورت وہاں سے منتقل ہو سکتی ہے کیونکہ یہ انتقال معذوری کی بناء پر ہے اور معذوری تو عبادات میں بھی مؤثر ہوتی ہے۔ جیسا کہ اگر وہاں رہنے میں عورت کو اپنے مال و متاع کے لٹ جانے کا خطرہ ہو، یا بوسیدگی کی وجہ سے مکان کے گرنے کا اندیشہ ہو، یا مکان کرائے کا ہو مگر وہ کرایہ ادا کرنے سے قاصر ہو تو جس طرح ان تمام صورتوں میں وہ مکان تبدیل کر سکتی ہے اسی طرح زیر بحث صورت میں بھی مکان بدل سکتی ہے)۔

مسئلہ : اگر میاں بیوی کے درمیان طلاق بائن یا تین طلاقوں کی بناء پر فرقت واقع ہوجائے، تو دونوں کے درمیان پردہ ہونا ضروری ہے تاکہ الگ الگ رہ سکیں (اور پردہ ہو) تو پھر ایک مکان میں رہنے میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ اگر شوہر کو اس کی حرمۃ کا اعتراف ہے (تو ایک ہی گھر میں رہنے میں کوئی منافقہ نہیں) البتہ اگر مرد بدکار

اور اوباش قسم کا ہو جس سے بدکاریؔ کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں عورت وہاں سے نکل سکتی ہے کیونکہ تحفظ عصمت بھی شرعی عذر ہے۔ لیکن جس مکان میں منتقل ہو کر جائے وہاں سے باہر نہ نکلا کرے۔ سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ مرد خود اس گھر سے نکل جائے اور عورت کو وہاں رہنے دے۔

مسئلہ : اگر دونوں نے اپنے درمیان ایک قابل اعتماد عورت کو حائل کرلیا جس کو برائی سے روکنے کی قدرت ہو تو بہت مناسب ہوگا اور اگر وہ مکان دونوں میں تنگ ہو تو عورت کو نکل جانا جائز ہے مگر مناسب یہ ہے کہ مرد خود نکل جائے اگر کوئی عورت اپنے خاوند کی معیت میں مکہ کی طرف روانہ ہو راستے میں شوہر ایسی جگہ جہاں شہری آبادی نہ ہو عورت کو تین طلاقیں دے دے یا وفات پا جائے اور اس جگہ سے عورت کا شہر اگر تین دن سے کم فاصلے پر ہو تو وہ اپنے شہر کی طرف لوٹ آئے کیونکہ یہ اس کا ابتدائی طور پر نکلنا نہ ہوگا بلکہ سفر اول ہی پر مبنی ہوگا۔ اگر فاصلہ تین دن کا ہو تو عورت کو اختیار ہے چاہے تو لوٹ آئے اور چاہے تو مکہ کی طرف سفر جاری رکھے خواہ اس کے ساتھ ولی ہو یا نہ ہو۔ اس مسئلے کا مطلب یہ ہے کہ جہاں وہ جانا چاہتی ہے وہاں تک بھی تین دن کی مسافت ہو کیونکہ چلے جانے کی بہ نسبت وہاں پڑے رہنا زیادہ خطرناک ہے سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ

اپنے گھر لوٹ آئے تاکہ شوہر کے مکان ہی میں عدت گزارے۔

**مسئلہ** : امام محمدؒ الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں کہ اگر شوہر نے اپنی بیوی کو کسی شہر میں تین طلاقیں دیں یا وہ مر گیا، تو عورت عدت کے پورا کرنے تک وہاں سے باہر نہ جائے عدت کی تکمیل کے بعد نکلے بشرطیکہ کوئی محرم ساتھ ہو۔ یہ امام اعظمؒ کی رائے ہے۔

صاحبینؒ کہتے ہیں کہ اگر اس کے ساتھ محرم ہو تو عدت گزارنے سے پہلے بھی شہر سے باہر جا سکتی ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ محض نکلنا تو مسافرت کی تکلیف اور تنہائی کی پریشانی دور کرنے کے لیے جائز ہے کیونکہ یہ عذر ہے ہاں البتہ اگر سفر کرنا حرام تھا تو یہ حرمة بھی محرم کے ساتھ ہونے کی وجہ سے جاتی رہی۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ بغیر محرم سفر کرنے کی بہ نسبت عدت میں نکلنا زیادہ ممنوع ہے۔ چنانچہ عورت سفر کی مقدار سے کم مسافت بغیر محرم کے بھی کر سکتی ہے۔ مگر عدت گزار عورت کو اس قدر بھی جائز نہیں۔ جب محرم کے بغیر سفر کرنا جائز نہیں تو عدت میں سفر کرنا بدرجۂ اولٰی ممنوع ہوگا۔

# ثبوت نسب کا بیان

مسئلہ : اگر کسی شخص نے کہا کہ میں فلاں عورت سے نکاح کروں تو اسے طلاق ہے پھر اس عورت سے اس نے نکاح کرلیا ۔ نکاح کے چھ ماہ گزرنے پر عورت نے ایک بچے کو جنم دیا تو وہ اسی ناکح کا بیٹا ہوگا اور اس پر مہر واجب ہوگا ۔ نسب کا ثابت ہونا تو اس بناء پر ہے کہ وہ اس مرد کی فراش یعنی منکوحہ تھی ۔ کیونکہ جب نکاح کے وقت سے چھ ماہ بعد اس نے بچہ جنا اور وقت طلاق سے چھ ماہ سے کم مدت میں بچے کی پیدائش ہوئی تو بچے کا نطفہ حالت نکاح میں قبل از طلاق موجود تھا ۔ اس کی یہ صورت متصور ہو سکتی ہے کہ مرد نے اس عورت سے مجامعت کی حالت میں نکاح کیا ۔ اور نکاح ہو جانے کے ساتھ ساتھ انزال سے قرار حمل ہوگیا ۔ اور احتیاط اسی میں ہے کہ نسب ثابت کیا جائے ، رہا مہر کا معاملہ تو وہ اس وجہ سے لازم آتا ہے کہ جب مرد سے نسب ثابت ہوگیا تو اسے حکماً مجامعت کرنے والا قرار دیا جائے گا ۔ لہٰذا اس سے پورا مہر ثابت ہوگا ۔

مسئلہ : جس عورت کو طلاق رجعی دی گئی ہو اگر اس نے طلاق کے دو سال یا زیادہ عرصہ کے بعد بچہ جنا تو بچے کا نسب ثابت ہوجائے گا جب تک کہ عورت نے عدت گزرنے کا اقرار نہ کیا ہو ۔ کیونکہ احتمال ہے کہ

حالت عدت میں نطفہ رہ گیا ہو اس لیے کہ عورتوں کے طہر کا زمانہ بہت طویل بھی ہوجاتا ہے (یعنی جب عورت نے عدت گزرنے کا اقرار نہ کیا ہو تو یہ احتمال قوی ہوجائے گا کہ مرد نے عدت کے اندر جامعت کرکے رجوع کرلیا ہو اور اس مجامعت سے حمل قرار پا گیا ہو)۔

مسئلہ : اگر مطلقہ رجعیہ کے ہاں دو برس سے کم مدت میں بچہ پیدا ہو تو عورت اپنے شوہر سے بائنہ ہوجائے گی۔ کیونکہ بچے کی پیدائش سے عدت گزر گئی اور بچے کا نسب بھی ثابت ہوگیا کیونکہ بچے کا نطفہ حالت نکاح میں یا حالت عدت میں ٹھہرا تھا ، لیکن اس صورت میں مرد کا رجوع ثابت نہیں کیونکہ یہاں دو صورتوں کا احتمال ہے : اول یہ کہ استقرار حمل طلاق سے پہلے یعنی حالت نکاح میں ہوا۔ دوم یہ کہ طلاق کے بعد ہوا تو شک کی بناء پر شوہر کے رجوع کا حکم نہیں دیا جا سکتا۔

مسئلہ : اگر دو سال کے بعد بچے کی پیدائش ہو تو رجوع ثابت ہوجائے گا کیونکہ استقرار حمل طلاق کے بعد ہوا ہے۔ اور ظاہری قرائن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حمل اسی مرد کا ہے کیونکہ زنا کا کوئی ثبوت نہیں۔ لہذا وہ مجامعت کرنے سے رجوع کرنے والا قرار پائے گا۔

مسئلہ : وہ عورت جسے ایک طلاق بائن یا تین طلاقیں دی گئیں اگر دو سال سے کم عرصہ میں بچہ جنے تو بچے کا نسب ثابت ہوجائے گا کیونکہ احتمال ہے کہ طلاق کے

وقت حمل قائم ہو ۔ اور اس بات کا یقین نہیں ہے کہ جب استقرار حمل ہوا تھا اس وقت نکاح زائل ہوچکا تھا ۔ لہذا احتیاطاً نسب ثابت ہوجائے گا ۔

مسئلہ : اگر مطلقہ بائنہ کے ہاں فرقت کے وقت سے پورے دو سال کے بعد بچہ جنم لے تو نسب ثابت نہیں ہوگا کیونکہ اس صورت میں حمل طلاق کے بعد وجود میں آیا ہے لہذا زوج کا نہ ہوگا کیونکہ اسے عورت سے مجامعت کرنا حرام تھا ۔ ہاں اگر مرد خود دعوی کرے کہ یہ بچہ میرے ہی نطفے سے ہے (تو اسی کا قرار دیا جائے گا) کیونکہ اس نے نسب کو خود اپنے اوپر لازم کیا ہے ۔ اور اس مسئلے میں ممکنہ صورت یہ ہے کہ مرد نے دوران عدت شبہ میں اس سے مجامعت کرلی ہو ۔

مسئلہ : اگر مبتوتہ عورت صغیرہ ہو مگر ایسی عمر کو پہنچ چکی ہو کہ اس کی ہم عمر لڑکیوں سے مجامعت کی جا سکتی ہو اور طلاق کے بعد نو ماہ سے کم مدت میں بچہ پیدا ہو تو نسب ثابت ہوگا ۔ یہ طرفین؄ کا قول ہے ۔

امام ابو یوسف؄ کہتے ہیں کہ ابتدائے طلاق سے دو سال تک مرد ہی سے نسب ثابت ہوگا کہ وہ عدت گزار عورت ہے ۔ اور یہ قوی احتمال ہے کہ وہ حاملہ ہو اور اس نے عدت گزرنے کا اقرار بھی نہ کیا ہو تو وہ بالغہ عورت کے مشابہ ہوگی ۔

طرفین؄ کی دلیل یہ ہے کہ اس عورت کی عدت گزرنے

کا ایک معین وقت سب کو معلوم ہے اور وہ عدت کے مہینے ہیں ان کے گزرنے پر شرع نے عدت کے اختتام کا حکم دے دیا اور حکم شرع اس کے اقرار سے بڑھ کر واضح ہوگا۔ کیونکہ حکم شرع میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہوتا۔ مگر اقرار میں احتمال موجود ہوتا ہے (کہ شاید عورت نے صداقت سے کام نہ لیا ہو)۔

اگر صغیرہ طلاق رجعی سے مطلقہ ہو تو بھی طرفینؒ کے نزدیک مسئلے کی صورت وہی ہے اور ابو یوسفؒ کے نزدیک ستائیس ماہ تک نسب ہو سکتا ہے کہ مرد نے عدت یعنی تین ماہ کے آخر میں مجامعت کرلی ہو۔ اور عورت حمل کی زیادہ مدت یعنی دو سال میں بچے کو جنم دے۔

اگر صغیرہ نے عدت کے اندر استقرار حمل کا دعوی کیا ہو تو صغیرہ اور کبیرہ دونوں کے لیے ایک ہی حکم ہوگا۔ کیونکہ صغیرہ کے اقرار حمل سے اسے بالغہ تصور کیا جائے گا۔

مسئلہ: جس عورت کا خاوند مر گیا ہو اس کے بچے کا نسب شوہر کی وفات سے دو سال تک پیدائش کی صورت میں ثابت ہوگا امام زفرؒ کہتے ہیں کہ اگر اس نے عدت وفات (یعنی چار ماہ دس دن) کے بعد چھ ماہ گزرنے پر بچے کو جنم دیا تو نسب ثابت نہیں ہوگا کیونکہ شریعۃ نے مہینوں کے حساب سے اس کی معینہ عدت کی تکمیل کا حکم دے دیا

تو گویا اس نے عدت کے اختتام کا اقرار کرلیا جیسا کہ ہم صغیرہ کے بارے میں بیان کر چکے ہیں ۔

ہم امام زفرؒ کے جواب میں کہتے ہیں کہ بیوہ کی عدت گزرنے کا ایک اور طریقہ بھی ہے اور وہ وضع حمل ہے ۔ بخلاف صغیرہ کے کیونکہ صغیرہ میں اصل تو عدم حمل ہے کیونکہ بلوغ سے پہلے وہ محل حمل نہیں ہوتی اور اس کے بالغہ ہونے میں شک ہے (نابالغہ ہونے میں شک نہیں ۔ اس لیے اس کی عدت چار ماہ دس دن ہی مقرر کی گئی) ۔

مسئلہ : اگر عدت گزار عورت نے عدت کی تکمیل کا اعتراف کرلیا پھر چھ ماہ سے کم عرصہ میں اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو بچے کا نسب ثابت ہوجائے گا کیونکہ عورت کا جھوٹ یقینی طور پر ظاہر ہوگیا ۔ لہذا اس کا اعتراف باطل ہوگا ۔ اگر چھ ماہ کے بعد بچے کو جنم دے تو اس (بچے کا) نسب ثابت نہیں ہوگا کیونکہ ہم اس کے اقرار کے بطلان کو نہیں جانتے اور یہ بھی احتمال ہے کہ حمل اقرار کے بعد قرار پایا ہو اور مطلق معتدہ کا لفظ ہر قسم کی عدت گزار عورت کو شامل ہے (خواہ وہ وفات کی عدت میں ہو یا طلاق بائن کی یا رجعی کی) ۔

مسئلہ : جب کوئی عدت گزار عورت بچہ جنے تو اس کا نسب اس شرط پر ثابت ہوگا کہ دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہی دیں ۔ ہاں اگر حمل ظاہر ہو یا خود

شوہر کی جانب سے اقرار پایا جائے تو بغیر شہادۃ بھی نسب ثابت ہوجائے گا - یہ امام ابو حنیفہؒ کی رائے ہے -

صاحبینؒ کہتے ہیں کہ تمام صورتوں میں ایک عورت (یعنی دایہ) کی شہادۃ ہی سے نسب ثابت ہوجائے گا کیونکہ عدت قائم ہونے کی بناء پر عورت اپنے خاوند کی فراش ہی ہے اور نسب کے ثبوت کے لیے قیام فراش کافی ہے - ہاں اس چیز کی ضرورت ہے کہ یہ بچہ واقعی اس عورت نے جنا ہے تو وہ اس (دایہ) کی شہادۃ سے متعین ہوجائے گا، جیسا کہ نکاح کی موجودگی میں بالاتفاق نسب ثابت ہوجاتا ہے -

امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ عورت نے جب وضع حمل کا اقرار کیا تو عدت ختم ہوگئی اور گزری ہوئی چیز حجۃ نہیں ہوا کرتی - لہذا نئے سرے سے نسب ثابت کرنے کی ضرورت پیش آئی اور اس میں پوری گواہی شرط ہے بخلاف اس صورت کے جب حمل ظاہر ہو یا زوج کی طرف سے اعتراف حمل پایا جائے کیونکہ ان صورتوں میں ولادت سے قبل ہی نسب ثابت ہوتا ہے - ہاں تعیین ایک عورت کی شہادۃ ہی سے ہوجاتی ہے (مگر ثبوت نسب کے لیے مکمل شہادۃ ضروری تھا) -

مسئلہ : اگر ایک عورت عدت وفات گزار رہی ہو (اور دو سال سے کم عرصے میں اس نے اپنے بچے کو جنم دیا) اور وارثوں نے تصدیق کر دی کہ یہ بچہ اس کے خاوند ہی کا ہے اور ولادت پر کوئی ایک شخص بھی گواہ نہیں

ہے تو بالاتفاق وہ اس مردہ شوہر کا بیٹا قرار پائے گا اور یہ بات میراث کے حق میں ظاہر ہے کیونکہ میراث ان کا خالص حق ہے تو ان کا تصدیق کرنا قابل قبول ہوگا۔

رہی یہ بات کہ کیا وارثوں کے اقرار سے اس بچے کا ثابت النسب ہونا وارثوں کے علاوہ دوسروں کے حق میں بھی ثابت ہوگا یا نہیں۔ بعض مشائخ کہتے ہیں کہ اگر تصدیق کرنے والے وارث ایسے ہوں جن کی شہادۃ قابل اعتبار ہوتی ہے تو سب کے حق میں نسب ثابت ہوجائے گا کیونکہ حجۃ (یعنی شہادۃ شرعیہ) کے موجود ہونے سے نسب دوسروں کے حق میں بھی ثابت ہوجائے گا۔

بعض دیگر مشائخ کا قول ہے کہ شہادۃ کا لفظ شرط ہے اور بعض نے اسے شرط قرار نہیں دیا کیونکہ غیروں کے حق میں نسب ثابت ہونا اس کے تابع ہے کہ وارثوں کے حق میں ان کے اعتراف سے ثابت ہوجائے اور جو چیز تبعاً ثابت ہوا کرتی ہے اس میں شرائط کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا (مسئلہ یہ ہے کہ اگر بعض وارث نسب کا اقرار کرلیں اور بعض انکار کریں اور اقرار کرنے والے اگر اہل شہادۃ ہوں تو سب کے لیے نسب ثابت ہوگا اور بچہ باپ کی میراث میں برابر کا شریک ہوگا)۔

مسئلہ : ایک مرد نے کسی عورت سے شادی کی اور عورت نے نکاح کے بعد چھ ماہ سے کم مدت میں بچے کو جنم

دیا تو اس کا نسب ثابت نہ ہوگا کیونکہ استقرار حمل نکاح سے پہلے کا ہے لہذا وہ زوج کے نطفے سے نہ ہوگا۔

اگر چھ ماہ یا اس سے زائد عرصہ میں بچہ جنے تو اس کا نسب ثابت ہوگا (خواہ) مرد اس کا اعتراف کرے یا خاموش رہے کیونکہ فراش قائم ہے اور مدت بھی مکمل ہے۔

اگر خاوند ولادت کا انکار کر دے تو وہ ایک عورت کی گواہی سے جو ولادت کی شاھد ہو ثابت ہوجائے گی حتی کہ اگر خاوند بچے کی نفی کرے (کہ یہ میرا نہیں ہے) تو اسے لعان کرنا ہوگا کیونکہ نسب تو فراش قائم سے ثابت ہوجاتا ہے اور لعان فقط تہمت ہی کی صورت میں واجب ہوتا ہے اور لعان کے واسطے یہ ضروری نہیں کہ بچہ بھی موجود ہو کیونکہ لعان تو بچے کے بغیر بھی ہوسکتا ہے (تو یہ لعان تہمت زنا کی وجہ سے واجب ہو رہا ہے۔ دایہ کی شہادۃ سے ولادت متعین ہوتی ہے۔ اس کی شہادۃ کا لعان سے کچھ تعلق نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اگر مرد ولادت کے بغیر بھی تہمت لگا دیتا تو لعان ضروری تھا)۔

مسئلہ : اگر عورت کے ہاں بچہ پیدا ہوا اور بعد میں میاں بیوی کے درمیان اختلاف رونما ہوگیا۔ مرد نے کہا کہ ابھی تو مجھے تجھ سے نکاح کیے چار ماہ ہی گزرے ہیں اور عورت کہے کہ نکاح کو چھ ماہ ہوچکے ہیں تو عورت کی بات تسلیم کی جائے گی اور بچہ اس مرد کا ہوگا کیونکہ ظاہری حالات عورت کے دعوی کی تائید کرتے ہیں کیونکہ

عورت نکاح ہی کی وجہ سے بچے کو عموماً جنم دیا کرتی ہے
زنا سے نہیں ۔ اس مسئلے میں امام محمدؒ نے قسم دلانے کا
ذکر نہیں کیا حالانکہ اس میں اختلاف موجود ہے (ہم پہلے
ذکر کرچکے ہیں کہ چھ امور ایسے ہیں جن میں امام اعظمؒ
کے نزدیک قسم لی جاتی ہے اور صاحبینؒ کے نزدیک نہیں) ۔

مسئلہ : اگر ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ
جب تیرے ہاں بچہ پیدا ہوگا تو تجھے طلاق ہے اور ایک
عورت نے ولادت کی گواہی دے دی تو امام ابو حنیفہؒ کے
نزدیک طلاق نہ ہوگی اور صاحبینؒ کے نزدیک طلاق واقع
ہوجائے گی ۔ صاحبینؒ کی دلیل یہ ہے کہ باب ولادت میں
ایک عورت کی شہادۃ مؤثر ہوتی ہے ۔ حضور ﷺ کا ارشاد
ہے کہ ایسے امور میں جنھیں مردوں کا دیکھنا جائز نہیں
عورتوں کی شہادۃ قابل قبول ہوگی ۔

صاحبینؒ کی دوسری دلیل یہ ہے کہ جب ایک عورت
کی شہادۃ دربارۂ ولادت قبول کی جاسکتی ہے تو ان امور
کے بارے میں بھی قبول کرلی جائے گی جو اس ولادت پر
مبنی ہوں گے اور زیر بحث صورت میں طلاق بھی ولادت ہی
پر مبنی ہے ۔

امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ عورت نے اپنے
شوہر کے حانث ہونے کا دعوی کیا ہے (کہ وہ اپنی قسم
میں حانث ہوگیا ہے اور مجھ پر طلاق واقع ہوگئی) اور یہ
حنث کا دعوی مکمل حجۃ و شہادۃ کے بغیر قبول نہیں کیا

جاتا ۔ کیونکہ ولادت کے سلسلے میں عورتوں کی شہادۃ قبول کرنا ضرورت کے تحت جائز ہے (اور جو چیز کسی خاص ضرورت کے تحت جائز ہو وہ صرف اسی ضرورت تک محدود رہتی ہے) لہذا اس کا اثر طلاق کے حق میں ظاہر نہ ہوگا کیونکہ طلاق ولادت سے الگ بھی ہوسکتی ہے ۔

مسئلہ : اگر زوج استقرار حمل کا اقرار کر چکا ہو تو امام اعظمؒ کے نزدیک بلا شہادۃ ہی طلاق واقع ہوجائے گی اور صاحبینؒ کے نزدیک دایہ کی شہادۃ شرط ہے کیونکہ حنث کا دعوی کرنے کے لیے حجۃ و شہادۃ ضروری ہے اور جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اس میں دایہ کی شہادۃ حجۃ ہے ۔

امام اعظمؒ کی دلیل یہ ہے کہ حاملہ ہونے کا اقرار تو ایسی چیز کا اقرار ہے جہاں تک یہ حمل پہنچے گا اور وہ بچے کی ولادت ہے ۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ شوہر نے زوجہ کے اماتی ہونے کا اقرار کیا (کہ یہ حمل تمہاری امانت میں ہے) تو امانت واپس کرنے میں بھی عورت کا قول قابل تسلیم ہوگا ۔

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت دو سال ہے ۔ کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد ہے کہ بچہ دو سال سے زیادہ پیٹ میں نہیں رہ سکتا ، خواہ تکلے کے سائے کی طرح ہی کیوں نہ ہو ۔

مسئلہ : حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے ۔ باری

تعالی کا ارشاد ہے : "وحمله وفصاله ثلاثون شهراً" - پھر فرمایا گیا : "وفصاله فی عامین" - لہذا حمل کی مدت چھ ماہ باقی رہ گئی -

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت چار سال ہے - ہماری پیش کردہ حدیث امام شافعیؒ پر حجة ہے - نیز حضرت عائشہؓ نے یہ بات آنحضرتؐ ہی سے سن کر فرمائی ہوگی کیونکہ ایسے امور میں عقل کی رسائی نہیں ہو سکتی -

مسئلہ : کسی شخص نے باندی سے نکاح کیا لیکن (مجامعت کے بعد) اسے طلاق دے دی - پھر اسے خرید لیا - اب اگر باندی کے ہاں خرید کے دن سے چھ ماہ سے کمتر عرصے میں بچہ پیدا ہوجائے تو وہ اسی مرد سے ہوگا - ورنہ اس کے ذمے لازم نہ آئے گا -

پہلی صورت کی دلیل یہ ہے کہ وہ اس صورت میں معتدہ کا بچہ ہے کیونکہ خریدنے سے پہلے بچے کا نطفہ قرار پا چکا تھا - (تو ایسی عورت کی عدت وضع حمل سے ختم ہوتی ہے) -

اور دوسری صورت میں وہ اس کی مملوکہ باندی کا بچہ ہے کیونکہ اس بچے کا حدوث سب سے نزدیک اور قریب وقت کی طرف منسوب ہوگا (یعنی وقت طلاق کی طرف) تو اس صورت میں دعوی کرنا ضروری ہے (بغیر دعوے کے نسب ثابت نہ ہوگا) -

یہ اس صورت میں ہے جب کہ لونڈی کو ایک بائن یا رجعی طلاق دی گئی ہو یا خلع کیا گیا ہو ۔ لیکن اگر اسے دو طلاقیں دی جائیں تو وقت طلاق سے دو برس تک نسب ثابت ہوگا کیونکہ دو طلاقوں کی صورت میں باندی شوہر کے حق میں بحرمۃ غلیظہ حرام ہوگئی تو استقرار حمل طلاق کے سوا پہلے کسی وقت کی طرف منسوب ہو سکتا ہے کیونکہ خریدنے کی وجہ سے یہ باندی حلال نہیں ہوسکتی (لہذا ایک مسلمان سے بدکاری کی توقع نہیں کی جا سکتی ۔ اس لیے نطفہ طلاق سے پہلے کا تصور کریں گے اور مدت حمل دو سال تک ہوگی) ۔

مسئلہ : ایک شخص نے اپنی باندی سے کہا کہ اگر تیرے پیٹ میں بچہ ہوگا تو وہ مجھ سے ہوگا ۔ دایہ نے ولادت کی شہادت دے دی تو یہ لونڈی "ام الولد" بن جائے گی کیونکہ اس صورت میں ولد کی تعیین کی ضرورت تھی اور یہ تعیین اجتماعی طور پر ایک دایہ کی شہادت سے ثابت ہو جاتا ہے ۔

مسئلہ : ایک شخص نے ایک لڑکے کو کہا کہ یہ میرا بیٹا ہے ۔ پھر وہ شخص فوت ہو گیا اور لڑکے کی ماں نے آ کر کہا کہ میں اس کی بیوی ہوں تو یہ عورت اس کی بیوی ہوگی اور وہ لڑکا اس کا بیٹا ہوگا اور دونوں کی میراث میں حصہ دار ہوں گے ۔

امام محمدؒ نے نوادر میں اسے استحسانی حکم قرار دیا ہے

اور قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ عورت کو میراث سے حصہ نہ ملے کیونکہ نسب جس طرح نکاح صحیح سے ثابت ہو جاتا ہے اسی طرح نکاح فاسد سے بھی ، بلکہ وطی بالشبہ اور عورت کے مالک ہوجانے سے بھی ثابت ہو جاتا ہے تو مرد کا لڑکے کو "ھذا ابنی" کہنا نکاح کے اقرار کے مترادف نہیں ۔

استحسان کی وجہ یہ ہے کہ مسئلے کی صورت ایسی ہو کہ عورت کے متعلق مشہور ہو کہ وہ آزاد ہے ، اور لوگوں کو یہ بھی علم ہو کہ وہ اس لڑکے کی ماں ہے ، تو ایسا نسب ثابت ہونے میں عادت اور شرع کے لحاظ سے نکاح کا صحیح ہونا متعین ہے (اس لیے اب نکاح فاسد اور وطی شبہ والا احتمال باقی نہ رہا اور نکاح صحیح کی صورت باقی رہ گئی ۔ لہذا عورت وارث ہوگی) ۔

اور اگر یہ ثابت نہ ہو کہ عورت آزاد ہے اور وارث کہیں کہ تو ام ولد ہے تو عورت کو میراث نہیں ملے گی کیونکہ دارالاسلام کے لحاظ سے آزادی کا ظہور غلامی کے ازالے کے لیے تو حجت ہوتا ہے لیکن میراث کے حق کو ثابت نہیں کرتا (یعنی اگر کہا جائے کہ یہ عورت دارالاسلام میں موجود ہے اور ظاہر میں کسی کی مملوکہ نہیں تو یہ ظاہر ہے کہ وہ آزاد ہے ۔ لہذا وارثوں کا قول قبول نہیں کیا جائے گا ۔ صاحب کتاب جواب دیتے ہیں کہ دارالاسلام کے لحاظ سے ظاہری آزادی اس لیے حجت ہوتی ہے کہ اگر کوئی کہے کہ یہ میری مملوکہ ہے تو اس کا قول قبول نہ ہوگا ۔ مگر میراث کا حق ثابت کرنے کے لیے اتنا قول کافی نہیں) ۔

# بَابُ حَضَانَةِ الْوَلَدِ وَمَنْ أَحَقُّ بِهِ ؟

# بچے کی پرورش کا بیان اور یہ کہ اس کی پرورش کا زیادہ حقدار ہے ؟

مسئلہ : جب زوجین میں فرقت واقع ہو جائے تو ماں بچے کی زیادہ حقدار ہے ۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک عورت نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا : یا رسول اللہ ﷺ یہ میرا بیٹا ہے ۔ میرا پیٹ اس کے لیے ظرف رہا، میری گود اس کے لیے خیمہ تھی اور میری چھاتی اس کے پینے کا ذریعہ (سقاء بمعنی ڈول) رہی اور اب اس کے باپ کا کہنا یہ ہے کہ اس کو مجھ سے چھین لے گا ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : جب تک کہ تو دوسری شادی نہ کرے بچے کی زیادہ حقدار ہے" ۔

اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ ماں میں (باپ کی نسبت) شفقت زیادہ ہوتی ہے اور وہ پرورش کے فرائض کو بخوبی سر انجام دے سکتی ہے ۔ لہذا بچے کو اس کے سپرد کرنے ہی میں بچے پر شفقت ہوگی ۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت صدیق رض نے فرمایا تھا اے عمر رض تیرا اس بچے کو

خالص شہد کھلانا بھی وہ حیثیت نہیں رکھتا جو کہ اس کی ماں کے تھوک کو حاصل ہے۔ ابوبکر صدیق رض نے یہ بات اس وقت فرمائی تھی جب حضرت عمر رض اور ان کی بیوی میں فرقت واقع ہوئی تھی اور صحابہ رض کی ایک کثیر تعداد وہاں تشریف فرما تھی (اور ابوبکر رض کے ارشاد کو سب نے تسلیم کیا)۔

بچے کے اخراجات باپ کے ذمے ہوں گے۔ جنہیں ہم باب النفقات میں بالتفصیل بیان کریں گے۔

مسئلہ : بچے کی پرورش کے سلسلے میں ماں کو مجبور نہیں کیا جائے گا۔ ممکن ہے وہ اس کی پرورش سے عاجز ہو (اگر کوئی بھی دوسرا ذی محرم رشتہ نہ ہو تو پھر ماں کو پرورش پر مجبور کیا جا سکتا ہے)۔

مسئلہ : اگر بچے کی ماں نہ ہو تو دادی کی بہ نسبت نانی پرورش کی زیادہ حقدار ہوگی۔ خواہ وہ دور کی ہو۔ یعنی نانی کی ماں ہی ہو کیونکہ یہ ولایت ماں کی طرف سے حاصل ہوتی ہے۔

مسئلہ : اگر نانی موجود نہ ہو تو بہنوں کی بہ نسبت دادی پرورش کی زیادہ حقدار ہوگی کیونکہ ایک لحاظ سے دادی کو بھی ماں کی حیثیت حاصل ہے۔ اسی لیے دادی بھی ماؤں کی میراث جتنا چھٹا حصہ حاصل کرتی ہے اور پیدائشی قرابت کی بناء پر اس میں شفقت بھی زیادہ پائی جاتی ہے۔

مسئلہ : اگر بچے کی کوئی دادی نہ ہو تو پھوپھیوں

اور خالاؤں سے اس کی بہنوں کو تقدم حاصل ہوگا کیونکہ وہ بچے کے والدین کی بیٹیاں ہوتی ہیں - اسی لیے انہیں میراث میں بھی پھوپھیوں اور خالاؤں پر فوقیت دی جاتی ہے - ایک روایت یہ بھی ہے کہ باپ کی بہن سے خالہ کو تقدم حاصل ہے - حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے : خالہ بھی والدہ ہوتی ہے - اللہ تعالی کے ارشاد : "ورفع أبويه على العرش" کی تفسیر میں کہا جاتا ہے کہ وہ یوسف علیہ السلام کی خالہ مکرمہ تھیں -

مسئلہ : ماں اور باپ دونوں کی طرف سے جو بہن ہو وہ دوسری بہنوں پر مقدم ہوگی کیونکہ قدرتی طور پر اس میں مادۂ شفقت وافر ہوتا ہے -

اس کے بعد میں ماں کی طرف سے بہن کا درجہ ہے پھر باپ کی طرف سے بہن کا - کیونکہ ان عورتوں کا حق پرورش ماں کی جانب سے ہے (لہذا ماں کی طرف سے بہنوں کو اولیت حاصل ہوگی) -

نیز پھوپھیوں پر خالاؤں کو فوقیت حاصل ہوگی کیونکہ خالائیں ماں سے رشتہ میں قریب ہوتی ہیں اور یہی قربت ترجیح کا باعث ہوتی ہے -

خالاؤں کو بھی درجے میں وہی ترتیب حاصل ہوگی جو بہنوں کو حاصل تھی - اس کا مفہوم یہ ہے کہ پہلے ماں باپ دونوں کی طرف سے رشتہ دار کو ترجیح ہوگی -

پھر ماں کی طرف سے قرابت کے لحاظ سے - یہی لحاظ پھو پھیوں میں بھی ہوگا -

البتہ مذکورہ عورتوں میں سے بھی جو نکاح کر لے گی اس کا حق حضانت ساقط ہو جائے گا -

اس کی دلیل میں ہم حدیث پیش کر چکے ہیں - دوسری دلیل یہ ہے کہ ماں کا خاوند جب اجنبی شخص ہو تو وہ بچے کو حقیر چیزیں دے گا اور اس کو حقارت آمیز نظروں سے دیکھے گا - لہذا ایسے ماحول میں شفقت مفقود ہو جاتی ہے -

امام قدوری رح فرماتے ہیں اگر نانی اپنا نکاح لڑکے کے دادے سے کر لے تو حق حضانۃ ساقط نہ ہوگا کیونکہ دادا بمنزلۂ والد ہوتا ہے لہذا وہ پوری شفقت سے تربیت کرے گا اور ہر اس خاوند کا یہی حکم ہوگا جو بچے کا رشتہ دار اور محرم ہو کیونکہ قریبی رشتہ داری کی بناء پر شفقت قائم رہتی ہے -

مسئلہ : جس عورت کا حق حضانۃ اجنبی سے نکاح کرنے کی وجہ سے ساقط ہوگیا - اگر وہ خاوند سے جدا ہوجائے تو بچے کا حق حضانۃ پھر اسے واپس مل جائے گا کیونکہ جو اس اس حق سے مانع تھا وہ زائل ہو چکا ہے -

مسئلہ : اگر بچے کی پرورش کے لیے اس کے کنبہ سے کوئی عورت نہ ہو اور مردوں کو اس کی پرورش میں اختلاف ہو تو ان میں سے سب سے زیادہ مستحق وہ شخص ہوگا جو عصبہ ہونے کے لحاظ سے زیادہ قریب ہو کیونکہ ولایت قرابت

کے لحاظ سے حاصل ہوتی ہے ۔ عصبات کی ترتیب اپنے باب میں معلوم ہو چکی ہے ۔ البتہ یہ امر ضرور ملحوظ رکھا جائے گا کہ بچے کو ایسے عصبے کے سپرد نہیں کریں گے جو اس کا محرم نہ ہو ۔ جیسے آزاد کردہ عورت کا مولی یا چچا کا بیٹا ۔ تاکہ فتنہ و خرابی سے بچاؤ ہو سکے ۔

مسئلہ : ماں اور نانی لڑکے کی پرورش کی اس وقت تک زیادہ حقدار ہیں جب تک کہ بچہ اس قابل نہ ہو کہ خود بخود کھا سکے، پی سکے، لباس پہن سکے اور طہارت کر سکے ۔

امام محمدؒ الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں کہ بچہ احتیاج سے بے نیاز ہو جائے ۔ اس طرح کہ خود کھا سکے ، خود پی سکے اور خود لباس پہن سکے ۔ دونوں عبارتوں کا مقصد ایک ہی ہے کیونکہ بچے میں عدم احتیاج اور استغناء اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ خود بخود طہارت کرنے پر قادر ہو ۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ بچہ جب درجۂ استغناء کو پہنچ جائے تو اس کی عمر کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ اسے شرفاء کے آداب و اخلاق کے مطابق ادب و اخلاق سکھایا جائے اور اس قسم کی تادیب اور تہذیب و تربیت کے لیے باپ موزوں ہوتا ہے ۔

امام ابوبکرؒ خصاف فرماتے ہیں کہ یہ درجۂ استغناء زیادہ سے زیادہ سات سال کی عمر کے بعد حاصل ہوجاتا ہے ۔

مسئلہ : ماں اور نانی لڑکی کی پرورش کے زیادہ حقدار اس وقت تک ہیں جب تک وہ بالغہ نہ ہو جائے (یعنی اسے حیض آنے لگے) کیونکہ پرورش سے مستغنی ہونے کے بعد اس کو عورتوں کے آداب حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور عورت اس کام میں زیادہ ممد ثابت ہوتی ہے اور بالغ ہونے کے بعد اسے نکاح سے محصنہ کرنے اور محفوظ رکھنے کی اشد ضرورت ہوتی ہے اور اس سلسلے میں باپ کو زیادہ بصیرت اور استطاعت حاصل ہوتی ہے۔

امام محمدؒ سے روایت ہے کہ جب بچی بالغہ ہوجائے تو اسے باپ کے سپرد کر دیا جائے کیونکہ اب اس کی حفاظت کی ضرورت ثابت ہو چکی ہے (اور یہ حفاظت باپ ہی بخوبی سر انجام دے سکتا ہے)۔

مسئلہ : ماں اور نانی کے علاوہ دوسری عورتیں اس وقت تک پرورش کی حقدار ہوتی ہیں جب تک لڑکی کے دل میں شہوانی جذبات پیدا نہ ہوں۔

امام محمدؒ الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں: دوسری عورتیں اس وقت تک پرورش کی حقدار ہیں کہ بچی دوسروں کی مدد سے مستغنی ہو جائے۔ اسی لیے ماں اور نانی کے سوا دوسری کوئی عورت اس سے خدمت لینے کی حقدار نہیں اور اسے اجارہ اور نوکری پر نہیں بھیج سکتی کیونکہ مقصد حاصل نہ ہوگا (کہ وہ قانوناً کسی دوسری کی خدمت نہیں کرسکتی) بخلاف ماں اور نانی کے۔ کیونکہ انہیں اس سے خدمت لینے کا شرعاً حق حاصل ہے۔

امام قدوری فرماتے ہیں کہ جب کسی باندی کا مولی اس کو آزاد کر دے ، یا ام ولد آزاد ہو جائے تو بچے کی پرورش میں ان کا حق بھی ایک آزاد عورت جیسا ہوگا کیونکہ ثبوت حق کے وقت دونوں آزاد ہیں ۔ لیکن آزادی سے پہلے دونوں کو بچے کی پرورش کا حق حاصل نہ ہوگا ، کیونکہ مولی کی خدمت میں مصروف رہنے کی وجہ سے بچے کی پرورش کے فرائض کماحقہ ادا کرنے سے قاصر ہوتی ہیں ۔

مسئلہ : اگر ذمیہ کے ہاں مسلمان مرد سے بچہ پیدا ہو تو اس مسلم بچے کی پرورش کی مستحق اس کی ذمیہ ماں ہے ۔ جب تک کہ بچہ مذاہب سے نا آشنا ہو یا یہ اندیشہ نہ ہو کہ وہ کفر سے مانوس ہو جائے گا کیونکہ اس عمر سے پہلے پہلے بچہ ماں ہی کی شفقت میں پروان چڑھتا ہے بعد میں ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے ۔ (لہذا جب سن تمیز کو پہنچ جائے تو باپ کے حوالے کر دیا جائے گا) ۔

مسئلہ : پرورش کے سلسلے میں لڑکے یا لڑکی کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا ۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ دونوں کو اختیار حاصل ہوتا ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار دیا ہے ۔

ہماری دلیل ہے کہ بچہ اپنی نا تجربہ کاری اور کم عقلی کی بناء پر والدین میں سے اسے زیادہ پسند کرے گا جس کے پاس اسے زیادہ آرام میسر ہو جو اسے فضول مشاغل اور لہو و لہب سے منع نہ کرے تو اس میں نظر شفقت ثابت

نہیں ہوتی (کیونکہ بچہ آوارہ ہو کر تمام اخلاق عالیہ سے محروم رہ جائے گا) اور یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم نے بچوں کو اختیار نہیں دیا۔

آپ کی پیش کردہ روایت اس قاعدے سے مستثنٰی ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بچے کے حق میں دعاء فرمائی تھی: اے اللہ اسے ہدایت نصیب فرما تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء سے بچے کو نیک توفیق مل گئی یا اس حدیث کا یہ مفہوم بھی مراد ہو سکتا ہے کہ بچہ اس وقت بالغ تھا۔

# فصل

مسئلہ: اگر مطلقہ عورت یہ ارادہ کرے کہ وہ اپنے بچے کو شہر سے باہر لے جائے تو وہ اپنے ارادے کے مطابق نہیں کر سکتی، کیونکہ اس میں باپ کے حق میں ضرر و نقصان کا احتمال ہے ہاں وہ اس کو اپنے وطن میں جہاں کہ اس کا نکاح ہؤا تھا لے جا سکتی ہے کیونکہ مرد نے نکاح کے بعد رواج اور شرع کے مطابق وہیں قیام کرنا اپنے ذمے لازم کر لیا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے کسی شہر میں نکاح کیا تو وہ انہیں میں سے ہے۔ اس نکاح کی بناء پر حربی ذمی بن جاتا ہے (یعنی اگر حربی دارالاسلام میں نکاح کر کے رہنے لگے تو وہ ذمی قرار پائے گا اسی طرح

حربیہ اگر دارالاسلام میں آ کر نکاح کرے تو ذمیہ متصور ہوگی) -

اگر اپنے وطن کے علاوہ کسی دوسرے شہر میں نکاح ہو اور عورت اسے اسی شہر میں لے جانا چاہے تو قدوری کی عبارت سے اشارۃ معلوم ہوتا ہے کہ اسے یہ اختیار حاصل نہیں ہوگا اور یہ روایت مبسوط کی کتاب الطلاق میں بھی موجود ہے ۔ مگر الجامع الصغیر میں امام محمدؒ نے ذکر کیا ہے کہ عورت کو اختیار ہوگا کیونکہ جس مقام میں عقد سرانجام پایا ہو عقد کے احکام بھی اسی جگہ واجب ہوں گے ، جیسا کہ بیع جس جگہ منعقد ہو فروخت شدہ چیز کی سپردگی اسی جگہ واجب ہوتی ہے ۔ اور من جملہ احکام عقد میں ایک یہ بھی ہے کہ اولاد کی پرورش اپنے ساتھ رکھکر کی جائے

مبسوط کی کتاب الطلاق کی روایت کی وجہ یہ ہے کہ جب نکاح کہیں پردیس میں ہو تو یہ رواج نہیں کہ وہیں کا قیام اپنے اوپر لازم کر لیا جائے اور یہی زیادہ صحیح ہے -

الحاصل عورت اسی صورت میں بچے کو ساتھ لے جا سکتی ہے جب دونوں باتیں موجود ہوں ۔ ایک تو یہ کہ عورت اپنے وطن کو جا رہی ہو ۔ دوسری یہ ہے کہ نکاح بھی وہیں ہوا ہو -

اور یہ سب اس صورت میں ہے جب دونوں شہروں میں طویل فاصلہ ہو ۔ لیکن اگر دونوں شہروں میں مسافت اتنی

کم ہو کہ باپ جب چاہے اپنے بچہ کو دیکھ کر رات اپنے گھر میں بسر کر سکے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں (ایسے شہر میں عورت بچے کو ساتھ لے جا سکتی ہے) یہی حکم دو گاؤں کے درمیان ہے اسی طرح اگر عورت بچے کو بستی سے شہر کی طرف منتقل کر دے تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ اس میں بچے کی بھلائی ہے کہ وہ اس شہر والوں کے اخلاق سیکھ لے گا اور باپ کا بھی اس میں کچھ ضرر نہیں - اس کے برعکس اگر شہر سے گاؤں لے جانا چاہے تو بچے کے حق میں مضر ہے کیونکہ وہ گنواروں کے اخلاق سے متأثر ہوگا - اس لیے عورت کو وہاں لے جانے کا اختیار نہ ہوگا -

# نفقے کا بیان

مسئلہ : امام قدوری فرماتے ہیں کہ زوجہ چاہے مسلمہ ہو یا کافرہ اس کے اخراجات کا ذمہ دار خاوند ہے ۔ جب اس نے اپنے آپ کو مرد کے گھر میں اس کے حوالے کر دیا تو اس کے اخراجات، لباس و پوشاک اور جائے رہائش کا انتظام کرنا مرد کے ذمے واجب ہوگا اور اس مسئلے میں اللہ تعالی کے یہ ارشاد "لینفق ذو سعة من سعته" "وعلی المولود له رزقهن وکسوتهن بالمعروف" (یعنی صاحب وسعت اپنی طاقت کے مطابق نفقہ دے ۔ نیز بچوں کے والد پر انکی ماؤں کا کھانا اور کپڑا اعتدال کے طور پر واجب ہے) اصل کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجة الوداع کے دن اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا کہ تم پر تمہاری عورتوں کے کھانے پینے اور لباس کی ذمہ داریاں اعتدال کے طور پر واجب ہیں

نیز یہ دلیل بھی دی جا سکتی ہے کہ نفقہ دراصل مرد کے عورت کو اپنے پاس روک رکھنے کا عوض ہے اور جو بھی دوسرے کے حق مقصود کے لیے محبوس ہو اس کا نفقہ روکنے والے کے ذمے ہوگا ۔ اس کی نظیر قاضی اور عامل زکاۃ ہیں

(کیونکہ یہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتے ہیں لہذا ان کے اخراجات بیت المال سے ادا کئے جاتے ہیں) ان مذکورہ دلائل میں کوئی فصل اور تخصیص نہیں لہذا اخراجات کے سلسلے میں مسلمہ اور کافرہ دونوں برابر ہوں گی ۔

مسئلہ : اخراجات کی مقدار میں مرد اور عورت دونوں کی حیثیت ملحوظ ہوگی ۔ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ یہ رائے امام قدوری کی ہے اور خصافؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور فتوی بھی اسی پر دیا جاتا ہے ۔ خصاف کے قول سے مراد یہ ہے کہ جب میاں بیوی دونوں خوشحال ہوں تو نفقہ بھی خوشحالی اور آسودگی کا واجب ہے ۔ اگر مفلوک الحال اور تنگدست ہوں تو نفقہ بھی اس حالت کے مطابق ہوگا ۔ اگر شوہر آسودہ حال ہو اور بیوی مفلوک الحال تو تنگدست عورتوں سے بڑھ کر اور مالدار عورتوں سے کم تر نفقہ واجب ہوگا ۔

امام کرخیؒ اور امام شافعی کے نزدیک تمام حالات میں مرد کے حال ہی کو مدنظر رکھا جائے گا ۔ باری تعالی کا ارشاد ہے "لینفق ذو سعة من سعته" کہ وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق نفقہ دے (اس آیۃ میں نفقے کا مدار مرد پر ہے) ۔

امام خصاف کے قول کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیانؓ کی بیوی ھند کو فرمایا : "خذی

من مال زوجك ما یکفیك وولدك بالمعروف" کہ تو اپنے خاوند کے مال سے اس قدر لے جو معروف طور پر تجھے اور تیرے بچے کے لیے کافی ہو آپ نے ھندہ کی حالت کا اعتبار فرمایا ۔

نیز فقہی نقطۂ نظر سے بھی یہی مناسب ہے کہ عورت کی حالت کو مدنظر رکھا جائے کیونکہ نفقہ بطور کفایت واجب ہوتا ہے اور تنگدست عورت کو مالدار عورتوں جیسی کفایت کی ضرورت نہیں اسلیے زیادتی کے کچھ معنی نہ ہوں گے

ہم بھی آپ کی پیش کردہ نص کے حکم کے قائل ہیں کہ مرد کو اپنی طاقت و وسعت کے مطابق دینے کا حکم ہے اور جس قدر باقی ہے وہ اس کے ذمے قرض ہوگا ۔ (مثلاً عورت خوشحال ہو اور مرد تنگدست ۔ عورت کا روزانہ خرچ تین روپے ہو لیکن مرد اسے روزانہ دو روپے ادا کرنے کی طاقت رکھتا ہو تو اس صورت میں ایک ایک روپیہ روزانہ اس کے ذمے قرض بنتا چلا جائے گا کہ جب روپیہ اس کے ہاتھ لگے اسے ادا کر دے) ۔

نص قرآنی میں معروف سے مراد درمیانہ درجہ ہے کیونکہ واجب یہی ہے ۔

مذکورہ بحث سے یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ گئی کہ نفقے کے سلسلے میں کوئی مقدار معین نہیں کی جا سکتی جیسا کہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ خوش حال پر نصف صاع اور تنگ دست پر چوتھائی صاع اور متوسط پر ڈیڑھ مد ($\frac{3}{8}$صاع

واجب ہے ۔ کیونکہ جو چیز بطور کفایت واجب ہو وہ شرعی طور پر معین نہیں ہو سکتی (کہ لوگوں کے حالات مختلف ہوتے ہیں اور موسم کے تغیر و تبدل اور عمر کی کمی بیشی سے غذاء کی مقدار بھی تبدیل ہوتی رہتی ہے) ۔

مسئلہ : اگر عورت شوہر کے مہر ادا کرنے تک اپنے آپ کو اس کے سپرد کرنے سے روک دے تو بھی اسے نفقہ ملے گا کیونکہ وہ ایک حق کی بناء پر منع کر رہی ہے تو عورت کا محبوس نہ ہونا ایک ایسی وجہ سے ہوا جو شوہر کی طرف سے پائی گئی تو گویا عورت نے روکا نہیں بلکہ محبوس رہی ۔

مسئلہ : اگر عورت سرکشی اور نافرمانی سے کام لے تو جب تک وہ مرد کے گھر واپس نہ آ جائے اسے نفقہ نہیں ملے گا کیونکہ اس صورت میں عورت نے محبوس ہونے کو خود ضائع کیا (کہ نفقہ تو محبوس ہونے کی بناء پر واجب ہوتا ہے ۔ جب عورت محبوس ہی نہ رہے تو نفقہ بھی نہیں رہے گا) اور جب وہ خاوند کے گھر واپس آ جائے تو احباس پایا جائے گا اور نفقہ واجب ہوگا ۔ بخلاف اس صورت کے جب عورت شوہر کے گھر میں موجود رہ کر مجامعت سے مانع ہو تو نفقہ ساقط نہ ہوگا کیونکہ احتباس موجود ہے اور شوہر اس کی رضامندی کے خلاف بھی مجامعت کر سکتا ہے ۔

مسئلہ ، اگر عورت نابالغہ ہو اور اتنی کمسن کہ اس سے تمتع نہ کیا جا سکے تو مرد پر اس کا نفقہ واجب نہ ہوگا کیونکہ مجامعت کا ممنوع ہونا ایک ایسی علت ہے جو عورت

میں پائی جاتی ہے اور نفقہ اس احتباس سے واجب ہوا کرتا ہے جو نکاح کے مطلوب تک رسائی کا ذریعہ ہو - مگر یہ احتباس اس قسم کا نہیں ہے لہذا (نفقہ) واجب نہ ہوگا البتہ مریضہ کی صورت اس سے مختلف ہے - اس کا نفقہ ہرگز ساقط نہ ہوگا۔ إن شاء الله عنقریب ہی ہم اس کی تفصیل بیان کریں گے -

امام شافعیؒ فرماتے ہیں : صغیرہ عورت کے لیے بھی نفقہ ضروری ہوگا کیونکہ ان کے نزدیک یہ شوہر کی ملک کا عوض ہوتا ہے جیسا کہ مملوکہ عورت کا نفقہ مالک کے ذمے ہوتا ہے -

ہمارے نزدیک مہر ملک کا عوض ہوتا ہے اور ایک ہی چیز کے دو عوض اکھٹے نہ ہونگے - اس لیے صغیرہ مہر کی حقدار ہوگی ، نفقہ کی نہیں -

مسئلہ : اگر شوہر اتنا کمسن ہو کہ وطی پر قدرت نہ رکھے ، مگر بیوی اس سے عمر میں بڑی ہو تو اسے خاوند کے مال سے نفقہ ملے گا - کیونکہ عورت کی طرف سے اپنے آپ کو سپرد کرنا ثابت ہو چکا ہے اور معذوری تو شوہر کی طرف سے ہے اس لیے وہ عنین یا مجبوب کی طرح تصور ہوگا - (جس طرح ان پر اپنی بیویوں کا نفقہ واجب ہوتا ہے اس پر بھی ہوگا) -

مسئلہ : جب عورت کسی قرض میں محبوس ہو تو اس کا نفقہ بند کرنے والے کے ذمے نہیں ہوگا۔ کیونکہ احتباس کا زائل ہونا عورت کی طرف سے ہے کہ اس نے قرض کی ادائیگی میں

تاخیر کی ۔ اگر ازالۂ حبس عورت کی طرف سے نہ ہو ۔ بایں طور کہ وہ عورت ادائیگی قرض سے قاصر ہو تو شوہر سے نفقے کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا ۔

ایسے ہی اگر کوئی شخص عورت کو زبردستی لے جائے تو شوہر پر نفقہ واجب نہیں ہوگا ۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اسے نفقہ دینا پڑے گا مگر فتوی پہلے قول پر ہے کیونکہ احتباس کا زائل ہونا شوہر کی طرف سے نہیں ہے کہ اسے حکماً باقی قرار دیا جائے ۔ (اور لازم کر دیا جائے ) اسی طرح اگر عورت محرم کے ساتھ حج کرے تو بھی نفقہ ساقط ہو جائے گا کیونکہ احتباس کا ازالہ عورت کی طرف سے پایا گیا ۔

امام ابو یوسفؒ وجوب نفقہ کے قائل ہیں کیونکہ شرعی فرض کی تکمیل ایک عذر ہے لہذا مرد پر حضر کا نفقہ واجب ہوگا سفر کا نہیں ۔ کیونکہ خاوند پر یہی واجب ہے ۔ اگر بیوی کے ساتھ خاوند بھی سفر کرے تو بالاتفاق مرد پر نفقہ واجب ہوگا کیونکہ شوہر اس کے ساتھ ہے لہذا احتباس موجود ہے ۔ لیکن سفر میں بھی وہ اتنا ہی نفقہ دے گا جتنا کہ حضر دیا کرتا تھا سفر کے لیے کوئی اضافہ نہ ہوگا اور مرد پر کرایہ دینا بھی واجب نہیں جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں (کہ مرد پر نفقۂ حضر واجب ہوتا ہے) ۔

مسئلہ : اگر عورت خاوند کے گھر بیمار ہو جائے تو اسے نفقہ ملے گا ۔ قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر ایسا مرض

ہو جو جماع سے مانع ہو تو اسے نفقہ نہ دیا جائے کیونکہ تمتع کا احتباس جاتا رہا مگر استحسان کے پیش نظر ساقط نہ ہوگا، کیونکہ حبس تو موجود ہے، شوہر اس سے مانوس ہوتا ہے، اسے ہاتھ لگاتا ہے اور وہ اس کے گھر کی حفاظت کرتی ہے رہی جماع کی ممانعت تو وہ عارضے کی بناء پر ہے تو گویا یہ عارضہ حیض کے مشابہ ہے۔

امام ابو یوسفؒ کہتے ہیں اگر عورت ایک بار اپنے آپ کو سپرد کر دے پھر بیمار ہو جائے تو سپردگی ثابت ہونے کی وجہ سے نفقہ واجب رہے گا اور اگر پہلے بیمار ہوئی پھر اپنے آپ کو سپرد کیا تو نفقہ واجب نہ ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں تسلیم صحیح نہیں ہے۔ ہمارے مشائخ نے کہا یہ قول اچھا ہے اور قدوری میں اسی کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

مسئلہ: اگر خاوند خوش حال ہو تو اس پر زوجہ اور اس کے خادم کا نفقہ فرض کیا جائے گا۔ اس مسئلے سے مقصد خادم کے نفقے کا بیان ہے۔ اس لیے قدوری کے بعض نسخوں کی عبارت اس طرح ہے: وتفرض علی الزوج إذا کان موسراً نفقة خادمها۔ خادم کا نفقہ واجب قرار دینے کی وجہ یہ ہے شوہر پر زوجہ کی کفایت واجب ہے اور کفایت کی تکمیل میں خادم کا نفقہ بھی شامل ہوتا ہے کیونکہ عورت کے لیے خادم کے بغیر چارہ نہیں۔

مسئلہ: عورت کو ایک خادم سے زیادہ کا نفقہ نہیں

دیا جائے گا یہ صورت طرفینؒ کے نزدیک ہے امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں کہ دو خادموں کا نفقہ واجب ہوگا کیونکہ اسے ایک خادم تو گھریلو ضروریات کے لیے درکار ہوتا ہے اور دوسرا بیرونی کاموں کے لیے ۔

طرفینؒ کہتے ہیں کہ ایک خادم ہی دونوں قسم کے فرائض سر انجام دے سکتا ہے ، لہذا دو کی کوئی ضرورت نہیں ۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر شوہر خود زوجہ کے کاموں کی دیکھ بھال کرے تو کافی ہوگا ۔ اسی طرح جب وہ اپنی جگہ کسی شخص کو مقرر کر دے ۔

مشائخ فرماتے ہیں کہ مالدار شوہر پر خادم کا اتنا نفقہ لازم ہے جتنا ایک تنگدست آدمی اپنی زوجہ کو دیتا ہے اور وہ کفایت کا ادنٰی درجہ ہے ۔

قدوری کا متن میں یہ کہنا "إذا كان موسراً" اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر خاوند مفلوک الحال ہو تو اس پر خادم کا نفقہ واجب نہیں اور وہ حسن کی امام ابو حنیفہؒ سے روایت ہے اور صحیح بھی یہی بات ہے مگر امام محمدؒ کا قول اس کے خلاف ہے (کہ تنگدست پر بھی خادم کا نفقہ واجب ہوگا مگر یہ صحیح نہیں) کیونکہ تنگدست پر تو ادنٰی کفایت واجب ہے اور زوجہ بذات خود بھی اپنے کاموں کی کفایت کر لیا کرتی ہے ۔

مسئلہ : اگر کوئی شخص زوجہ کا نفقہ دینے سے قاصر ہو جائے تو دونوں کے درمیان تفریق نہ کی جائے گی ۔ بلکہ

قاضی بیوی سے کہے گا کہ اپنے شوہر کی ذمہ داری پر قرض لے لے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ دونوں میں تفریق کر دی جائے گی کیونکہ رواج کے مطابق شوہر اسے اپنے پاس رکھنے سے عاجز ہے تو قاضی تفریق کرنے میں اس کا قائم مقام ہوگا جیسا کہ مجبوب اور عنین کی صورت میں ہوتا ہے۔ بلکہ نفقہ سے عاجزی کی صورت میں قاضی بدرجۂ اولیٰ قائم مقام ہوگا کیونکہ نفقہ کی ضرورت سب سے شدید ہوتی ہے۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ اس طرح مرد کا حق کلیۃ باطل ہو جاتا ہے اور عورت کا حق متأخر بھی ہو سکتا ہے (کہ مرد کی ذمہ داری پر قرض لے لے) لیکن مرد کے حق کو باطل کرنے میں نقصان یقیناً زیادہ ہے۔ کیونکہ قاضی کے مقرر کرنے سے نفقہ مرد کے ذمے قرض بن جاتا ہے اور عورت اسے آئندہ زمانے میں وصول کرسکتی ہے۔ نیز مال کی حیثیت نکاح کے سلسلے میں تابع کی ہوتی ہے لہذا اسے نکاح کے مقصود حقیقی یعنی توالد و تناسل کے ساتھ لاحق نہیں کیا جائے گا۔

قاضی کا نفقہ فرض کرنے کے ساتھ ساتھ قرض لینے کا حکم دینے سے یہ فائدہ ہے کہ عورت قرض خواہ کو مرد کے ذمے کر دے گی کیونکہ عورت اگر قاضی کے حکم کے بغیر قرض لینے لگے تو قرض خواہ اسی سے مطالبہ کرے گا نہ کہ زوج سے۔

مسئلہ : اگر قاضی عورت کے لیے مفلسی کا نفقہ فرض کر دے مگر اس کا شوہر مالدار ہو جائے اور عورت دعویٰ دائر کرے تو قاضی امارت کے نفقے کے مطابق اس کی تعمیل کرا دے گا کیونکہ نفقہ عُسر اور یُسر کی حالت میں بدلتا رہتا ہے اور قاضی نے جو حکم دیا تھا وہ ایسے نفقے کا اندازہ تھا جو خاوند پر واقعی واجب نہ تھا - پس جب شوہر کے حالات میں تبدیلی آ گئی تو زوجہ کو اپنے پورے حق کے مطالبہ کرنے کا اختیار ہے -

مسئلہ : اگر کچھ مدت گزرنے تک مرد نے نفقہ نہ دیا اور عورت نے اس سے گزشتہ نفقے کا مطالبہ کیا تو اسے سوائے دو صورتوں کے کچھ نہیں ملے گا - ایک تو یہ کہ قاضی نے کوئی خاص مقدار اس کے لیے مقرر کر دی ہو - دوسرے یہ کہ عورت نے اپنے لیے نفقے کی کسی خاص مقدار پر مرد سے مصالحت کرلی ہو تو ان دونوں صورتوں میں قاضی اس کے گذشتہ نفقہ کی ادائیگی کا حکم دے گا کیونکہ نفقہ صلہ کی حیثیت رکھتا ہے - یعنی عطیہ و احسان کے طور پر دیا جاتا ہے - ہمارے نزدیک جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں یہ ملک کا عوض نہیں ہے تو اس کا واجب ہونا فقط قاضی کے فیصلے ہی سے مستحکم ہو سکتا ہے - جیسا کہ ہبہ کی صورت میں جب تک کہ اسے مضبوط کرنے والی چیز یعنی قبضہ نہ پایا جائے ملک واجب نہیں ہوتی اور مرد و عورت کا کسی مقدار پر مصالحت کرنا بھی قاضی کے فیصلے کے مترادف ہوگا

کیونکہ شوہر کی اپنی ذات پر ولایت قاضی سے بڑھ کر ہوتی ہے بخلاف مہر کے کیونکہ وہ تو ملکیت کا عوض ہوتا ہے (لہذا وہ قاضی کے فیصلے اور باہمی مصالحت کے بغیر بھی واجب ہوتا ہے) ۔

مسئلہ : اگر شوہر کو نفقے کا حکم دیا گیا ، مگر وہ کچھ عرصہ بعد مر گیا اور چند مہینے گزر گئے تو نفقہ ساقط ہو جائے گا ۔ ایسا ہی اگر زوجہ مر جائے (تو بھی ساقط ہو جائے گا) کیونکہ نفقہ تو ایک عطیہ ہے اور اس قسم کے عطیات موت سے ساقط ہو جاتے ہیں ۔ جیسا کہ کسی شخص نے کوئی چیز ہبہ کی مگر موہوب لہ کے قبضہ کرنے سے پہلے ہبہ کرنے والا مر گیا تو ہبہ باطل ہو جائے گا ۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ نفقہ قاضی کے فیصلے سے پہلے بھی شوہر کے ذمے قرض ہوگا اور اس کی موت کے بعد بھی ساقط نہ ہوگا کیونکہ امام شافعیؒ کے نزدیک نفقہ عوض کا درجہ رکھتا ہے لہذا یہ دوسرے قرضوں کی طرح ہوگا (جو موت سے ساقط نہیں ہوتے) اس کا جواب ہم پہلے بیان کر چکے ہیں (کہ ملک مہر کا عوض ہوتی ہے ۔ اگر نفقہ کو بھی عوض قرار دیں تو ایک چیز کے دو عوض ہو جائیں گے) ۔

مسئلہ : اگر شوہر نے زوجہ کو ایک سال کا نفقہ پیشگی دے دیا اور وہ مر گیا تو زوجہ سے کچھ بھی واپس نہیں لیا جائے گا ۔ یہ امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کا قول ہے ۔ مگر امام محمد فرماتے ہیں کہ جتنا عرصہ گزر چکا ہو اس

کا شمار کر کے عورت کو نفقہ دیا جائے گا اور باقی ماندہ شوہر کا ہوگا امام شافعیؒ بھی اسی کے قائل ہیں ۔

لباس کے سلسلے میں بھی یہی اختلاف ہے کیونکہ شوہر کے حبس اور روکنے سے عورت کو شوہر پر جس قدر حق حاصل ہوا تھا وہ اسے بطور عوض پیشگی وصول کر چکی ہے مگر شوہر کے مرنے سے وہ حق باطل ہوگیا تو اسی اندازے سے عوض بھی باطل ہوگا ۔ جیسا کہ قاضی کا روزینہ اور مجاہدین کا وظیفہ (کہ جب وہ اپنے فرائض ادا کر رہے ہوں تو اپنا مقررہ حصہ لے سکتے ہیں ورنہ نہیں ۔ اگر انہیں ان کا ایک سال کا وظیفہ پیشگی دے دیا جائے مگر وہ چھ ماہ بعد کام چھوڑ دیں تو ان سے چھ ماہ کا وظیفہ واپس لے لیا جائیگا)۔

شیخینؒ کی دلیل یہ ہے کہ نفقہ ایک عطیہ ہے جس پر عورت قبضہ کر چکی ہے اور عطیات موت کے بعد واپس نہیں کیے جاتے کیونکہ ان کا حکم پورا ہو جاتا ہے جیسا کہ ہبہ میں ہوتا ہے (اگر ہبہ کرنے والا مر جائے تو موہوب لہ سے موہوب شے واپس نہیں لی جاتی) اس بناء پر اگر پیشگی دیا جانے والا نفقہ ضائع ہوجائے اور ضائع ہونے میں عورت کا ہاتھ نہ ہو تو سب کے نزدیک بالاتفاق کچھ بھی واپس نہ لیا جائے گا ۔

امام محمدؒ سے دوسری روایت یہ ہے کہ اگر عورت نے ایک ماہ یا کم عرصے کا نفقہ وصول کر لیا تو شوہر کے مرنے پر اس سے کچھ بھی واپس نہیں لیا جائے گا کیونکہ یہ تھوڑی سی مقدار ہے تو گویا فی الحال کا نفقہ ہوگی ۔

مسئلہ : اگر غلام نے کسی آزاد عورت سے نکاح کیا تو اس کا نفقہ غلام کے ذمے قرض ہوگا اور وہ نفقے کے عوض فروخت کیا جائے گا ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غلام نے مالک کی اجازت سے نکاح کیا کیونکہ یہ نفقہ غلام کے ذمے ہے ۔ جس کا سبب یعنی عقد موجود ہے اور اس قرض کا واجب ہونا مالک کے حق میں بھی ظاہر ہوگا (کیونکہ نکاح اس کی اجازت سے قرار پایا ہے) تو یہ قرضہ غلام کے ذمے ہوگا ۔ جیسا کہ تجارت کا قرضہ غلام کے ذمے ہوتا ہے (یعنی اگر غلام کو تجارت کی اجازت ہو اور وہ مقروض ہو جائے تو قرض اس کی گردن پر ہوگا اور اسے بیچ کر ادا کر دیا جائے گا) البتہ مالک کو یہ اختیار ہے کہ غلام کا فدیہ دیدے کیونکہ عورت کا حق نفقے میں ہے نہ کہ غلام کی گردن میں ۔ اگر غلام مر جائے تو فدیہ ساقط ہو جائے گا ۔ اسی طرح اگر غلام قتل کر دیا گیا تو بھی صحیح روایت کے مطابق نفقہ ساقط ہو جائے گا ۔ کیونکہ نفقہ تو زندگی کا عطیہ تھا (اور اس قسم کے عطیات موت سے باطل ہو جاتے ہیں) ۔

مسئلہ : اگر آزاد مرد نے کسی باندی سے نکاح کر لیا اور مولی نے اسے شوہر کے پاس شب بسری کی اجازت دے دی تو خاوند پر اس کا نفقہ واجب ہوگا کیونکہ اس صورت میں احتباس ثابت ہوگیا ۔ لیکن اگر مالک اسے خاوند کے پاس شب بسری کی اجازت نہ دے تو عورت کو نفقہ نہیں ملے گا ، کیونکہ احتباس جاتا رہا ۔

تبویت سے یہ مراد ہے کہ مالک باندی کو اس کے خاوند کے ساتھ اس کے گھر میں قیام کرنے دے اور خود باندی سے خدمت نہ لے اگر شوہر کے گھر میں بسانے کے بعد پھر اپنی خدمت میں لے تو نفقہ ساقط ہوجائے گا، کیونکہ احتباس جاتا رہا۔

کتاب النکاح میں گزرچکا ہے کہ شوہر کا گھر بسانا مالک پر لازمی نہیں ہے اگر مالک لونڈی کو پورے طور پر اپنی خدمت کے لیے مامور نہ کرے بلکہ گاہے بگاہے باندی خود اس کے کام کر دیا کرے تو مرد کے ذمے سے نفقہ ساقط نہیں ہوگا کیونکہ مولی نے اسے واپس لینے کے طور پر خدمت نہیں لی۔

مدبرہ اور ام ولد کے احکام بھی دوسری باندیوں جیسے ہوں گے۔

# فصل

مسئلہ : شوہر پر واجب ہے کہ وہ اپنی بیوی کو ایسے مکان میں ٹھہرائے جس میں شوہر کے خاندان کا کوئی فرد سکونت پذیر نہ ہو۔ ہاں اگر عورت خود ان کے ساتھ رہنا پسند کرے تو کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ جائے سکونت مہیا کرنا بھی کفایت سے ہے۔ لہذا نفقے کی طرح جائے سکونت بھی واجب ہوگی اور اللہ تعالی نے بھی اس کو نفقے سے متصل کرکے واجب کیا ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ جائے سکونت عورت کا شرعی حق ہے تو اسے اختیار حاصل ہوگا کہ کسی دوسرے کو رہائش میں شریک نہ کرے

کیونکہ دوسروں کی شرکت سے اسے تکلیف پہنچتی ہے اس صورت میں اس کا سامان محفوظ نہیں ہوتا نیز وہ اپنے خاوند کے ساتھ بے تکلفی سے میل جول بھی قائم نہیں رکھ سکتی اور نہ ازدواجی تعلقات ہی سے مستفید ہو سکتی ہے۔ اگر عورت کسی کو خود اجازت دے دے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ اپنے حق میں کمی پر وہ خود راضی ہوئی ہے۔

مسئلہ : اگر خاوند کا دوسری بیوی سے کوئی بیٹا ہو تو اسے وہ بیوی کے ساتھ نہیں ٹھہرا سکتا۔ اس کی وجہ ابھی ہم نے بیان کی ہے۔ اگر شوہر اپنے گھر میں بیوی کو ایسے الگ کمرے میں ٹھہرائے جس کا الگ دروازہ بھی ہو تو کافی ہے کیونکہ اس سے مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔

مسئلہ : اور زوجہ کے والدین یا اس کے پہلے خاوند کے لڑکے یا اس کے رشتہ داروں کو شوہر اپنے گھر آنے سے منع کرنے کا اختیار رکھتا ہے کیونکہ مکان خاوند کی ذاتی ملکیت ہے اور وہ اپنی ملکیت میں داخل ہونے سے روک سکتا ہے۔

مسئلہ : شوہر کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ بیوی کے رشتہ داروں کو میل ملاقات اور بات چیت کرنے سے منع کرے ، وہ جب چاہیں ملاقات کر سکتے ہیں کیونکہ ان کے روکنے سے قطع رحمی لازم آتی ہے (اور یہ شرعاً ممنوع ہے) اور ان کی میل ملاقات سے خاوند کا کچھ نقصان بھی نہیں۔ بعض مشائخ کا کہنا ہے کہ خاوند میل ملاقات کی طرح گھر

میں داخل ہونے اور گفتگو کرنے سے بھی نہیں روک سکتا ۔ ہاں انہیں وہاں رہنے سے منع کر سکتا ہے کیونکہ طویل گفتگو اور زیادہ ٹھہرنے میں فتنے کا احتمال ہے ۔

بعض علماء نے کہا کہ مرد ہفتہ میں ایک بار عورت کو اپنے والدین کے ہاں جانے اور انہیں اس کے پاس آنے سے منع نہیں کر سکتا (اسی پر فتوی بھی ہے) ہاں دوسرے محرموں کو سال میں ایک آدھ بار ملاقات کی اجازت دے سکتا ہے اور یہی ثابت ہے ۔

مسئلہ : اگر کوئی شخص کہیں چلا جائے ۔ اس کا کچھ مال کسی دوسرے شخص کے پاس ہو جس کا وہ معترف ہو اور اسے یہ بھی اعتراف ہو کہ یہ عورت مرد غائب کی بیوی ہے تو قاضی اس مال سے غائب شخص کی بیوی ، کمسن اولاد اور اس کے والدین کا گزارہ مقرر کر دے گا ۔ اسی طرح اگر قاضی کو مال امانت کا علم ہو جائے (کہ غائب شخص کا مال فلاں کے پاس امانت ہے اور فلاں عورت مرد غائب کی بیوی ہے) خواہ امانت رکھنے والا معترف نہ بھی ہو (تو قاضی زوجہ ، کمسن اولاد اور والدین کا گزارہ اس کے مال سے مقرر کر دے گا) پہلے مسئلے کی وجہ یہ ہے کہ جب اس نے زوجیت اور ودیعت دونوں کا اقرار کر لیا تو گویا اس نے یہ بھی اقرار کر لیا کہ اس زوجہ کو مال سے نفقہ لینے کا حق حاصل ہے ۔ کیونکہ زوجہ شوہر کی رضامندی کے بغیر بھی اس کے مال سے بقدر کفایت لے

سکتی ہے اور قابض مال کا اقرار اپنے حق میں مقبول ہوتا ہے خصوصاً زیر بحث صورت میں ۔ کیونکہ اگر وہ ودیعت یا زوجیت میں سے کسی امر کا انکار کرتا تو اس کے خلاف عورت کے گواہ قبول نہ ہوتے کیونکہ زوجیت کے ثبوت کے لیے ودیعت رکھنے والا مدعی علیہ نہیں بن سکتا اور نہ زوجہ ہی مرد غائب کے حقوق ثابت کرنے کے لیے مدعیہ بن سکتی ہے ۔ لیکن جب ودیعت رکھنے والے نے خود دونوں باتوں کا اقرار کر لیا تو یہ ثبوت و اعتراف غائب کی طرف منسوب ہوگا ۔ (یعنی اس کے مال سے نفقہ دیا جائے گا) اور اگر غائب شخص کا مال اس کے پاس بطور مضاربت موجود ہو تو بھی مسئلے کی صورت یہی ہوگی (اور مضاربت کہتے ہیں کسی کے مال سے حصے پر تجارت کا کاروبار کرنے کو) یا کسی کے ذمہ خاوند کا قرض ہو تو بھی یہی صورت ہوگی (کہ مضارب یا قرضدار کے مضاربت یا قرضے اور زوجیت کا اعتراف کر لینے پر زوجہ، اولاد صغار اور والدین کو اسکے مال سے بقدر نفقہ ملے گا ۔ یا اگر قاضی کو علم ہو جائے اور مضارب یا قرضدار اعتراف نہ بھی کریں تو بھی وہ بقدر نفقہ دلوائے گا) ۔

یہ سب صورتیں اسی وقت ہیں جب مال عورت کے حق جنس سے تعلق رکھتا ہو ۔ مثلاً روپیہ پیسہ اناج یا پوشاک جس قسم کا عورت کا حق ہو ۔

اگر مال عورت کی جنس سے مختلف ہو (مثلاً زمین ،

مکان یا غلام وغیرہ) ہو تو قاضی اس میں نفقہ مقرر نہیں کرے گا ۔ کیونکہ نفقہ ادا کرنے کے لیے اس مال کو فروخت کرنا پڑتا ہے اور یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ غائب کا مال فروخت نہیں کیا جا سکتا ۔

امام ابو حنیفہ کے نزدیک جب حاضر کا مال فروخت نہیں کیا جاتا تو غائب کا بدرجۂ اولی نہیں بیچا جائے گا ۔ صاحبین کے نزدیک فروخت اس لیے منع ہے کہ حاضر شخص کے مال کی فروخت کرنے کا حکم قاضی اس لیے دیتا ہے کہ وہ شخص اداء حق سے انکار کرتا ہے مگر غائب کے متعلق یہ حکم نہیں دے سکتا ۔ کیونکہ اسے اس کے انکار کا کچھ علم نہیں ۔

مسئلہ : امام قدوری فرماتے ہیں کہ قاضی فیصلہ کرتے وقت عورت کی طرف سے ایک ضامن لے گا تاکہ غائب کے مال کی بڑی نگہداشت ہو سکے ۔ کیونکہ بسا اوقات یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مرد سے پیشگی نفقہ لے چکی ہو یا مرد نے اسے طلاق دے دی ہو اور اس کی عدت بھی ختم ہو چکی ہو ۔

لیکن امام اعظم میراث کی صورت میں ضامن نہیں لیتے ۔ یعنی اگر کوئی شخص مر جائے اور اس کے حاضر وارث گواہ پیش کر دیں جو یہ شہادت دیں کہ ہم اس کے وارث ہیں اور یہ نہ کہیں کہ ہم ان کے علاوہ دوسرے وارثوں کو نہیں جانتے تو اس صورت میں امام اعظم کے

نزدیک ضامن نہیں لیا جاتا ۔ کیونکہ اس شخص کا پتا ہی نہیں جس کے لیے ضامن لیا جائے۔ مگر نفقے کی صورت میں اس کا علم ہوتا ہے اور وہ خاوند ہے ۔ نفقہ مقرر کرنے سے پہلے قاضی عورت سے اللہ تعالی کی قسم لے گا کہ مجھے مرد نے نفقہ نہیں دیا قسم لینے سے مقصد غائب مرد کے مال کی نگہداشت ہے ۔

مسئلہ : امام قدوری ؒ فرماتے ہیں کہ زوجہ ، اولاد صغار اور والدین کے علاوہ قاضی اور کسی فرد کے لیے غائب کے مال سے نفقہ مقرر نہیں کر سکتا ۔ فرق کی وجہ یہ ہے کہ ان افراد کا نفقہ تو قاضی کی قضاء سے پہلے ہی واجب ہوتا ہے لہذا وہ اسکو قاضی کی قضاء سے پہلے بھی لے سکتے ہیں ۔ قاضی کا فیصلہ تو محض اعانت کی ایک قسم ہے جہاں تک دوسرے رشتہ داروں کے نفقے کا تعلق ہے تو ان کا نفقہ فقط قاضی کے فیصلے ہی سے واجب ہوگا ۔ کیونکہ اس مسئلے میں ائمہ کا اختلاف ہے اور قاضی غائب آدمی پر حکم نافذ نہیں کر سکتا ۔

اب مسئلے کی دوسری صورت کو لیجیئے ۔کہ قاضی کو اگر عورت کی زوجیت کا علم نہ ہو ۔ اور نہ وہ شخص ہی اعتراف کرے جس کے پاس مال موجود ہے ۔ مگر عورت اپنی زوجیت شہادت سے ثابت کر دے یا یہ صورت ہو کہ مرد غائب نے کوئی مال ہی نہ چھوڑا ہو لیکن عورت اپنی زوجیت کے ثبوت میں گواہ پیش کر دے کہ قاضی اس کا نفقہ مقرر کرے

اور مرد غائب کی ذمہ داری پر قرض لیتی رہے ۔ تو قاضی اس قسم کا فیصلہ نہیں کر سکتا کیونکہ اس میں قضاء علی الغائب لازم آئے گی ۔

امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ قاضی عورت کی نگہداشت کرتے ہوئے نفقے کی مقدار مقرر کر سکتا ہے اور اس سے غائب شخص پر کوئی ضرر نہیں آتا (وہ عورت کو قرض لینے کا حکم دے سکتا ہے) کیونکہ جب خاوند حاضر ہو کر اس کی زوجیت کی تصدیق کر دے تو ثابت ہو گیا کہ اس نے اپنا حق لیا تھا اگر مرد انکار کرے تو اس سے قسم لی جائے گی ۔ اگر قسم سے منکر ہو تو عورت کی سچائی ثابت ہو جائے گی ۔ یا عورت اگر گواہ پیش کر دے تو بھی اس کا حق ثابت ہو جائیگا ۔ لیکن اگر گواہ بھی پیش نہ کر سکے ، تو ضامن ذمہ دار ہوگا یا خود عورت ۔

آج کل قاضی اسی قول پر عمل کرتے ہیں اور مرد غائب کو نفقے کا حکم دیتے ہیں کیونکہ اس سے لوگوں کی ضروریات کا حل ہوتا ہے ۔ لیکن ائمہ میں یہ مسئلہ بھی مختلف فیہ ہے ۔ اس مسئلے میں اور بھی کئی قسم کے ضعیف اقوال منقول ہیں لیکن ہم نے ان کا ذکر نہیں کیا ۔

## فصل

مسئلہ : اگر مرد نے عورت کو طلاق دی، طلاق خواہ رجعی ہو یا بائن ، تو عدت کے دوران اس کے اخراجات اور جائے رہائش کا انتظام مرد کے ذمے ہوگا ۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ بائن طلاق پانے والی کا شوہر پر کوئی نفقہ نہیں ہاں اگر وہ حاملہ ہو تو اسے نفقہ دیا جائے گا۔ طلاق رجعی کی صورت میں نفقہ اس لیے واجب ہوتا ہے کہ نکاح عدت کے اختتام تک موجود رہتا ہے — خصوصاً ہمارے نزدیک کیونکہ اس سے مجامعت کرنا جائز ہوتا ہے۔

طلاق بائن کی صورت میں نفقے کے عدم وجوب کی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے جسے فاطمہ بنت قیس نے روایت کیا، کہا مجھے میرے خاوند نے تین طلاقیں دیں تو آنحضرت ﷺ نے میرے لیے نہ نفقہ مقرر فرمایا اور نہ جائے سکونت ہی۔

امام شافعیؒ کی دوسری دلیل یہ ہے کہ ایسی عورت پر شوہر کی ملک ختم ہو جاتی ہے اور نفقہ ملک نکاح پر مترتب ہوتا ہے اس لیے اس عورت کے لیے بھی نفقہ واجب نہیں ہوتا جس کا خاوند مر جائے کیونکہ ملک زائل ہوگئی۔ رہا حاملہ کا مسئلہ تو اس کے نفقے کا وجوب ہمیں نص قرآنی سے ملتا ہے۔ باری تعالی کا ارشاد ہے: "وإن كن أولات حمل فانفقوا عليهن" اگر مطلقہ عورتیں حاملہ ہوں تو ان کا نفقہ ادا کرو۔

ہماری دلیل جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں یہ ہے کہ نفقہ تو عورت کو روکنے کے بدلے میں دیا جاتا ہے اور احتباس ابھی نکاح کے مقصود یعنی بچے کے لحاظ سے موجود

ہے کیونکہ عدت بچے کو بچانے کے لیے ہی واجب ہوتی ہے۔ لہذا نفقہ واجب ہوگا۔ اسی لیے سکونت کی جگہ کا انتظام بھی متفقہ طور پر واجب ہے (جس کے قائل امام شافعیؒ بھی ہیں) تو گویا (مطلقہ بائنہ بھی حاملہ ہی کی طرح ہو گئی۔)

فاطمہ بنت قیس کی روایت کو حضرت عمرؓ نے رد کر دیا تھا آپ نے فرمایا: ”لاندع کتاب ربنا وسنة نبینا بقول امرأة لاندری صدقت أم کذبت، حفظت أم نسیت، سمعت رسول اللہ علیه الصلاة والسلام یقول المطلقة الثلاث النفقة والسکنی مادامت فی العدة“ ورده أیضاً زید بن ثابت وأسامة بن زید وجابر وعائشة رضی اللہ عنهم۔ کہ ہم کتاب اللہ اور سنت نبوی کو ایک عورت کے کہنے پر ترک نہیں کر سکتے کیا پتا کہ جھوٹ بول رہی ہو یا سچ کہہ رہی ہو یا اصل واقعے کو بھول چکی ہو یا اس کی یاد میں ہو حالیکہ میں نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے: مطلقۂ ثلاث کے لیے جب تک وہ عدت میں ہے نفقہ اور سکنی دونوں واجب ہیں نیز حضرت زید بن ثابت اسامہ بن زیدؓ اور حضرت عائشہؓ نے بھی فاطمہ بنت قیس کی روایت کو رد کر دیا تھا۔

مسئلہ: جس عورت کا خاوند مر جائے اس کے لیے عدت کا نفقہ نہیں کیونکہ اب اس کا احتباس شوہر کے حق کے لیے نہیں بلکہ حق شرع کے لیے ہے اس لیے کہ اس عدت گزارنا عبادت میں شامل ہے۔ کیا آپ کو تسلیم نہیں کہ اس عدت

میں استبراء رحم مقصود نہیں ہوتا حتی کہ اس میں حیض کی شرط بھی نہیں ہوتی ۔ لہذا اس کا نفقہ شوہر متوفی پر واجب نہ ہوگا ۔

دوسری دلیل یہ کہ نفقہ تھوڑا تھوڑا واجب ہوتا ہے (کہ ہر روز کا نفقہ اسی روز مل جائے) لیکن موت کے بعد شوہر کی کوئی ملکیت نہیں ہوتی اور وارثوں کی ملکیت میں اس (نفقہ) کا واجب کرنا ممکن نہیں ۔

**مسئلہ :** ہر وہ جدائی جس کا باعث عورت کی طرف سے معصیت ہے مثلاً وہ مرتد ہو جائے یا شہوانی جذبات کے تحت شوہر کے بیٹے کو چوم لے تو عورت کو نفقہ نہیں ملے گا ، کیونکہ اس نے اپنے آپ کو ناحق روک رکھا ہے اور یہ اس نافرمان عورت کی مانند ہے جو نافرمانی کرتے ہوئے مرد کے گھر سے نکل جائے ۔ البتہ دخول کے بعد مہر کے واجب ہونے کی صورت اس سے مستثنی ہے ، کیونکہ مجامعت کی صورت میں وہ اپنے آپ کو مرد کے سپرد کر چکی ہے ، لہذا مہر کا حق ثابت ہو گیا ۔ نیز اس صورت کا حکم بھی الگ ہوگا جبکہ جدائی کا باعث تو عورت ہو مگر اس کی طرف سے معصیت نہ پائی جائے ۔ جیسے خیار عتق ، خیار بلوغ اور عدم کفو کی بناء پر تفریق کا واقع ہونا ، کیونکہ ان صورتوں میں عورت کا اپنے آپ کو روکنا ایک حق کی وجہ سے ہے اور اس سے نفقہ ساقط نہیں ہوتا ۔ جیسا کہ وہ اپنے آپ کو اگر مہر کی وصولی کے لیے روکے رکھے تو اسے نفقہ ملتا رہے گا ۔

مسئلہ : اگر مرد نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں اور پھر وہ نعوذ باللہ مرتد ہو گئی تو اس کا نفقہ ساقط ہوجائیگا ، لیکن اگر اس نے اپنے شوہر کے بیٹے کو مجامعت پر قادر کیا تو نفقہ ساقط نہ ہوگا ۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ طلاق لینے کے بعد اسے قدرت دے کیونکہ فرقت تو تین طلاقوں ہی سے ثابت ہو چکی ہے۔ اس میں ارتداد یا شوہر کے بیٹے کو قادر کرنے کا کوئی دخل نہیں البتہ مرتد ہونےکی صورت میں اسے قید کر دیا جائے گا حتی کہ توبہ کرلے اور قیدی کا نفقہ واجب نہیں ہوتا اور شوہر کے بیٹے کو قادر کرنےوالی قید نہیں کی جاتی ۔ لہذا دونوں میں فرق ہوگا ۔

## فصل

مسئلہ : نابالغ بچوں کے اخراجات صرف باپ کے ذمے ہیں ۔ اس ذمہ داری میں باپ کے ساتھ کوئی اور شریک نہ ہوگا جیسا کہ اس کی زوجہ کے نفقے میں .کوئی دوسرا شریک نہیں ہوتا باری تعالی کا ارشاد ہے : "وعلی المولود رزقہن" کہ عورتوں کا نفقہ صاحب اولاد کے ذمہ ہے اور صاحب اولاد باپ ہی ہوتا ہے ۔

مسئلہ : اگر صغیر دودھ پیتا بچہ ہو تو قاضی اس کے دودھ پلانے کو ماں پر واجب نہیں کر سکتا ۔ اس کی دلیل ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ کفالت کی ذمہ داری باپ پر ہے اور دودھ پلانے کی اجرت نفقے کی طرح ہے ۔

دوسرے ممکن ہے کہ کسی عذر کی بناء پر ماں دودھ

پلانے پر قادر نہ ہو تو اس پر جبر کرنا بے فائدہ ہے۔

اللہ تعالی کے ارشاد: "ولا تضار والدة بولدها" (کہ والدہ اپنے بچے کی وجہ سے ضرر نہیں اٹھائے گی) کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ ماں کی عدم رضا کی صورت میں بچے کا دودھ پلانا اس پر لازم نہ کیا جائے گا۔ یہ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے یہ قضاءِ ظاہری کا بیان ہے اور یہ بھی اس وقت نافذ ہوگا جب بچے کو دودھ پلانے والی میسر ہوسکے۔ اگر کوئی ایسی عورت نہ مل سکے جو اسے دودھ پلائے تو ماں کو دودھ پلانے پر مجبور کیا جائے گا، تاکہ بچے کو ضائع ہونے سے بچایا جا سکے۔

مسئلہ: امام قدوری فرماتے ہیں کہ باپ ایسی عورت کو نوکر رکھے جو اس کی ماں کے پاس دودھ پلائے۔

باپ کے نوکر رکھنے کا یہ مفہوم ہے کہ اجرت باپ کے ذمے ہوگی اور 'عندها' (یعنی اس کی ماں کے پاس دودھ پلانے) کے یہ معنی ہیں کہ جب ماں اس بات کا تقاضا کرے تو اس کے پاس ہی دودھ پلایا جائے گا کیونکہ گود کا حق ماں ہی کا ہے۔

مسئلہ: اگر باپ نے ماں ہی کو اجرت پر دودھ پلانے کو رکھ لیا حالانکہ وہ اس کی زوجہ ہے یا عدت گزار رہی ہے تو یہ اجارہ نہ ہوگا کیونکہ اس پر تو شرعاً دودھ پلانا واجب ہے (اجارہ کے کیا معنی؟) اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "والوالدات یرضعن أولادهن"۔ یعنی مائیں اپنے بچوں کو دودھ

پلائیں اور اس احتمال کے مدنظر کہ شاید وہ دودھ پلانے سے عاجز ہو اسے معذور تصور کیا گیا تھا ۔ لیکن جب وہ اجرت پر پلانے کو تیار ہو گئی تو ثابت ہو گیا کہ وہ دودھ پلانے پر قادر ہے اور پلانا اس پر واجب بھی تھا لہذا وہ اجرت ہرگز وصول نہیں کر سکتی ۔

اور أجرت کا جائزہ نہ ہونا طلاق رجعی کی صورت میں متفق علیہ ہے کیونکہ عدت کے اختتام تک نکاح قائم رہتا ہے ۔

ایک روایت کے مطابق تو معتدہ بائنہ بھی اجرت نہیں لے سکتی ۔ مگر دوسری روایت سے اجرت کا جواز ملتا ہے ۔ کیونکہ طلاق بائن سے نکاح زائل ہو چکا ہے ۔ پہلی روایت یہ ہے کہ (عدت ، نفقہ و سکنی وغیرہ) بعض احکام کے پیش نظر نکاح باقی قرار دیں گے ۔

مسئلہ : اگر مرد اپنی منکوحہ یا معتدہ بیوی کو دوسری زوجہ کے بچہ کو دودھ پلانے کے لیے اجرت پر رکھے تو جائز ہے کیونکہ اس بچے کو دودھ پلانا اس پر واجب نہیں ۔

مسئلہ: اگر عورت کی عدت کے خاتمہ کے بعد بچے کو اجرت پر دودھ پلانے کے لیے مقرر کرے تو روا ہے ۔ کیونکہ عدت کے بعد نکاح کلیۃً زائل ہو چکا ہے اور وہ عورت گویا اجنبیہ ہے ۔

مسئلہ: اگر بچے کا والد کہے کہ میں بچے کی (مطلقہ) ماں کو اجرت پر مقرر نہیں کرتا اور وہ کوئی اور دودھ پلانے والی لے آئے اور ماں اسی اجرت پر بچے کو دودھ پلانے پر راضی ہو جس پر اجنبیہ یا وہ بلا اجرت ہی پلانے پر تیار ہو تو ماں ہی دودھ پلانے کی حقدار ہوگی کیونکہ اس کے دل میں بچے کے لیے جو فطرتی شفقت ہے اجنبیہ اس سے محروم ہے۔ لہذا بچے کا مفاد اسی میں ہے کہ اسے والدہ کے سپرد کیا جائے۔

مسئلہ : اگر ماں غیر عورت سے زیادہ اجرت کا مطالبہ کرے تو باپ کو اضافے پر مجبور نہیں کیا جائے گا تا کہ اسے خواہ مخواہ نقصان نہ پہنچایا جائے۔ اللہ تعالی کے ارشاد: "ولا تضار والدۃ بولدھا ولا مولود لہ بولدہ" سے بھی یہی مفہوم ہے کہ اجنبیہ عورت سے زیادہ اُجرت دینا واجب نہ ہوگا۔

مسئلہ : چھوٹے بچے کا نفقہ اس کے باپ پر واجب ہوتا ہے خواہ باپ دینی لحاظ سے اس سے اختلاف رکھتا ہو جیسا کہ زوجہ کا نفقہ اس پر واجب ہوتا ہے اگرچہ زوجہ مذہبی لحاظ سے اس کے مخالف ہی کیوں نہ ہو۔ بچے کے نفقے کی دلیل وہی آیۃ "وعلی المولود لہ رزقھن" ہے جو کہ نفقے کے حق میں مطلق ہے (دینی مطابقت یا مخالفت کی کوئی تخصیص نہیں)۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ بچہ اپنے باپ کا جزء ہے گویا کہ وہ خود ہی ہے۔ (تو جس طرح اس پر اپنی ذات کا نفقہ واجب ہے اسی طرح اپنے جزء کا بھی واجب ہوگا۔)

زوجہ کے نفقے کا سبب عقد صحیح ہے (اور وہ موجود ہے) اس لیے کہ یہ نفقہ اس احتباس کے کے عوض میں ہے جو نکاح صحیح سے ثابت ہے۔ مسلمان اور کافرہ کتابیہ کے مابین بھی عقد صحیح ہوتا ہے۔ اور اس پر احتباس بھی مرتب ہوگا لہذا نفقہ بھی واجب ہوگا۔

ان تمام مذکورہ صورتوں میں اگر صغیر کا کوئی مال نہ ہو تو نفقہ باپ پر واجب ہوگا۔ لیکن اگر صغیر کا اپنا مال ہو تو اصول یہ ہے کہ انسان کا نفقہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اس کے اپنے مال سے ہوتا ہے لہذا نفقہ باپ پر واجب نہیں ہوگا بلکہ اس کے مال سے دیا جائے گا)۔

# فصل

مسئلہ: مرد پر واجب ہے کہ اگر اسکے والدین اجداد اور جدات محتاج ہوں تو وہ انہیں نفقہ دے خواہ وہ دینی لحاظ سے اس سے اختلاف ہی رکھتے ہوں۔

ماں باپ کے متعلق اللہ تعالی کا ارشاد ہے ”وصاحبہما فی الدنیا معروفاً“(یعنی دنیوی امور میں والدین کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرو) یہ آیت کافر والدین کے بارے میں نازل ہوئی تھی اور یہ بھلائی نہیں ہے کہ انسان خود تو خداداد نعمتوں میں عیش و آرام کی زندگی بسر کرے اور والدین بھوک سے بلکتے رہیں اور ہلاک ہو جائیں۔

اجداد اور جدات کی حیثیت بھی باپوں اور ماؤں کی سی

ہے کیونکہ باپ کی غیر موجودگی میں دادا ہی قائم مقام ہوتا ہے نیز انسان کی زندگی کا سبب بھی اجداد وجدات ہوتے ہیں لہذا ان کا بھی اس شخص پر حق ہے کہ وہ زندگی بسر کرنے کے لئے ان کی والدین کی طرح کفالت کرے۔ امام قدوری نے فقر کی شرط لگائی ہے کیونکہ باپ اگر متمول ہو تو اس کا نفقہ اسی کے مال میں واجب کرنا زیادہ مناسب ہے بہ نسبت اس کے کہ کسی دوسرے کے مال میں واجب کیا جائے۔ والدین کے نفقے میں اختلاف مذہب حائل نہیں ہوتا اس کی تائید میں نص قرآنی پیش کی جا چکی ہے۔

مسئلہ : اختلاف دین کی وجہ سے صرف مندرجہ ذیل افراد کا نفقہ واجب ہوگا، ان کے علاوہ اور کسی کا نہیں۔

زوجہ، والدین، اجداد، جدات، بیٹے اور پوتے

زوجہ کے بارے میں تو ہم بتا چکے ہیں کہ نفقہ عقد کی وجہ سے واجب ہے کیونکہ وہ اپنے شوہر کے حق مقصود کی وجہ سے پابند ہو جاتی ہے اور اس میں اتحاد مذہب کا کوئی دخل نہیں۔

رہے دوسرے مذکورہ رشتہ دار تو ان میں جزئیت ثابت ہے (کیونکہ اجداد و جدات کا بہ خود جزء ہے اور بیٹے اور پوتے اس کے جزء ہیں) اور انسان کا جزء ذات کے معنی میں ہوتا ہے۔ تو جس طرح انسان کے کفر کی وجہ سے اس کی ذات کا نفقہ ساقط نہیں ہوتا جزء کا نفقہ بھی ساقط نہ ہوگا۔

اگرمذکورہ رشتہ دارحربی ہوں توان کا نفقہ مسلمان پر واجب نہیں ہوگا ۔ اگر یہ لوگ امان طلب کرکے دارالاسلام میں بھی آ جائیں تو بھی نفقہ واجب نہ ہوگا ۔کیونکہ ہمیں اس شخص کے ساتھ بھلائی کرنے کی ممانعت ہے جو ہمارے ساتھ مقابلہ و مقاتلہ کرے ۔

مسئلہ: نصرانی پر اپنے مسلمان بھائی کا نفقہ واجب نہیں اسی طرح مسلمان پر اپنے نصرانی بھائی کا نفقہ بھی لازم نہ ہوگا کیونکہ نص قرآنی کے مطابق نفقے کاتعلق وراثت سے ہے ۔ بخلاف اس صورت کے کہ ملک کی وجہ سے آزادی حاصل ہو (یعنی اگر مسلمان اپنے نصرانی بھائی کو خرید لے تو وہ آزاد ہو جائے گا) کیونکہ حریت کا تعلق قرابت اور رشتہ داری سے ہے یہی بات حدیث سے ثابت ہے (کہ جو شخص کسی ذی رحم محرم کا مالک بن جائے تو وہ آزاد ہو جائے گا) ۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ قرابت صرف رشتہ دارکے ساتھ بھلائی کا تقاضا کرتی ہے ۔ مگر اتحاد دین کی وجہ سے یہ تقاضا اور زیادہ شدید ہو جاتا ہے(کہ نفقہ بھی واجب ہوجاتا ہے) اور کسی رشتہ دار کا غلامی میں رکھنا نفقہ سے محروم کر دینے کی نسبت سے زیادہ نقصان دہ اور قطع رحمی کا سبب بنتا ہے ، تو ہم نے اعلی چیز میں اصل علت کا اعتبار کیا اور ادنی میں علة مؤکدہ کا، لہذا دونوں میں فرق واضح ہوگیا یعنی کسی محرم رشتہ پر ملکیت حاصل کرکے اسے غلامی

میں برقرار رکھنا حرام اور بہت بڑی برائی ہے تو ہم نے اس کی علت قطع رحمی قرار دی کہ اگر وہ ایسے آزاد نہیں کرتا تو ایک قبیح جرم کا مرتکب ہو رہا ہے اور کافر بھائی کو نفقہ نہ دینا پہلی برائی سے کہیں کم درجے کی برائی ہے لہذا ہم نے کہا کہ اگر نفقہ دے تو اچھا ہے ورنہ اس پر واجب نہیں ۔ ہاں اگر نسبتی قرابت کے علاوہ دین میں بھی متفق ہو تو نفقہ واجب ہوگا ۔ لہذا آزاد ہونے میں اور نفقہ واجب ہونے میں فرق واضح ہوگیا) ۔

مسئلہ : والدین کو نفقہ دینے میں بیٹے کے ساتھ اور کوئی شریک نہ ہوگا (کیونکہ آنحضرت کی) ایک حدیث (أنت ومالك لأبيك کہ تو اور تیرا مال دونوں تیرے باپ کی ملک ہیں) کے مطابق وہ بیٹے کے مال میں حق رکھتے ہیں اور اس کے علاوہ کسی کے مال میں حق نہیں رکھتے ۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ بیٹا والدین کے سب سے قریب ہوتا ہے ۔ لہذا مناسب یہی ہے کہ ان کا نفقہ اسی کے ذمے لگایا جائے ۔ استحقاق نفقہ میں بیٹے اور بیٹیاں برابر ہیں یہی مسئلہ ظاہر روایت میں موجود ہے اور یہی صحیح بھی ہے، کیونکہ نفقہ واجب کرنے کا سبب لڑکوں اور لڑکیوں دونوں میں موجود ہے ۔

مسئلہ : ہر ذی رحم محرم کے لیے نفقہ واجب ہوتا ہے جب وہ کمسن محتاج ہو ، یا بالغہ محتاج عورت ہو ، یا بالغ محتاج مرد ہو لنجا ، ہو یا اندھا ہو کیونکہ قرابت قریبہ میں

صلہ رحمی واجب ہوتی ہے۔ اور بعیدہ میں واجب نہیں ہوتی ۔
ذی رحم محرم قریبی رشتہ دار ہوگا ۔ اس کے علاوہ دوسرے دور کے رشتہ دار ہونگے ، اللہ تعالی کا ارشاد ہے : "وعلی الوارث مثل ذلك" یعنی وارث پر اس کے مثل واجب ہے ۔ عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءۃ میں "علی الوارث ذی الرحم المحرم مثل ذلك" آتا ہے ۔ یعنی ہر ذی رحم محرم وارث پر اس کے مثل واجب ہے ۔

نفقے کے واجب ہونے میں احتیاج شرط ہے اور کم سنی ، انوثۃ ، لنجا ہونا یا اندھا ہونا محتاج ہونے کی علامت و دلیل ہے کیونکہ ان کا معذور ہونا ثابت ہے اور جو شخص خود کما سکتا ہو وہ اپنے کسب کی بناء پر محتاج خیال نہیں کیا جاتا ، بخلاف والدین کے ۔ کیونکہ کمانے میں انہیں تکلیفات در پیش ہونگی اس لیے بیٹے کا یہ فرض ہے کہ وہ ان سے تمام تکلیفات کو دور کرے ۔ اگر ماں باپ کمانے کی قدرت بھی رکھتے ہوں تو بھی ان کا نفقہ بیٹے پر واجب ہوگا ۔

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ نفقہ میراث کے اندازے پر ہوگا اور وہ اس نفقے پر مجبور کیا جائے گا کیونکہ نص قرآنی میں وارث کے لفظ سے یہ پتا چلتا ہے کہ نفقہ میراث کے اندازے پر ہو اور آدمی اتنا ہی تاوان برداشت کرتا ہے جتنا حصہ اسے حاصل ہو (یعنی جتنا حصہ اسے میراث سے حاصل ہوگا اتنا ہی مورث کو نفقہ دے گا) اور جبر مستحق کا حق پورا کرنے کے لیے ہے ۔

مسئلہ : شیخ قدوری فرماتے ہیں کہ بالغہ بیٹی اور لنجے بالغ بیٹے کا نفقہ والدین پر اس نسبت سے واجب ہوگا کہ دو حصے باپ ادا کرے اور ایک حصہ والدہ ۔ کیونکہ انہیں میراث بھی اسی نسبت سے ملتی ہے ۔

مصنف فرماتے ہیں کہ قدوری کا یہ مسئلہ امام خصاف اور حسن کی روایت ہے ۔ مگر ظاہر روایت کے مطابق پورا نفقہ باپ پر واجب ہے کیونکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے : "وعلی المولود له رزقهن و کسوتهن" اور اپاہج بیٹا نابالغ بیٹے کی طرح تصور کیا جائے گا ۔

امام خصاف کے قول کی دلیل یہ ہے کہ باپ کے ذمے صغیر بچے کی ولایت اور مشقت دونوں چیزیں ہیں ۔ حتی کہ اسے صغیر کی طرف سے صدقۂ فطر بھی ادا کرنا پڑتا ہے لہذا صغیر کا نفقہ خاص طور پر باپ ہی پر واجب ہوگا ۔ مگر بالغ بیٹے کی یہ حالت نہیں ، کیونکہ اس پر باپ کی ولایت نہیں رہتی ، لہذا نفقے میں ماں بھی شریک ہوگی ۔ باپ کے سوا دوسرے رشتہ داروں پر نفقہ بقدر میراث واجب کیا جائے گا ۔ حتی کہ صغیر کا نفقہ اس کے دادا اور ماں پر علی الترتیب دو تہائی کی نسبت سے واجب ہوگا اور محتاج بھائی کا نفقہ میراث کے لحاظ سے ہر قسم کی خوشحال بہنوں پر پانچ حصوں میں بٹ جائے گا ۔ مثلاً اس کی تین بہنیں خوشحال ہوں ایک حقیقی ، دوسری باپ کی طرف سے اور تیسری ماں کی طرف سے تو میراث کے مطابق نفقہ پانچ حصوں میں بٹ جائے

کا (تین حصے سگی بہن پر واجب ہوں گے اور ایک ایک حصہ دوسری دونوں پر) -

ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ فقط میراث کا استحقاق ہی کافی ہے اور میراث کا حق بالفعل حاصل ہونا ضروری نہیں ، کیونکہ اگر کسی محتاج شخص کا ماموں اور چچا زاد بیٹا خوشحال ہو تو محتاج کا نفقہ ماموں کے ذمے ہوگا حالانکہ میراث چچا زاد بیٹے کو ملے گا (کیونکہ ماموں ذی رحم محرم ہے) -

مسئلہ : اگر ان ذی رحم محرموں کے ساتھ دین میں اختلاف ہو تو نفقہ واجب نہیں ہوگا - کیونکہ اختلاف دین کی وجہ سے اہلیت وراثت بھی باقی نہیں رہتی حالانکہ اس اہلیت وراثت کا اعتبار ضروری ہے -

مسئلہ : محتاج آدمی کے ذمے نفقہ لازم نہیں ہوتا کیونکہ اس کا وجوب بطور عطیہ ہے اور محتاج ہونے کی وجہ سے وہ خود اس کا مستحق ہے (کہ کوئی اس پر احسان کرے) تو اس پر (دوسرے کا نفقہ) کیونکہ واجب ہو سکتا ہے ؟ بخلاف زوجہ اور چھوٹے بچے کے نفقے کے - کیونکہ زوجہ اور بچے کا نفقہ تو شوہر اور باپ پر ہی واجب ہوتا ہے اگرچہ وہ غریب ہوں - کیونکہ جب اس نے نکاح کر لیا تو گویا اپنے نفقے کو بھی لازم کر لیا اس لیے کہ نفقے کے بغیر نکاح کی مصلحتیں مرتب نہیں ہوتیں اور تنگدستی ایسے امور میں حائل نہیں ہو سکتی -

خوشحالی کا اندازہ کیا ہے ؟ امام ابو یوسفؒ کا ارشاد ہے : جو شخص نصاب کا مالک ہو وہ خوشحال ہوگا ۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں : اگر ایک ماہ کے ذاتی اخراجات اور عیال کے نفقے سے کچھ زیادہ اس کے پاس بچ رہے ۔ یا ہر روز کی آمدن سے اسی نسبت سے بچت ہوتی رہے تو وہ خوشحال متصور ہوگا کیونکہ حقوق العباد میں قدرت و استطاعت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے ، نصاب کا چنداں اعتبار نہیں کیونکہ نصاب تو دولتمندی کے لیے ہوتا ہے ۔

فتوی امام ابو یوسفؒ کے قول پر دیا جاتا ہے اور نصاب سے مراد وہ نصاب ہے جس کے ہوتے ہوۓ صدقہ و خیرات لینا حرام ہے ۔

مسئلہ : اگر غائب بیٹے کا مال موجود ہو تو اس سے والدین کے لیے نفقے کا حکم دیا جائے گا ۔ اس کی دلیل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ( کہ والدین کا حق بیٹے کے مال میں ثابت ہے اور قاضی کا حکم ان کی اعانت کے طور پر ہوگا ) ۔

مسئلہ : اگر غائب بیٹے کا باپ اس کے مال کو نفقہ حاصل کرنے کے لیے فروخت کر دے تو جائز ہے ۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ جواز استحسان کے پیش نظر ہے ۔

اگر باپ اس کی زمین یا مکان فروخت کرنا چاہے تو اس کی اسے اجازت نہ ہوگی ۔

صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ منقولہ و غیر منقولہ کسی جائداد کو بھی فروخت کرنا روا نہیں ۔ قیاس کا تقاضا بھی

بھی ہے کیونکہ بیٹے کے بالغ ہونے کی وجہ سے اس پر باپ کا حق ولایت منقطع ہو چکا ہے ۔ اس لیے بیٹے کی موجودگی میں باپ اس کے مال کو فروخت نہیں کر سکتا اور نفقے کے علاوہ کسی دوسرے قرض کے سلسلے میں بھی وہ اس کا مال نہیں بیچ سکتا ۔ اسی طرح اس کی ماں بھی نفقے کے لیے اس کا مال نہیں بیچ سکتی ۔

امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ باپ کو غائب بیٹے کے مال میں محافظت کا حق حاصل ہے ۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ جب وصی کو حق محافظت حاصل ہو سکتا ہے تو باپ کو بدرجۂ اولی حاصل ہوگا کیونکہ باپ میں شفقت کا درجہ بدرجۂ اتم موجود ہوتا ہے ۔

مال منقولہ کی فروخت سلسلۂ محافظت کی ایک کڑی ہے مگر غیر منقولہ مال میں یہ چیز موجود نہیں کیونکہ وہ بذات خود محفوظ ہوتا ہے ۔ باپ کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں کو یہ حق حاصل نہیں کیونکہ انہیں تو اس کے بچپن میں بھی اس کے مال میں تصرف کرنے کا اختیار نہیں تھا اور سن بلوغ کے بعد بھی انہیں ولایت محافظت حاصل نہیں ہوگی ۔

جب والد اس کے مال کی فروخت پر اختیار رکھتا ہے اور اس کی قیمت ایک ایسی جنس ہے جو والد کا حق ہے یعنی نفقہ ، تو وہ خریدار سے قیمت وصول کرنے کا بھی حق دار ہوگا جیسا کہ کمال ولایت کی بناء پر باپ صغیر بیٹے کی جائداد منقولہ و غیر منقولہ فروخت کر سکتا ہے اور

قیمت میں سے اپنا نفقہ وصول کر سکتا ہے کیونکہ دام اسی جنس ہیں جس پر اس کو حق حاصل ہے۔

مسئلہ : اگر غائب بیٹے کا مال والدین کے قبضے میں موجود ہو اور محتاج والدین اس سے اپنا نفقہ حاصل کر لیں۔ تو وہ ضامن نہیں ہوں گے ، کیونکہ انہوں نے اپنا حق وصول کیا ہے۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ قضائے قاضی سے پہلے بھی وہ نفقہ وصول کرنے کے مستحق ہیں اور انہوں نے وہ اپنے حق کی جنس سے لیا ہے۔

مسئلہ : اگر غائب بیٹے کا مال کسی اجنبی کے قبضہ میں ہو اور وہ کو قضاء کے بغیر ہی اس کے والدین پر خرچ کر دے تو اجنبی ضامن ہوگا کیونکہ اس نے دوسرے کے مال میں بغیر کسی ولایت کے تصرف کیا ہے۔ وہ فقط محافظ تھا اس کے علاوہ اسے کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔ ہاں اگر قاضی اسے خرچ کرنے کا حکم دے (تو وہ ضامن نہ ہوگا) کیونکہ قاضی کی ولایت سب پر عام ہے لہذا قاضی کا حکم اس پر لازم ہوگا۔

پہلی صورت میں اگر اجنبی تاوان ادا کر دے تو وہ والدین سے وصول نہیں کرے گا کیونکہ تاوان ادا کرنے سے اجنبی اس مال کا مالک ہوگیا تو معلوم ہوا کہ اس نے اپنا ذاتی مال ان دونوں محتاجوں کو بطور صدقہ دیا ہے۔

مسئلہ : اگر قاضی نے کسی شخص پر اس کے بیٹے ، والدین اور محرم رشتہ داروں کا نفقہ لازم کر دیا ، مگر اس

نے ایک مدت تک نفقہ ادا نہ کیا تو اس مدت کا نفقہ ساقط ہو جائے گا کیونکہ ان لوگوں کا نفقہ ان کی حاجت پوری کرنے کے لیے ہوتا ہے ، حتی کہ وہ لوگ اگر خوشحال ہوں تو واجب نہیں ہوتا اور جو مدت گزر گئی ہے اس کی کفایت بھی ہو گئی ہے ۔

بخلاف بیوی کے نفقے کے اگر قاضی اس کے لیے نفقہ مقرر کر دے تو ساقط نہیں ہوگا ۔ کیونکہ وہ تو بیوی کی دولت مندی کے باوجود بھی واجب ہوتا ہے ، اس لیے گزری ہوئی مدت میں استغناء سے ساقط نہ ہوگا ۔

مسئلہ : امام قدوری فرماتے ہیں کہ جب قاضی اس کی ذمہ داری پر قرض لینے کا فیصلہ کر دے تو گزشتہ مدت کا نفقہ بھی ساقط نہ ہوگا ۔ کیونکہ قاضی کی ولایت ہر ایک پر عام ہوتی ہے ۔ گویا اس کا حکم دینا ایسا ہے جیسا کہ ایک غائب اجازت دے دے کہ میری ذمہ داری پر قرض لے لو لہذا یہ قرض اس کے ذمے ہوگا ۔

## فصل

مسئلہ : مالک پر غلام اور باندی کا نفقہ واجب ہوتا ہے ۔ غلاموں کے بارے میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ غلام تمہارے بھائی ہیں ۔ ان کو اللہ تعالی نے تمہارا زیردست بنایا ہے ۔ اس لیے جو کھانا تم کھاتے ہو ، انہیں وہی کھلاؤ اور جو کپڑا تم پہنتے ہو ، انہیں بھی پہناؤ اور اللہ تعالی کے بندوں کو مشقت میں نہ ڈالو ۔

اگر مولی انہیں نفقہ دینے سے انکار کر دے تو لونڈی یا غلام اگر ہنرمند ہوں تو وہ کمائیں اور کھائیں۔ کیونکہ اس سے دونوں طرفوں کی رعایت ہے کہ غلام بھی زندہ رہ سکے گا اور مولی کی ملک بھی رہے گی لیکن اگر غلام یا لونڈی ہنرمند نہ ہوں اور کما نہ سکتے ہوں، مثلاً غلام لنجا ہو لونڈی ایسی ہو جسے کوئی اجرت پر نہ لے تو مولی کو مجبور کیا جائے گا کہ انہیں بیچ دے کیونکہ یہ دونوں نفقہ کے مستحق ہیں اور فروخت کرنے سے ان کا حق پورا ہو جائے گا اور مولی کو ان کے بدلے قیمت مل جائے گی۔

بخلاف زوجہ کے نفقہ کے کہ وہ شوہر کے ذمے قرض ہو جاتا ہے اس لیے اس میں تأخیر کی جائے گی (ساقط نہ ہوگا) جیسا کہ ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں۔

مگر مملوک کا نفقہ مالک کے ذمے قرض نہیں بنتا۔ اس لیے اس کا ابطال لازم ہے (تأخیر کی صورت ممکن نہیں کہ بعد میں سارا نفقہ ادا کر دے مگر کسی کے حق کو باطل کرنا جائز نہیں ہوتا لہذا مولی کو فروخت کرنے پر مجبور کیا جائے گا) البتہ حیوانات کی صورت میں مالک کو نفقے یا فروخت پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ ہاں حقوق اللہ (اور جانوروں پر شفقت) کے پیش نظر ایسے خرچ کرنے کا حکم دیا جائے گا۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ نے جانوروں کو دکھ اور تکلیف دینے کی ممانعت فرمائی ہے اور جانوروں کو خوراک نہ دینے میں تعذیب موجود ہے۔ نیز آنحضرت ﷺ نے مال کو ضائع کرنے سے روکا

ہے اور اگر وہ جانوروں کو خوراک نہ دے تو وہ بھوک سے ہلاک ہو جائیں گے ۔

امام ابو یوسفؒ (جانوروں کو غلام پر قیاس کرتے ہوئے) فرماتے ہیں کہ جانوروں کی خوراک کے لیے مالک کو مجبور کیا جائے گا ، مگر صحیح قول وہی ہے جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں ۔

واللہ اعلم

---

# فہرست مضامین